ناول

بن تیرے زندگی

نازیہ کنول نازی

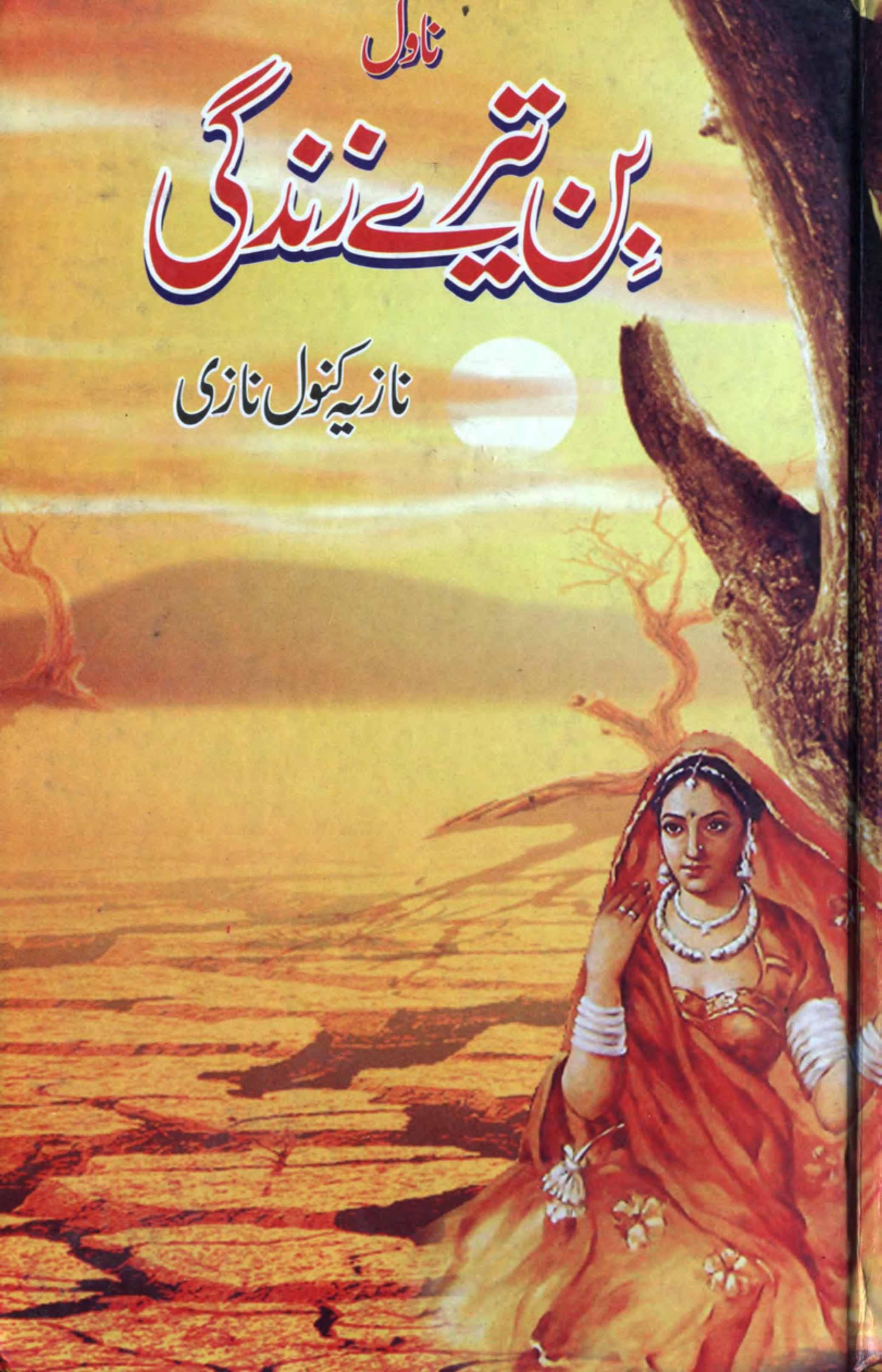

''بن تیرے زندگی''

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔

رُخصت ہوتے موسم سرما کی اُداس شاموں میں، خنکی پھیلاتی ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں اعصاب کو عجیب سا سکون بخش رہی تھیں، اردگرد لہلہلاتا سبزہ، رنگارنگ اور خوشنما پودے پارک کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہے تھے، مگر...... وہ سب سے بے نیاز الگ تھلگ بیٹھی، دُور ایک کونے میں کھیلتے چند معصوم بچوں کو دیکھ رہی تھی جو زندگی کی تمام تر تلخ حقیقتوں سے بے نیاز، اپنے ہی کھیل میں مشغول دیکھائی دے رہے تھے۔

تبھی اچانک کسی کی پکار اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''ایکسکیوزمی...... میں یہاں کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے بچے کو کھیلتا چھوڑ گیا تھا، کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں گیا ہے......؟''

قطعی اجنبی آواز پر اُس نے چونک کر مخاطب کرنے والے پر نگاہ ڈالی تھی، جو بلیک جینز پر لائٹ گرے شرٹ زیب تن کیے بے حد ہینڈسم دیکھائی دے رہا تھا۔

تب ایک لمحے کے لئے اُس کا دِل زور سے دھڑکا تھا، کیونکہ مقابل کی سُرمئی آنکھوں کا رنگ

سلمان یزدانی کی خوبصورت بادامی آنکھوں سے بہت میچ کر رہا تھا۔

مگر......وہ سلمان یزدانی نہیں تھا۔

تبھی ایک گہری سانس خنک فضاء کے سپرد کرتے ہوئے اُس نے سنگی بینچ کی پشت سے ٹیک لگا کر سر آہستہ سے نفی میں ہلا دیا تھا۔

اندر کہیں زندگی جیسے تھکنے لگی تھی۔

''او گاڈ' پتہ نہیں کہاں چلا گیا یہ مانی کا بچہ' میں اسی لئے ساتھ لے کر نہیں آتا اُسے......'' اپنے سلکی بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلتے ہوئے وہ شدید جھنجھلایا تھا' پھر چلتے چلتے ایک دم سے دوبارہ پلٹ کر پوچھنے لگا۔

''اچھا......آپ نے اُسے یہاں پاس میں کہیں کھیلتے ہوئے دیکھا' لائیٹ بلو کلر کے ٹراوزر میں تھا وہ......'' نازیہ محسوس کر سکتی تھی کہ وہ اپنے بچے کیلئے بہت ٹینس ہے' مگر......وہ اُس وقت اُس کی کوئی بھی مدد کرنے سے قاصر تھی' تبھی قدرے توجہ سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے معذرتی لہجے میں بولی۔

''سوری......میں نے کہا ناں......میں نے اِدھر اُدھر دھیان نہیں دیا......''

''او مائی گاڈ' اب کیا کروں میں......؟''

اب کے اُس نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رسید کرتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تھا۔

شام کے دھندلکے کافی تیزی سے گہرے ہو رہے تھے' لہٰذا وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر سست قدم اُٹھاتے ہوئے پارک سے نکل آئی۔ گھر پہنچ کر جونہی اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا' اُس کی چھوٹی بہن صائمہ جو تار پر دُھلے ہوئے کپڑے پھیلا رہی تھی' فوراً لپک کر اُس کی طرف بڑھ آئی۔

''آ گئیں آپا......؟''

''ہاں......امی کی طبیعت کیسی ہے اب......؟''

''اب تو ٹھیک ہے' تھوڑی دیر پہلے ہی دواء لے کر لیٹی ہیں' آپ نے آج پھر گھر واپسی میں اتنی دیر کر دی' خیریت تو تھی ناں......؟''

صائمہ کے سوال پر سر سے چادر اتارتے اُس کے ہاتھ لمحہ بھر کو کپکپائے تھے' مگر اگلے ہی پل وہ خود کو سنبھالتے ہوئے نارمل لہجے میں بولی۔

''آفس میں کام بہت تھا صائمی' مہینے کے آخری دِن ہیں' پرچہ ٹائم پر مارکیٹ میں نہیں آیا تو رحمٰن صاحب بالکل لحاظ نہیں کریں گے۔''

اپنے پارک میں رُکنے والی بات اُس نے یکسر اگنور کر دی تھی۔

''آپا......آج پھر رحمت بواء آپ کیلئے دو ایک رشتے لے کر آئی تھیں۔''

صائمہ کی اِس تازہ اطلاع پر اُس کی پیشانی شکنوں سے پُر ہو گئی تھی۔ بمشکل تمام اُس نے پانی کے چند گھونٹ حلق سے اُتارے تھے۔

''کیوں آئی تھیں وہ؟ اُس روز منع نہیں کیا تھا میں نے' پھر کیوں چین سے نہیں بیٹھتی ہیں وہ......؟''

''امی نے بلوایا تھا اُنہیں۔''

اُس کے چیختے لہجے کے جواب میں صائمہ کا لہجہ قدرے پست تھا۔

جواب میں وہ جیسے تھک کر برآمدے میں رکھی چارپائی پر لیٹ گئی۔

''امی میری زندگی کو اتنی جلدی کیوں ختم کرنا چاہتی ہیں صائمی......؟''

اب کے اُس کے لہجے میں گہری یاسیت تھی۔

تبھی صائمہ نے قدرے دُکھ سے اُس کے گھٹنے تھامتے ہوئے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''آپ سلمان بھائی کو بھول کیوں نہیں جاتیں آپا......؟ زندگی جانے والوں کی یاد کے حوالے کر دیں تو زندہ رہنے کا بھرم رکھنا بڑا دشوار ہو جاتا ہے......''

اپنی دانست میں اُس نے بڑی گہری بات کی تھی۔ مگر نازیہ شیرازی کی آنکھوں میں درد کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔

شفاف چہرے پر بکھرے والے کرب کا عکس بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ جانے کس ضبط کے عالم میں اُس نے کہا تھا۔

''میں اُسے بھولنے میں بااختیار نہیں ہوں صائمی' نہیں بھول سکتی میں اُسے' جس دِن میں اُسے بھولوں گی' اُسی دِن میری سانسوں کا رشتہ میرے بدن سے ٹوٹ جائے گا' یہ دِل دھڑکنا بند ہو جائے گا' میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گی صائمی۔''

''چھ سال بہت ہوتے ہیں آپا' اُنہیں اگر پلٹ کر دوبارہ آپ کی زندگی میں آنا ہوتا تو ان چھ سالوں میں کب کے آ چکے ہوتے' دُنیا کی اِس گہما گہمی میں اُلجھ کر وہ آپ کو بھول چکے ہوں گے' اُنہیں تو شاید یاد بھی نہیں رہا ہو گا کہ کبھی کسی نازیہ نامی لڑکی سے وہ محبت کا کوئی عہد و پیمان بھی باندھ کر آئے ہیں۔''

نازیہ شیرازی کے دُکھی لہجے کے جواب میں اُس نے پھر اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی' جواب میں اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا صائمی' سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے' دریا اُلٹا بہہ سکتے ہیں' ہوائیں خوشبو لٹانا بھول سکتی ہیں' مگر وہ......وہ مجھے فراموش نہیں کر سکتا۔''

جانے کیسا اندھا اعتماد تھا اُسے اپنی بے لوث محبت پر کہ اُس کی آنکھیں جیسے انتظار کرتے تھک ہی نہیں رہی تھیں۔

♦ ♦ ♦

میں بھول جاؤں تمہیں اب یہی مناسب ہے
مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تُم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں
یہاں تو دِل کا یہ عالم ہے کیا کہوں کم بخت
بُھلا سکا نہ وہ اِک سلسلہ جو تھا ہی نہیں
وہ اِک خیال جو آواز تک گیا ہی نہیں
وہ ایک بات جو ہم کہہ نہیں سکتے تم سے
وہ ایک ربط جو ہم میں کبھی رہا ہی نہیں
اگر یہ حال ہے دِل کا تو کوئی بتلائے
میں تم کو بھولنا چاہوں تو کس طرح بھولوں
کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو کوئی خواب نہیں

پچھلے چھ سالوں میں اُس نے اپنی آنکھیں سلمان علوی کے واپس لوٹ آنے کی راہوں میں بچھ رکھی تھیں۔

ابتدائی تین سالوں تک تو اُس نے سلمان علوی سے جدائی کے ایک ایک دِن کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر گن گن کر شمار کیا تھا۔

مگر اِس کے بعد پھر جیسے اُس کی روشن آنکھوں کے چراغ اپنے لَو کھونے لگے تھے' دِل میں اودھم مچاتے احساسات کو جیسے صبر آنا شروع ہو گیا تھا' پچھلے چھ سالوں سے اُس کی کوئی خبر نہ آنے کے باوجود اُس کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور کیوں کر رہی تھی یہ شاید خود وہ بھی نہیں جانتی تھی۔ لاحاصل انتظار کی کڑی اذیت نے اُسے عمرِ عزیز کی ستائیسویں سیڑھی پر دھکیل دیا تھا' اور یہ سیڑھی وہ سیڑھی ہوتی ہے جہاں پہنچنے کے بعد اچھے رشتوں کی اُمید رکھنا بیکار ہوتا ہے۔

تبھی اُس کی والدہ عائشہ بیگم اُس کی مستقل ہٹ دھرمی اور شادی سے انکار پر مغموم و مایوس ہو کر بستر سے جا لگی تھیں' بوڑھے باپ کے کندھے بھی اب جھکنے لگے تھے' مگر...... اُسے کون سمجھاتا؟ گزرے ہوئے شب و روز کی سہانی یادیں' ہر روز تازہ کرتے ہوئے وہ لمحہ بہ لمحہ ادھڑتی تھی۔ مگر دِل بے کل کو قرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ دِل سلمان علوی سے ہٹ کر کسی اور کی رفاقت کو قبول کرنے پر تیار ہی نہیں تھا۔

''تُم کیوں آئے میری زندگی میں سلمان؟ جب...... میں تمہاری منزل ہی نہیں تھی' جب تمہیں میرا ہونا ہی نہیں تھا تو کیوں قدم بڑھائے تُم نے میری جانب؟ کیوں میرے دِل میں سناٹے اتار دیئے تُم نے؟ آخر کیوں؟

کبھی کبھی اعصاب بہت تھک جاتے تو وہ سلمان علوی کی چھوٹی سی تصویر سے ہم کلام ہو کر بلک

اُٹھتی تھی۔

حسیب احمد صاحب اور عائشہ بیگم دونوں ہی اُسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے تھے' صائمہ بھی اب چوبیسویں سال میں لگ گئی تھی۔ حسیب صاحب دونوں کو ایک ساتھ رخصت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ مگر نازیہ شیرازی فی الحال خود کو کسی بھی آزمائش کے لئے تیار نہیں کر پا رہی تھی۔

♦ ♦ ♦

لفظ یادوں کے سبھی ہم بے صدا کر آئے ہیں
سارے منظر آئینوں سے خود مٹا کر آئے ہیں
ایک لمحے میں کئی صدیوں کے رشتے توڑ کر
سوچتے ہیں اپنے ہاتھوں سے یہ کیا کر آئے ہیں

ایک طویل سفر کے بعد گاڑی پُرانی حویلی کے سامنے رُکی' تو وہ آہستہ سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔

سرسبز پودوں اور درختوں کے بیچ گھری' سرخ اینٹوں سے تعمیر کردہ پُرانی حویلی آج بھی اپنے پورے جاہ و جلال اور شان و شوکت کے ساتھ سینہ سپر کئے کھڑی اپنی خوبصورتی کا منہ بولتا ثبوت دکھائی دے رہی تھی۔

اُس کی آنکھیں یک لخت آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''پھوپھو...... یہی وہ حویلی ہے ناں' جہاں میرے پاپا نے جنم لیا تھا۔''

قطعی بے خودی کے عالم میں' حویلی سے نگاہیں ہٹائے بغیر اُس نے اپنے قریب کھڑی حائقہ بیگم کا بازو تھام لیا تھا۔

''ہاں بیٹے...... یہی وہ جگہ ہے جہاں احسان کا جنم ہوا تھا' اندر سے یہ حویلی اور بھی خوبصورت ہے۔''

حائقہ پھوپھو نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اپنا پائیت سے بازو اُس کے گرد حمائل کر دیا تھا۔

سبرینہ چپ چاپ اُن کے ساتھ گیٹ کی جانب بڑھ آئی۔

گیٹ پر چوکیدار موجود نہیں تھا' حائقہ بیگم خود ہی لوہے کے آہنی گیٹ کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھیں۔ تب اُس نے دیکھا تھا۔

گیٹ کے اس پار ڈھیروں خوبصورت پھولوں' سرسبز پودوں اور ہرے بھرے درختوں سے نگاہوں کو خیرہ کرتا لان حویلی کے اندرونی حصے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا' وہیں جھولا بھی لگا تھا اور کئی قسم کے پھلوں کے درخت بھی تھے' لان کے قریب ہی قدرے فاصلے پر گیراج اور انیکسی بھی اُسے دکھائی دے گئی تھی۔

لان سے ملحقہ برآمدے کی سیڑھیوں پر چست کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکی کھڑی' حویلی کے ملازمین سے پکے ہوئے میٹھے امرود اُتروا رہی تھی۔ حائقہ بیگم سبرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے قریب سے گزریں تو اُس نے اُنہیں سلام کیا تھا' جواب میں وہ محض آہستہ سے سر ہلا کر اُس کے سلام کا جواب دیتی آگے بڑھ آئی تھیں' سبرینہ اُن سے اُس لڑکی کے متعلق پوچھنا چاہتی تھی' مگر اُس کی ہمت نہ پڑ سکی۔

حویلی کے وسیع ہال میں' گاؤں کی چند سیدھی سادھی گھریلو خواتین کے درمیان گھری دادی ماں اُسے دُور سے دیکھائی دے گئی تھیں۔ تب اُس کے قدم وہیں دہلیز پر رُک گئے تھے۔

بابا اُسے بتایا کرتے تھے کہ اُن کی ماں کا چہرہ اور سراپہ' اپنے حسن میں کشمیری اور پہاڑی خواتین کے حسن کو بھی مات دے جاتا ہے۔ مگر...... اِس وقت جس عورت کو اُس نے اپنی دادی ماں کے روپ میں دیکھا تھا' اُس کا حسن وقت کے چپ چاپ بیتے ہوئے لمحوں میں کب کا ماند پڑ چکا تھا۔ شفاف جھرنوں سی آنکھیں اپنی جاذبیت ہی کھو چکی تھیں۔

''ارے...... تم رُک کیوں گئیں......؟'' آؤ تمہیں اپنی ماں سے ملواؤں۔''

اُسے دہلیز پر رُکے دیکھ کر حائقہ بیگم نے یوں اُس کی طرف نگاہ کی تھی جیسے کہہ رہی ہوں۔

''ڈرومت' میں تمہارا حقیقی نسب ظاہر کرنے والی نہیں۔''

وہ آگے بڑھی تھی' جھجکتی ہوئی' جب حائقہ بیگم اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اپنی ماں کے مقابل کرتے ہوئے بولیں:

''اماں...... یہ سبرینہ ہے' میری بہت کلوز فرینڈ کی اکلوتی بیٹی' لندن سے آئی ہے' پاکستانی کلچر کی دلدادہ ہے' کچھ ہفتوں تک یہیں رہنا چاہتی ہے' حویلی میں' آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں۔''

''اعتراض کیسا پتر......؟ میں تو خود اِس حویلی کی خاموشی سے ہارنے لگی ہوں' اچھا ہے کوئی میری تنہائی بانٹنے والا بھی آجائے۔''

قطعی اپنائیت سے کہتے ہوئے دادی ماں نے اُس کے بائیں گال پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ بے ساختہ رو پڑی تھی۔

''ارے! یہ رو کیوں رہی ہے؟''

وہ متعجب ہوئی تھیں' جب حائقہ بیگم اُس کی صفائی پیش کرتے ہوئے دُکھ سے بولیں۔

''بچی ہے اماں' شاید اِس بدنصیب کو اپنے بزرگ یاد آگئے ہوں گے۔''

حویلی میں موجود دیہاتی خواتین' سائیڈ پر کھڑی' چپ چاپ اُن کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

وہ اپنی دادی ماں کے سینے میں منہ چھپا کر' برسوں کے رُکے آنسو بہانا چاہتی تھی' مگر دادی ماں نے اُسے اِس کا موقع دیئے بغیر' اگلے کچھ لمحوں میں آرام کی غرض سے اُسے حویلی کی دوسری منزل پر کسی کمرے میں بھجوا دیا تھا' تب بستر پر بیٹھ کر' دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹتے ہوئے اُس نے اپنے پاپا کو یاد کیا تھا۔

گہری سرمئی آنکھوں میں پھر سے ڈھیروں نمکین قطرے جمع ہو گئے تھے۔

دِل کے کسی کونے میں ہلکا سا ڈر چھپا بیٹھا تھا کہ اُسے کسی صورت احسان شاہ کی بیٹی کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا' شاید یہی وجہ تھی کہ وہ حویلی والوں کو فی الحال اپنی شناخت سے بے خبر رکھنا چاہتی تھی۔

لندن میں گزرتے پر دِن کے ساتھ' اُس نے اپنے پاپا سے پاکستان اور پاکستان میں رہنے والوں کا اِتنا ذکر سنا تھا کہ پاکستان اُس کے لئے ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔

لندن کے سحرانگیز حسن کا چارم اُسے پاکستان کے تصوراتی حسن کے سامنے بالکل پھیکا محسوس ہوتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے پاپا نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کرنے کا جرم کیا تھا' نتیجتاً اُن سے بے پناہ محبت کرنے والے والدین نے غصے اور خفگی کے عالم میں اُنہیں ہمیشہ کیلئے ''حویلی'' سے دربدر کر دیا۔

جانے یہ تقدیر تھی کہ والدین کا دِل دُکھانے کی سزا کہ احسان صاحب جو اپنی فارنر بیوی کے ساتھ باہر ہی سیٹل ہو گئے تھے' شادی کے فقط تین سال بعد ہی اپنے محبوب بیگم سے ہمیشہ کیلئے ہاتھ دھو بیٹھے۔

''نور ہاؤس'' کے دروازے تو وہ پہلے ہی خود پر بند کر چکے تھے' لہٰذا اجنبی دیس میں زندگی کا بھرم قائم رکھنے کے لئے اور اپنی ڈیڑھ سالہ معصوم سی بیٹی کی بہتر پرورش کرنے کیلئے اُنہوں نے اپنا آپ داؤ پر لگا دیا۔

دِن رات ذہنی اور جسمانی تھکن نے اُنہیں وقت سے پہلے موت کے قریب کر دیا تھا۔ زندگی کی آخری سانس تک پاکستان کی یاد اُن کے دِل میں بسی رہی تھی۔ نزع کی آخری ہچکی تک اُن کی آنکھوں میں اپنے گھر والوں سے بچھڑنے کا درد بین کر رہا تھا۔ سبرینہ جب بھی تنہائی میں اُن کرب انگیز لمحوں کا تصور کرتی تھی اُس کی آنکھیں جل اُٹھتی تھیں۔

چٹختے اعصاب ایک دم سے بھاری پڑ جاتے تھے۔ پاپا کے الفاظ' اُن کی حسرتیں' اُن کی یاد اُسے اندر سے خالی کرنے لگتی تھی۔

فقط ایک غلط قدم اُٹھانے کی پاداش میں احسان شاہ صاحب نے پھر زندگی کے ہر لمحے کو جبرِ مسلسل کی طرح دِل پر جھیلا تھا' محض ایک جذباتی لمحے کی گرفت میں آکر جو خطاء وہ کر بیٹھے تھے' اُس خطاء نے صرف حویلی کے مکینوں کا مان ہی نہیں توڑا تھا' بلکہ اُن کی زندگیاں بھی ادھیڑ کر رکھ دی تھیں۔ سعید صاحب اور نور بیگم کی آنکھوں میں ہمیشہ کیلئے آنسو بھر دیئے تھے۔

وہ جس طرف بھی نگاہ اُٹھا کر دیکھتی تھی اُسے گھمبیر سناٹوں اور تاریکی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ پُرعظم تھی' بلند حوصلہ تھی' کیونکہ مرتے وقت جو عہد اُس کے پاپا نے اُس سے لیا تھا' وہ ہر صورت اُس عہد کو پورا کرنے کا ارادہ لے کر یہاں آئی تھی۔

''آئی مس یو پاپا......''

کھڑکی کے راستے اندر آتی سرد ہواؤں کو اپنے وجود پر جھیلتے ہوئے اُس کی آنکھیں کب آنسوؤں سے بھر آئی اُسے مطلق خبر نہ ہو سکی۔

رات میں قدرے دیر سے اُس کی آنکھ لگی تھی۔

ازہان قطعی آف موڈ کے ساتھ رات گئے اپنی ذمہ داریوں سے مبرا ہو کر عجلت میں سیڑھیاں کراس کرتا اوپر اپنے کمرے میں آیا تو بستر پر لیٹتے ہی ٹھٹھک گیا۔ نیم تاریکی میں وہ سبرینہ کا وجود اپنے کمرے میں دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ تبھی فوراً کروٹ بدل کر لائیٹ آف کرنے کے بعد اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے جھنجوڑ ڈالا۔ سبرینہ کے ہواس بیدار ہوئے تو وہ ازہان کو اپنے قریب دیکھ کر حیران رہ گئی۔

♦♦♦

رنگا رنگ تقریب میں کئی خوشنما چہروں کے بیچ' نیوی بلو کلر کے خوبصورت لہنگا کُرتی میں ملبوس ہلکے پھلکے میک اپ کے باوجود وہ بے انتہا ہی خوبصورت دیکھائی دے رہی تھی۔

محفل میں موجود شناسا لوگوں کا موضوعِ گفتگو اِس وقت اُس کے چہرے کی پلاسٹک سرجری بنا ہوا تھا' جو وہ حال ہی میں لندن سے کروا کر آئی تھی۔

گو حسین تو وہ پہلے ہی بہت تھی مگر پلاسٹک سرجری کروانے کے بعد تو اُس کا شمار اپسراؤں میں ہونے لگا تھا' جو نظر بھی اُس کے حسین سراپے کی طرف اُٹھتی تھی' پھر اپنے اختیار سے واپس نہیں آتی تھی' یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے پوری کائنات کا حسن سمیٹ کر اُس کی بلوری آنکھوں' گلاب کی پنکھڑیوں سے نازک ہونٹوں اور دِل کو لبھا دینے والی حسین مسکراہٹ میں بھر دیا ہو۔

شہروز علوی آج اپنے بخت پر جس قدر بھی ناز کرتا کم تھا۔

بات بات پر' ہنس کر اپنی اندر کی توڑ پھوڑ کا بھرم رکھتی وہ گویا اُس کا قرار لوٹ رہی تھی۔

گھر کے بزرگ آج احتشام رضا اور مزنی رحیم کی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے ساتھ ہی اُن دونوں کی انگیجمنٹ کا اعلان کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے' تبھی اُس کے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے تھے' مگر ثمرن ازہان کی آنکھوں کی اُداسی اُسے مسلسل ڈسٹرب کر رہی تھی۔

اپنے دوستوں کے ساتھ گھل مل کر اُنہیں کمپنی دینے کے دوران بھی اُس نے اپنی توجہ اُس کے حسین چہرے پر مرکوز رکھی تھی۔

تبھی اپنی جگہ پر بے حد خوش دیکھائی دے رہے تھے۔

تبھی اچانک محفل میں ہلچل کا سماں بپا ہوا تھا۔

وہ مزنی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی' جب اچانک اُس کی نگاہ' ہال میں ابھی ابھی داخل ہونے والے شخص پر پڑی تھی۔

مکمل بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس' گداز لبوں پر دِل کش مسکراہٹ سجائے' بلاشبہ یہ شخص وہی تھا' جس

نے سات سال قبل اُس کی ہنستی مسکراتی زندگی میں طوفان بپا کر دیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین کر' آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر دیئے تھے۔

وہ جیسے ہی محفل میں آیا تھا کئی لوگ لپک کر اُس کی طرف بڑھے تھے۔ احتشام رضا نے آج بطورِ خاص' مہمانِ خصوصی کے طور پر اُسے انوائیٹ کیا تھا' مگر ثمرن ازہان قدرت کے اِس عجیب اتفاق پر شاکڈ رہ گئی تھی۔

اُس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی یوں پاکستان آمد کے فوراً بعد اُس شخص کو اُس کے مقابل لا کھڑا کرے گی کہ جس کے خیال سے بھی وہ شدید کراہیت محسوس کرتی تھی۔

پچھلے ایک ماہ میں یہ دوسرا شدید اعصابی دھچکا تھا اُس کے لئے' جس نے اُس کا دماغ سُن کر کے رکھ دیا تھا۔

اُس کے ہاتھ پاؤں لمحوں میں سرد پڑے تھے۔

مزنی اُس کی پل میں بدلتی کیفیت پر حیران ہو کر اُس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ثمی...... آر یو آل رائیٹ۔"

اُس کے سرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ فوراً اُسے سائیڈ پر لے آئی تھی۔

"نہیں۔" اُس کی آنکھیں فوراً آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

"وھاٹ...... کیا ہوا ہے......؟"

مزنی کی پریشانی بڑھی تھی جب وہ اُس سے لپٹ کر روتے ہوئے بولی۔

"میں نے اُسے پھر دیکھا ہے مزنی' سات سال کے بعد وہ پھر میرے دِل کے زخم ہرے کرنے کیلئے میری آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔"

"کون...... اسفند شیرازی؟"

"ہاں۔"

ثمرن ازہان کی ضبط کی ساری طنابیں جیسے یکلخت ٹوٹ گئی تھیں۔

"کہاں ہے وہ......؟"

مزنی رحیم کی آنکھوں میں تفکر کے ساتھ ساتھ بے قراری بھی بڑھی تھی۔ تبھی ثمرن کی نشاندہی پر اُس نے اسفند شیرازی کو دیکھا تھا۔

اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ' بات بے بات مسکرانے کے باوجود' اُس کی خوبصورت آنکھوں میں چھپی کسک اُس کے اندر کے حال کا پتہ دے رہی تھی۔

"اوگاڈ...... یہ تو احتشام کا بہت کلوز فرینڈ ہے' اکثر یہاں آتا جاتا رہتا ہے' یہ شخص صیاد نہیں ہو سکتا۔" بہت دھیمے لہجے میں اُس نے کہا تھا' جب وہ گھٹے گھٹے سے انداز میں چلا اُٹھی۔

"یہی صیاد ہے مزنی' میری آنکھیں دھوکہ نہیں کھا سکتیں' اس شخص کو پہچاننے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔"

پتھروں سا حوصلہ رکھنے والی ثمران ازہان اُس لمحے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی مانند بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ تبھی وہ اُسے خود میں سمو کر دلاسہ دیتے ہوئے بولی تھی۔

"اِٹس او کے' بولو کیا کرنا ہے اُس شخص کے ساتھ' تم کہو تو میں ابھی بڑے ماموں سے بات کر کے اِسے اریسٹ کروادیتی ہوں۔"

"نہیں...... مجھے اپنے گھر والوں کی رسوائی منظور نہیں ہے' ایسا ہی کرنا ہوتا تو سات سال قبل یہاں سے چھپ کر فرار نہیں ہوتی میں' یہ شخص میرا مجرم ہے مزنی' اِسے سزا بھی میں ہی دُوں گی' اور ایسی سزا دُوں گی کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی ہمیشہ یاد رکھیں گی۔"

اُس کے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے مگر لہجہ کمزور نہیں تھا۔

مزنی رحیم پھر اُس کے لئے پریشان ہوئی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو ثمی' تم بھلا اس شخص کا کیا بگاڑ سکتی ہو' تمہیں پتہ ہے یہ کتنا بااثر ہے؟ میری بانو تو شہروز بھیا کو سب کچھ سچ سچ بتادو' وہ خود ہی نپٹ لیں گے اِس سے۔"

"نہیں...... اُس شخص کا میرے کسی مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"کیوں تعلق نہیں...... وہ تم سے محبت کرتے ہیں' بہت جلد تُم دونوں کی شادی بھی ہو جائے گی' پھر تعلق کیوں نہیں۔"

کتنا تکلیف دِہ سوال پوچھ بیٹھی تھی وہ۔ ثمران ازہان کے اندر جیسے پھر سے' بہت کچھ ٹوٹ کر بکھرا تھا۔

"میں شہروز سے شادی نہیں کر رہی مزنی' بتا دینا سب کو۔"

اپنی بات کہنے کے بعد وہ وہاں ٹھہری نہیں تھی' جبکہ مزنی رحیم ساکت کھڑی اُس کے الفاظ میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

آج سے پچیس تیس سال قبل "شاہ ولاج" کی رونقیں دیکھنے والی ہوتی تھیں۔

شاہ میر صاحب چونکہ سیاست سے منسلک تھے' پھر ان کی شخصیت بھی خاصی بارعب تھی لہٰذا علاقے کے لوگ نہ صرف ان کا احترام کرتے تھے بلکہ ان سے خاصا دبتے بھی تھے۔

شاہ میر صاحب کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔

سب سے بڑے بیٹے کا نام ان کی بیگم حاجرہ نے اپنی پسند پر شاہ نواز رکھا تھا۔ احتشام' فائزہ اور واصف انہی کے بچے تھے۔ شاہ نواز صاحب چونکہ پہلوٹھی کی اولاد تھے لہٰذا ماں باپ کے ساتھ ساتھ

پورے خاندان والوں کی محبت بھی انہیں حاصل تھی۔ کچھ وہ فطرتاً کم گو اور فرمانبردار تھے' لہٰذا سب ہی ان کی اچھی عادتوں کو پسند کرتے ہوئے انہیں محبوب رکھتے تھے۔

شاہ نواز صاحب کے پورے تین سال بعد "شانزل نواز" کا جنم ہوا تھا۔ جو واجبی سی شکل و صورت کے مالک تھے۔ شہروز' ذروین اور ثمر تین بچے تھے ان کے' شاہ نواز صاحب کی مانند وہ بھی خاصے سنجیدہ اور ماں باپ کا کہا ماننے والے تھے۔ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف' کچھ بھی کرنا' انہیں گوارہ نہیں تھا۔ دو بیٹوں کی نعمت کے بعد اللہ تعالیٰ نے شاہ میر اور ان کی بیگم حاجرہ کو بیٹی جیسی رحمت سے نوازا تھا۔

سلمیٰ بیگم بھی اپنی اچھی عادات اور بے پناہ خوبصورتی کے باعث' ماں باپ کے ساتھ ساتھ تمام خاندان والوں کی آنکھوں کا تارہ بن بیٹھی تھیں۔ اللہ نے انہیں دو ہی بچوں سے نوازا تھا۔ بیٹی مزنی' اور بیٹا نوید جو پڑھائی کے سلسلے میں ملک سے باہر تھا۔

ان کے شوہر رحیم صاحب چونکہ خاندان ہی سے تعلق رکھتے تھے اور اسی شہر میں مقیم تھے' لہٰذا سلمیٰ بیگم شادی کے بعد بھی والدین کے قریب ہی رہتی تھیں۔ ان کے دونوں بچوں کا زیادہ وقت بھی حویلی میں ہی گزرتا تھا۔ لہٰذا سبھی بچوں کے مابین' غضب کی انڈرسٹینڈنگ تھی۔

سلمیٰ بیگم کی پیدائش کے پورے چار سال بعد' شاہ ولا میں شیر دل نواز پیدا ہوا تھا۔ سب سے چھوٹا سب سے زیادہ خوبصورت و ذہین ہونے کے باعث اسے خصوصی لاڈ پیار اور اہمیت ملی تھی' جس کے باعث وہ وقت کے ساتھ ساتھ قدرے بگڑتا چلا گیا تھا۔

بات بات پر ضد کر کے اپنی ہر جائز و ناجائز بات منوانا' گویا اس کی عادت بن گئی تھی۔ شاہ میر صاحب اور حاجرہ بیگم کی تو جیسے اس میں جان تھی' لہٰذا وہ اس کی ہر جائز و ناجائز بات پر بڑے آرام سے سر جھکا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان میں اپنا ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد جب اس نے مزید تعلیم کے لئے باہر جانے کی رٹ لگائی تو وہ دونوں چاہتے ہوئے بھی اسے اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ پائے تھے۔

عرصہ دو سال کے بعد جب ان کی واپسی کی امید پیدا ہوئی تو حاجرہ بیگم (جو اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو اپنی پسند کی لڑکیوں کے ساتھ بیاہ کر از حد سرخرو تھیں) نے اس کے لئے بھی خاندان میں ہی ایک لڑکی کو ان کے لئے پسند کر لیا۔

مگر اپنی اہمیت اور ضد پر مغرور' شیر دل نواز' اس سے قبل ہی اچانک بناء اطلاع کے اپنی ایک یونیورسٹی فیلو' سیال آفندی کے سحر انگیز حسن میں مدہوش ہو کر اسے اپنا بنانے کے بعد اپنے ساتھ ہی پاکستان لے آئے۔

حاجرہ بیگم اور شاہ میر صاحب کے لئے اپنے چہیتے بیٹے کا یہ اقدام شدید تکلیف دہ اور غیر متوقع تھا' لہٰذا انہوں نے شدید جلال میں آتے ہوئے شیر دل نواز صاحب کو یہ حکم دے دیا۔ کہ وہ فوراً اسے بیشتر

سیال بیگم کو فارغ کر کے انہیں واپس لندن بھجوادیں' مگر شیر دل صاحب جو سیال بیگم کے عشق میں غرقار گزرتے ہر دن اور ہر لمحے کے بعد دونوں کے مابین فاصلے بڑھتے چلے گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ

تھے' وہ ان کے اس حکم پر سر نہ جھکا سکے۔ ن کے بعد' پھر ان کے ہاں اور کوئی بھی بچہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔

اس کے دو وجوہات تھیں۔ شیر دل صاحب کے سنگدلانہ رویے اور تضحیک آمیز سلوک نے اندر ہی اندر سیال بیگم کو تھکانا شروع

اوّل تو سیال بیگم کو چھوڑنا ان کے لئے ممکن نہ تھا' کیونکہ وہ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے' پھر|دیا تھا۔ وہ جن کی قسمت میں پہلے ہی زندگی نے خوشیوں کا کوئی پھول نہیں کھلایا تھا اب پھر سے لمحہ بہ لمحہ

ان کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھیں۔ دنیا میں ایک بوڑھی ماں کے علاوہ ان کا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ بوڑھے کے بعد جیسے اندر سے ختم ہونے لگی تھیں۔

ماں بھی دو ہفتے قبل۔ انہیں شیر دل صاحب کے محفوظ ہاتھوں میں سونپ کر ہمیشہ کے لئے پلکیں موندگ مگر شیر دل صاحب کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔

تھیں۔ ''شاہ ولا'' میں جن دنوں حاجرہ بیگم کی رحلت ہوئی ان دنوں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اٹلی گئے

اس کے علاوہ انہیں اپنے ماں باپ کی محبت پر بڑا زعم تھا۔ بچپن سے لے کر جوانی تک جیسے وہ ان کے تھے۔ سیال بیگم اور اپنی سات سال کی ننھی سی بچی' ثمرن کا بھی انہیں کوئی خیال نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی

ہر خواہش پوری کرتے آئے تھے۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے انہیں پورا یقین تھا کہ ان کے والدین ان کہ وہ حاجرہ بیگم کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

پسند کو قبول کر لیں گے' مگر...... یہاں آکر حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ ثمرن نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' اپنی ماں کو آنسو بہاتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ

انا کی ایسی فصیل کھڑی ہوئی کہ پھر مفاہمت کے تمام دروازے ہی جیسے بند ہوتے چلے گئے۔ شاہ کی مما' اس کے پاپا سے بے انتہاء پیار کرتی ہیں' مگر اس بے انتہاء پیار کے جواب میں اس کے پاپا اس

میر صاحب اور حاجرہ بیگم' بیٹے کی نافرمانی پر دکھ سے نڈھال تھے۔ انہیں یہ قلق تھا کہ جس بیٹے کو وہ اپنی مما کو آنسو کیوں دیتے ہیں۔ اور یہ وہ کبھی نہیں سمجھ پائی تھی۔

جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے' اسی بیٹے نے ان کی برسوں کی محبت پر ایک معمولی سی لڑکی کی محبت کو اہمیت شیر دل صاحب کا رویہ ان کے ساتھ بھی کچھ خاص حوصلہ افزاء نہیں تھا۔ اکثر معمولی معمولی سی باتوں

دے دی تھی۔ وہ اسے بھی بری طرح سے لتاڑ کر رکھ دیا کرتے ہیں' تاہم اس کے باوجود وہ اپنے ماں باپ دونوں سے

شدید دکھ' اور جذباتیت کے عالم میں' آخری حد پھلانگتے ہوئے انہوں نے شیر دل از ہان کو اپنی برابر کا پیار کرتی تھی۔

وسیع جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دی تھی' مگر...... جوانی اور ضد کے نشے میں مدہوش' شیر دل از ہان اپنی شیر دل صاحب جب بھی فارغ ہوتے تھے اسے پاکستان کی روداد سنانے بیٹھ جاتے تھے۔

ہٹ دھرمی اور غصہ دکھاتے ہوئے' سیال بیگم کا ہاتھ پکڑ کر شاہ ولا سے ہمیشہ کے لئے باہر نکل آئے۔ لستان میں ''شاہ ولاج'' کا تذکرہ کرتے ہوئے جو چمک ان کی آنکھوں میں ابھرتی تھی۔ وہ چمک ثمرن

شاہ میر صاحب ان کے اس اقدام پر شدید ہرٹ ہوتے ہوئے بستر سے جا لگے تھے۔ ہان سے کبھی پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی۔ ان کے لہجے کا اشتیاق ہی پاکستان والوں سے اس کی دلچسپی کا باعث

پھر ابھی شیر دل صاحب اچھی طرح سے دیارِ غیر میں سیٹ بھی نہ ہو سکے تھے کہ شاہ میر صاحب کی تھا۔

رحلت کی خبر انہیں مل گئی' یوں وہ جو پہلے ہی اندر سے شکستہ پا تھے' اس عظیم نقصان پر دکھ سے نڈھال ہوتے ان دنوں وہ اپنا کام مکمل کر رہی تھی' جب انہیں پاکستان سے اس کے تایا شاہ نزل نواز کی اچانک

ہوئے' کرچی کرچی احساسات کے ساتھ پاکستان چلے آئے' مگر یہاں کسی نے ابھی ان سے سیدھے منہ ملت کی خبر ملی تھی۔

بات تک کرنا گوارہ نہیں کی۔ فون ریسیو کرنے والی وہ خود ہی تھی۔ شیر دل صاحب کو انفارم بھی اسی نے کیا تھا۔

سب ہی انہیں شاہ میر صاحب کی موت کا موجب گردان رہے تھے۔ سیال بیگم کی طبیعت بھی ان دنوں بہت خراب تھی۔ ڈاکٹرز نے دلی سکون اور خوشی کو ان کے لئے

اپنوں کی یہ بیگانگی اور حوصلہ شکن رویہ وہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور شاہ میر صاحب کے قل زم قرار دے دیا تھا' مگر...... زندگی کی آخری سانس تک وہ ان دو چیزوں کے لئے ترستی رہیں تھی۔

کرواتے ہی' لٹے پٹے اعصاب کے ساتھ لندن واپس چلے آئے۔ بقول شاعر

سیال بیگم سے ان کی محبت کا جوش ایک دم سے مدہم پڑ گیا تھا۔ بات بات پر وہ انہیں سخت ذلیل

کر کے رکھ دیا کرتے تھے۔ سیال بیگم جتنا ان کا دکھ بٹانے کی کوششیں کرتیں' وہ اتنا ہی انہیں گھائل کر دیتے

ایک ذرا سا جرم محبت کرنے کا
اور پھر ساری عمر سزائیں ہوتی ہیں

تھے۔ اپنی تمام تر سیاہ بختی کا الزام انہوں نے بڑے آرام سے سیال بیگم کے سر تھوپ دیا تھا۔ تاعمر وہ دل لگانے کی سزا جھیلتی رہی تھیں اور پھر اس روز جب صبح سے ہی ان کی طبیعت بے حد

خراب تھی، سانس بھی بار بار اکھڑ رہا تھا اور وہ مسلسل روتے ہوئے شیر دل صاحب سے اپنے پاس ہی پڑی
ریکویسٹ کر رہی تھیں۔ اس روز وہ ان کے آنسوؤں کا مان رکھے بغیر ان کے ہاتھ جھٹک کر
پاکستان چلے آئے تھے۔

ثمرن نے اس روز پہلی بار انہیں بلک بلک کر بچوں کی طرح روتے ہوئے دیکھا تھا، خود وہ
کے ساتھ رو رہی تھی۔

بھرے گھر میں قطعی بے آسرا وہ پاگلوں کی طرح اپنی ماں کو لے کر مختلف ڈاکٹرز کے پرسنل
ٹرائی کر رہی تھی۔ مگر...... اس کے آنسو اس کی دعائیں اور تمام تر کوششیں بھی سیال بیگم کی زندگی نہیں
تھیں۔

اس روز سیال بیگم کی ہمیشہ کے لئے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ ہی ثمرن ازہان نے اپنی
اور اپنا دل ہمیشہ کے لئے بند ہوتا محسوس کیا تھا۔

مہینوں وہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر سیال بیگم کے لئے روتی رہی تھی۔ زندگی میں پھر جانے وہ کبھی
سیکھتی کہ نہیں کہ اچانک اس کے دل نے اپنے تایازاد کزن شہروز احمر کی آنکھوں میں دھڑکنا شروع کر
پاکستان آ کر جو محبتیں اسے ملی تھیں وہ فراموش کئے جانے کے قابل نہیں تھیں، سو وہ بھی بہل گئی تھی۔
آنکھوں میں ٹھہرے آنسو پونچھ کر اس نے بھی ہنسنا مسکرانا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں اس کا دل
انوکھی ہی تال پر تھرکنے لگا تھا۔

موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں رنگین خوابوں کے اترنے کا حسین سلسلہ شروع ہو گیا
مگر...... وہ نہیں جانتی تھی کہ بیٹی۔ اکثر ماں کا نصیب لکھوا کر لاتی ہے۔

ابھی محبت کی پری نے ٹھیک سے اس کی روح پر اپنے پر پھیلائے بھی نہیں تھے کہ اس کی
تقدیر نے اسے مٹی کے کھلونے کی مانند توڑ کر پاش پاش کر ڈالا۔

ایک غلط فہمی میں ہی وہ کسی کے بھیانک انتقام کی بھینٹ چڑھ کر اپنی تمام تر خوشیاں اپنی مسکرا
اور سکون سب کچھ گنوا بیٹھی تھی۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے اس حادثے کے متعلق وجب کبھی سوچتی
اس کے زخم پھر سے تازہ ہو جاتے تھے۔

گھائل روح پر لگے زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں اسے کسی لمحے بھی قرار لینے نہیں دے رہی تھیں

♦ ♦ ♦

وہ بھی اِس شہر سے رُخصت ہوا خوابوں کی طرح
ہم بھی پھر رات کی تنہائی میں اکثر جاگے

اُس روز پھر آفس میں بہت کام تھا۔ لہٰذا وہ خاصی تھک گئی تھی۔ تبھی آفس سے گھر جانے کی بجائے اس
سیدھی پارک میں چلی آئی، جہاں اُس کی اور سلمان یزدانی کی خاموش محبت کی ہزاروں سنہری داستا

پاس ہی پڑی تھیں۔

وہ جب بھی بہت زیادہ مغموم یا پریشان ہوتی تھی تو اِسی پارک میں آ کر اپنے نڈھال اعصاب کو
پہنچانے کے اسباب مہیا کرتی تھی۔ اُس وقت بھی وہ خاصے منہمک انداز میں سنگی بینچ پر بیٹھی اپنے
ہی کھیلتے ہوئے بچوں کو دِل چسپی سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک جھولا جھولتے ہوئے ایک چھوٹا سا بچہ
وازن کھو کر زمین پر آ گرا، جس کی وجہ سے اُس کی پیشانی اور ہونٹ بُری طرح سے زخمی ہو گئے تھے۔
نجانے کس احساس کے تحت وہ فوراً لپک کر اُس چھوٹے سے بچے کی طرف بڑھی تھی جواب بے یارو
زمین پر پڑا بلک بلک کر رو رہا تھا۔

نازیہ کو اُس کی پیشانی اور ہونٹ سے بہتا خون پریشان کر گیا تھا، تبھی وہ بچے کا سر زمین سے اُٹھا کر
گود میں رکھتے ہوئے اُس پر جھک گئی تھی۔

"چپ ہو جاؤ بیٹے، اچھے بچے اتنی معمولی چوٹوں پر ایسے نہیں روتے۔"

اردگرد خاصے بچے جمع ہو گئے تھے۔ دو چار مرد اور خواتین بھی پاس آ گئی تھیں، کوئی بھاگ کر پانی
لے آیا تھا تو کوئی بچے کو ہوسپٹل لے جانے کا مشورہ دے رہا تھا، جب اُس نے اپنے آنچل کا کونا ٹھنڈے
میں بگھو کر باری باری بچے کی پیشانی اور ہونٹ کے زخم صاف کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں ننھا سا بچہ اپنی تکلیف اور رونا دھونا بھول کر ٹکر ٹکر اُس طرف حیرانگی سے دیکھتے ہوئے
معصومیت سے بولا۔

"آپ...... میری مما ہیں ناں......؟"

"وھاٹ......؟"

نازیہ شیرازی کو اُس کے الفاظ سے گویا ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ تاہم اِس سے پہلے کہ وہ بچے کو کوئی
جواب دیتی، کوئی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔

"سلمان...... میرے چاند...... آپ ٹھیک تو ہو ناں؟"

آنے والا اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ مگر نازیہ شیرازی اُسے فوراً پہچان گئی تھی۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا
جو کچھ روز قبل اُسی پارک میں اس سے خاصی پریشانی کے ساتھ کسی چھوٹے بچے کے بارے میں دریافت
کر رہا تھا اور وہ بچہ یقیناً یہی تھا جو اس وقت اُس کی گود میں لیٹا یک ٹک اُس کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔

"پاپا...... یہ میری مما ہیں ناں......؟ پلیز بتایئے ناں، یہی میری مما ہیں ناں؟"

اب کے جھٹکا کھانے کی باری نو وارد کی تھی۔ چنانچہ اُس نے خاصے شاکڈ انداز میں اپنے مقابل
بیٹھی اُداس سی نازیہ شیرازی پر نگاہ ڈالی تھی جو اُس کے بچے کے لئے پریشان ہو رہی تھی، تاہم اگلے ہی پل
اس نے سر جھٹک کر اُس کی گود سے اپنے بچے کو مضبوط بازوؤں میں اُٹھا لیا تھا۔

نازیہ شیرازی اُداس نگاہوں سے بچے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی جو اپنے باپ کی شاندار گاڑی میں

بیٹھنے کے باوجود مما مما چلا رہا تھا۔ تھکی تھکی سی نگاہ واپس آئی تو وہاں قریب ہی گھاس پر اُس شخص کا والہ تھا‘ جس کی گاڑی چند لمحوں میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

♦ ♦ ♦

کشادہ کمرے میں گھمبیر خاموشی کے ساتھ ساتھ ازہان کے جارحانہ انداز نے اُسے سہما دیا تھ تبھی وہ کچھ بھی بولے بغیر یک ٹک اُس کی طرف دیکھتی رہی تو وہ چڑ گیا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو میری طرف؟ یہ میرا کمرہ ہے اور میں اپنے کمرے میں کسی بھی اجنبی شخ کی موجودگی قطعی برداشت نہیں کرسکتا۔“

”تو میں کیا کروں؟ میں خود تو یہاں نہیں آئی۔“

”خود آئی نہیں‘ خود جا تو سکتی ہو......؟“

وہ پھر غرایا تھا‘ مگر سبرینہ اپنا حوصلہ بحال کرچکی تھی تبھی اعتماد سے بولی۔

”اِس وقت کہاں جاؤں‘ میں تو یہاں کسی کو جانتی ہی نہیں‘ آج ہی تو حویلی آئی ہوں‘ آپ خو آج رات کہیں اور انتظام کرلیں۔“

”کیوں کرلوں‘ یہ میرا کمرہ ہے اور میں اپنے بستر کے علاوہ اور کہیں نہیں سوتا‘ چلو اُٹھو یہاں سے

”نہیں اُٹھتی‘ کرلیں جو کرنا ہے۔“

جانے کیوں اُسے اپنے اِس کزن کو تنگ کرکے مزہ آرہا تھا۔ فقط چند ہی دِنوں میں وہ دِل کے قدر قریب محسوس ہونے لگا تھا۔

پھر اِس سے پہلے کہ ازہان اُس سے کچھ کہتا‘ دروازے پر ہونے والی دستک نے اُن دونوں کو چونک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

”سٹوپڈ گرل۔“

دانت پیس کر غصیلی نگاہ اُس پر ڈالنے کے بعد ازہان نے واپس پلٹ کر دروازہ کھولا تو دہلیز پر حا بیگم کو کھڑے پایا۔

”کیا بات ہے زین؟ بچی پر چلا کیوں رہے ہو تُم......؟“

”مجھے کوئی شوق نہیں کسی پر چلانے کا‘ اپنی بچی سے کہیے فوراً میرا کمرہ خالی کردے۔“

اُس کا انداز ہمیشہ کی طرح گستاخانہ تھا۔ حائقہ بیگم سبرینہ کے سامنے اُس کی اِس درجہ بدتمیزی پر بھڑک اُٹھی تھیں۔

”اپنی حد میں رہو زین‘ مت بھولو کہ اِس وقت تُم اپنی ماں سے مخاطب ہو۔“

”نہیں بھولتا‘ آپ سے مخاطب ہوتے وقت میں کبھی بھی اپنے مقام اور حیثیت کو نہیں بھولتا‘ مگ آپ مجھ سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ بھول جاتی ہیں کہ میں بھی آپ کا بیٹا ہوں‘ بالکل سگا بیٹا۔“

سلگتے انداز میں کہتا وہ پھر ایک لمحے کیلئے بھی وہاں ٹھہرا نہیں تھا۔ جبکہ سبرینہ‘ حائقہ بیگم کے ساتھ اُس کے بی ہیویر پر بہت دیر تک شاکڈ رہی تھی۔

♦ ♦ ♦

اِک چاند تنہا کھڑا رہا
میرے آسماں سے ذرا پرے
میرے ساتھ ساتھ سفر میں تھا
میری منزلوں سے ذرا پرے
تیری جستجو کے حصار سے
تیرے خواب‘ تیرے خیال سے
میں وہ شخص تھا جو کھڑا رہا
تیری چاہتوں سے ذرا پرے
کبھی دِل کی بات کہی نہ تھی
جو کہی تو وہ بھی دبی دبی
میرے لفظ پورے تو تھے مگر
تھے سماعتوں سے ذرا پرے

اپنے کمرے میں بند ہونے کے بعد وہ تکیے کو بانہوں میں لے کر‘ ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

زندگی ایک دم سے کتنی دشوار ہوکر رہ گئی تھی اُس کیلئے۔

ابھی تو دِل پر شہروز علوی کا سگا زخم رِس رہا تھا کہ یہ اسفند آفندی بھی چلا آیا تھا اُس کے ضبط کا امتحان لینے۔

اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ شہروز علوی سے ہمیشہ کیلئے بچھڑنے پر آنسو بہائے یا اسفند شیرازی کے پھر سے مل جانے پر۔

سات سال قبل زندگی کتنی سہل تھی۔

اُس وقت گو وہ مما کی رحلت پر دُکھ سے نڈھال تھی‘ مگر پھر بھی یہاں ”شاہ ولا“ کے مکینوں کے درمیان آکر وہ بہل گئی تھی۔ ”شاہ ولا“ کے بڑے بیٹے شاہ نواز چوہان اور اُن کے بچوں احتشام‘ فائزہ اور واصف کے ساتھ ساتھ‘ چھوٹے تایا شانزل نواز کے بیٹے شہروز‘ زروین اور ثمر کی محبتوں نے اُسے زندگی سے قریب تر کردیا تھا۔

یہیں آکر بڑی پھوپھو کی اکلوتی بیٹی مزنی رحیم نے اُس کی دوستی ہوئی تھی اور وہ فقط چند ہی ماہ میں

اُس کی گہری راز دار دوست بن کر رہ گئی تھی۔

پاکستان اور پاکستان میں رہنے والوں کی محبت نے اُسے دیارِ غیر بھلا دیا تھا۔

بڑی ماں، چھوٹی ماں، پھوپھو سب اُس کے ناز اُٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ شاہ ولاج کی ایک ینگ جنریشن میں شہروز نے سب سے زیادہ اُس سے دِلی وابستگی کا حق ادا کرتے ہوئے اُس کے دِل میں گھر کیا تھا۔

اپنی شوخ حرکتوں، اچھی عادتوں اور دِلی خلوص کے باعث بہت جلد وہ اُس کے دِل میں بلند مقام حاصل کر گیا تھا۔

کتنی ڈھیر ساری یادیں جڑی تھیں اُس کے تصور سے۔

سات سال قبل شاہ ولاج میں قیام کے دوران زندگی اُسے اپنی مٹھی میں رقص کرتی محسوس ہوتی تھی۔

اپنی مرضی سے اٹھنا، مرضی سے ناشتہ کرنا اور پھر گھر کے سرسبز وسیع وعریض لان میں ینگ پارٹی کے ساتھ مل کر کرکٹ، سکواش، چھپن چھپائی اور دیگر کھیل کھیلنا۔ کتنا اچھا لگتا تھا ان دنوں؟ زندگی کے ان گزرتے حسین لمحات میں اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ کب شہروز علوی نے اس کا دل چرا لیا۔ خوبصورت ستارہ سی روشن غلافی آنکھوں، کھڑی ناک، کشادہ پیشانی اور مضبوط جسم کا مالک، خوبرو، شہروز علوی کب اس کی آنکھوں کے راستے دل میں آبسا، اسے پتہ نہیں چل سکا، دن بھر بے قراری کے عالم میں شہروز کے یونیورسٹی سے لوٹنے کا انتظار کرنا، بات بات میں اس کی قربت کے بہانے تلاشنا اور اس کی غیر معمولی توجہ پر بے انتہا خوش ہو جانا، ان دنوں اس کے روزمرہ کی روٹین کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔

وہ دن کہ جب شہروز نے پہلی بار اس کے ساتھ کرکٹ کھیلی، پہلی بار جس دن ان کے درمیان شکوائش کا مقابلہ ہوا، زندگی کے ان گنے چنے حسین ترین دنوں کو شکاگو واپس جا کر اس نے کوئی پچاس کروڑ مرتبہ یاد کیا تھا۔ برستی بارش میں بھیگتے وہ دن کہ جب وہ سبھی کزنز اکٹھے ہو کر ٹیرس پر چلے آتے، پھر مزنی وہ اور ثمر گرما گرم پکوڑے اور چائے بنا کر لاتیں اور میل کزنز ان پر ٹوٹ پڑتے، تب ہنسی مذاق میں زندگی کے ایک ایک لمحے کو انجوائے کرنا اُسے ہمیشہ یاد رہا تھا۔

اور اس روز کہ جب وہ لان میں بیٹھی کوئی دلچسپ ناول پڑھ رہی تھی۔ تب شہروز نے ایک دم سے پیچھے آ کر اس کا وہ ناول جھپٹ لیا، پھر اس کے بعد شہروز آگے آگے تھا اور وہ ہلکان ہوتے اس کے پیچھے پیچھے کیونکہ ناول کے جس موڑ سے وہ گزر رہی تھی۔ وہ موڑ اس کی زندگی کے ان لمحوں کی مانند انتہائی دلچسپ تھا۔ اس روز شہروز کے پیچھے اندھا دھند بھاگنے کے نتیجے میں وہ اپنی ٹانگ پر چوٹ کھا بیٹھی تھی اور اس معمولی سی چوٹ پر جہاں اس کے دیگر کزنز پریشان ہوئے تھے وہیں اس کا محبوب شہروز علوی گویا تڑپ کر رہ گیا تھا۔ ثمرن کے پاؤں کو اپنی گود میں رکھ کر خود اس کی بینڈیج کرتے ہوئے وہ شدید پشیمانی کا شکار تھا،

مگر اس لمحے کوئی ثمرن ازہان سے پوچھتا کہ اسے اپنی یہ چوٹ کس قدر خوشی فراہم کر گئی تھی۔

یادوں کی قید میں ایک اور دن بھی تو تھا۔ جسے وہ کبھی نہیں بھلا پائی تھی۔ ہمیشہ یاد کر کے روتی رہی تھی۔ وہ دن کہ جب گھر میں کوئی نہیں تھا ماسوائے مزنی اور اس کے۔ مزنی کچن میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی اور وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی کسی کتاب کا مطالعے میں مشغول تھی۔ جب اچانک بے وقت شہروز کی گاڑی کا ہارن بجا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا لاؤنج میں اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

''ثمی یہ چاچو نے تمہارے لئے ایک خوبصورت رنگ بھیجی ہے۔ پہن کر دیکھو کیسی ہے؟'' اپنی مضبوط بند مٹھی اس کے سامنے کرتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولا تو مزنی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر چونکتے ہوئے اس کی سمت نگاہ کی۔

''لے لو بھئی...... میں جھوٹ تو نہیں بول رہا۔''

اسے خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ زور دیتے ہوئے بولا تھا۔ پھر ثمرن کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنی مٹھی کھول کر رخ پھیر گیا۔ ثمرن جو حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ پر رینگتے کاکروچ کی حرکت محسوس کر کے فوراً چیختے ہوئے ہاتھ جھٹک گئی تھی۔ تب وہ کھلکھلا اٹھا تھا۔ مزنی رحیم ثمرن کی چیخیں سن کر فوراً کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ شہروز کو منع بھی کیا تھا اس نے، مگر وہ اپنی انجوائے منٹ میں باز نہیں آیا تھا۔

''او مائی گاڈ کتنی ڈرپوک ہو تم؟ بھلا یہ ننھا سا کاکروچ تم جیسی اونچی لمبی دوشیزہ کو کیسے کھا سکتا ہے؟'' اسے چیختے دیکھ کر وہ قدرے محظوظ ہوتے ہوئے بولا تھا۔ جب کہ ثمرن تا حال صوفے پر چڑھی، پتے کی مانند کانپ رہی تھی۔ تب مزنی رحیم نے آگے بڑھ کر شہروز سے کاکروچ چھینتے ہوئے دور پھینک دیا۔

''کم آن ثمرن، شہروز بھیا تو یونہی ستا رہے ہیں تمہیں۔ اس میں رونے والی کونسی بات ہے۔'' شہروز سے کاکروچ چھین کر دور پھینکنے کے بعد وہ ثمرن سے مخاطب ہوئی تھی اور تب وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلاتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

یادوں کی پٹاری میں ایسی کتنی ہی دلفریب یادیں تھیں جو شہروز علوی کے تصور کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔

• • •

''شہروز، میں تم سے پیار کرتی ہوں، یہی سننا چاہتے ہو ناں تم؟ تو سنو، ثمرن ازہان کو تم سے محبت ہے، بہت زیادہ محبت۔''

گلوگیر لہجے میں بچوں کی مانند بلک بلک کر روتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی، مگر وہاں اس وقت اس کے بکھرتے آنسو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

شفاف کانچ سی آنکھوں سے ٹپکتے گرم آنسو کے ساتھ ایک اور یاد دل سے رہا ہو کر آنسوؤں کی

صورت باہر نکلی تھی۔ اس روز لان میں قدرے دھوپ بکھری تھی' تبھی وہ ٹراوزر پہنے' بڑی ماں سے اجازت لے کر لان میں گلاب کا پودا لگا رہی تھی۔ شہروز کو اس کے پاپا نے آفس کے کسی کام سے دو روز قبل شہر سے باہر بھیج دیا تھا۔ لہٰذا وہ بوریت سے بچنے کے لئے اکیلی ہی زمین کھود کر پودا لگا رہی تھی۔ جب اچانک کہیں سے شہد کی مکھیوں کا ایک جھنڈ آ کر اس کے سر پر منڈلانے لگا۔ ثمرن کے دونوں ہاتھ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ تبھی وہ اس اچانک افتاد پر جو گھبرا کر بھاگی تو سامنے آتی شہروز علوی کی گاڑی کو بھی نظر انداز کر گئی۔ وہ تو خدا کا کرم ہو گیا کہ شہروز نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیئے تھے۔ وگرنہ اس روز ثمرن از جان' کچلے جانا لازمی تھا۔

شہروز گاڑی سے باہر نکلا تو اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ مزید نروس ہو کر رہ گئی تھی۔

''یہ کیا تماشہ تھا ثمی؟ ابھی اگر تم کچلی جاتی تو۔''

اپنا سخت ہاتھ اس کے نازک سے بازو میں گاڑے شہروز نے پوچھا تو ثمرن نے نگاہ اٹھا کر اس کی سمت دیکھنا دشوار ہو گیا۔ پھر اسی پل شیطان مکھیاں بھنبھناتی ہوئی۔ وہاں بھی پہنچ گئیں۔ تو بے خیازہ وہ چیختے ہوئے شہروز سے لپٹ گئی تھی۔ ڈرپوک تو وہ سدا کی تھی' مگر اس وقت اس کا حال دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کسی سہمی ہوئی ہرنی کی مانند خوف سے لرزتی' وہ شہروز کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اس کے گداز لبوں پر ایک دھیمی سی مسکان بکھیر گئی تھی۔

مکھیوں کا جھنڈ ان کے سر سے ٹلا تو شہروز اس کے کان میں مدھم سی سرگوشی کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

''واہ بھئی ان مکھیوں نے تو کمال کر دیا کہاں تو محترمہ ہاتھ تک تھامنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں اور کہاں اب خود ہی مچل کر میری بانہوں میں آ گئیں۔ ہاؤ ونڈرفل آج تو بتاشے بانٹنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

وہ گھمبیر لہجہ وہ اس کے مدھر لفظوں کی بازگشت وہ اس کی قربت کی مانوس خوشبو پچھلے سات دنوں تک اس کا گھیراؤ کئے رہی تھی۔ پاکستان سے جاتے جاتے شہروز کے ایک ایک خط ایک ایک پیغام کو اس نے متاع کل کی مانند سنبھال کر رکھا تھا۔ مگر کتنی بدنصیب تھی وہ کہ اسے پا نہیں سکی تھی۔ دھیرے دھیرے رات کے بے کل لمحے اسے سلگا رہے تھے اور وہ پیش آنے والے متوقع وقت کو سوچ سوچ کر درد سے نڈھال ہوئی جا رہی تھی۔

♦♦♦

اسے کہیں نہ کہیں تو بچھڑ ہی جانا تھا
یہ حادثہ بھی میری زندگی میں آنا تھا

وہ ایک شخص مجھے ساری عمر ترسے گا
نصیب اس کے کہ اس نے مجھے گنوانا تھا

اگلی صبح بے حد حسین تھی۔ رات بھر بارش میں نہاتے سرسبز درخت اب صبح کی روشنی میں بہت دل کش دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے وسیع لان میں سلیقے سے لگے رنگ برنگے پھولوں والے خوبصورت پودے نگاہوں کو عجیب سی تراوٹ عطا کر رہے تھے۔

گو پاکستان کے موسم ویسے ہی سہانے تھے۔ وہی بہاریں' وہی خزائیں' فضاؤں پر قابض تھیں۔ جو سات سال قبل اس نے یہاں دیکھی تھیں۔ ''شاہ ولا'' کے سبھی مکین تھی ویسے ہی پرخلوص تھے۔ جیسے کہ سات سال قبل اس نے پائے تھے۔ احتشام' مزنی' ثمر' واصف' فائزہ کسی کے مزاج یا عادات میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب اسے ویسا ہی پروٹوکول دے رہے تھے' جیسا کہ سات سال قبل پہلی بار پاکستان آمد پر دیا تھا۔

وہی بزرگوں کا پیار' وہی مزنی کی بے لوث دوستی' وہی فائزہ' ثمر اور واصف کی بے تکلفی' وہی احتشام بھیا کی پرخلوص اپنائیت اور سب سے بڑھ کر وہی شہروز علوی کی دیوانہ وار محبت۔ کہیں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ مگر پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ دل تھا کہ پچھلے ایک ہفتے سے ہمہ وقت ایک عجیب سے الاؤ میں دہکتا رہا تھا۔

راتوں کی پرسکون نیندیں' حرام ہو کر رہ گئی تھیں اس کے لئے حالانکہ سات سال قبل' جب اسفند شیرازی نے اس کی روح کو چھیلا تھا' تو اس نے اپنے اوپر ٹوٹنے والی اس قیامت کا احوال کسی کو نہیں بتایا تھا۔ وہ جس طرح سے اچانک اپنے پاپا کے ساتھ پاکستان آئی تھی۔ ویسے ہی رات کی تاریکی میں انہی کے ہمراہ کسی کو مطلع کئے بغیر اچانک واپس لوٹ گئی تھی۔

اس کے اس اقدام پر ''شاہ ولا'' کے مکین کس قدر پریشان ہوئے تھے۔ خود شہروز اور مزنی نے پورے ایک ماہ تک اس سے کوئی رابطہ نہ رکھ کر اپنی بے حد ناراضگی کا اظہار کیا تھا اس سے مگر وہ اس کے باوجود بھی اپنے درد سے کسی کو باخبر نہ کر سکی۔

اس کے پاپا شیر دل نواز نے وقت رخصت اپنا ضروری سامان سیٹ کرائیرپورٹ آتے وقت سب سے یہی کہا تھا کہ ثمرن کی کسی دوست کی شکاگو میں اچانک ڈیتھ ہو گئی ہے۔ سو مجبوراً ان لوگوں کو واپس اپنے ملک جانا پڑ رہا ہے اور ان لمحوں میں شیر دل صاحب کے لاکھ انکار کے باوجود ان کے ہمراہ آئے' شہروز علوی اور احتشام بھیا سے اس نے کیسے بمشکل اپنا آپ چھپایا تھا۔ یہ محض وہ جانتی تھی' یا اس کا خدا گزرے ہوئے پچھلے سات سالوں میں اس کے چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت میں بھی بہت سی تبدیلیاں در آئی تھیں۔ چہرے کی تبدیلی کا تو اس نے سب سے کہہ دیا تھا کہ شکاگو میں اس کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے چہرہ خراب ہونے پر اس نے پلاسٹک سرجری کروائی' مگر عادات میں

تبدیلیوں پر وہ کوئی وضاحت پیش نہ کر سکی تھی۔

گزرے سات سالوں میں شاہ والا کے مکین بارہا اسے پاکستان نہیں آنے پر مجبور کرتے رہے تھے' مزنی کی محبت بھری دھمکیوں اور شہروز کے تڑپتے مچلتے عشقیہ پیغامات نے پہروں رلایا تھا۔ اسے' مگر اس کے باوجود بھی وہ پورے سات سال تک دوبارہ پاکستان آنے کی جسارت نہیں کر پائی تھی۔

تاہم مزنی اور احتشام بھیا کی شادی اٹینڈ کرنے کے لئے مجبوراً سہی' مگر اسے پاکستان آمد کے لئے خود کو تیار کرنا پڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان میں سب اسے ایک بدلی ہوئی شکل کے ساتھ مختلف رُوپ میں دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ لاکھوں سوال ہونگے اُس کے چہرے کی تبدیلی پر' مگر اِس کے باوجود وہ پاکستان چلی آئی تھی۔

دِل کے کسی گوشے میں یہی خواہش شدت سے پنپ رہی تھی کہ وہ جلد از جلد پاکستان جا کر شہروز علوی کے مضبوط کندھے سے سر ٹکائے اور اپنے اندر جمع تمام غبار کو آنسوؤں کی صورت باہر نکال پھینکے۔ اپنے ہر ہر زخم کو اُس کے سامنے کھول کر رکھ دے' بھول جائے کہ وہ کبھی شب کی تاریکی میں تنہا بلک بلک کر روئی ہے۔

وہ سارے دُکھ' وہ تمام تکلیفیں جو اُن دِنوں میں تنہاء' اسفند شیرازی کی وجہ سے اُسے سہنا پڑی تھیں سب بھلا دے۔ ماضی کو دفن کر دے' مگر...... یہی تو نہیں ہو سکا تھا۔ گو اب بھی ''شاہ ولا'' میں اُس کا وہی مقام' وہی اہمیت تھی' اپنی بدلی ہوئی صورت کے متعلق جو کہانی اُس نے ''شاہ ولا'' کے مکینوں کو سنائی تھی وہ اس پر دِل سے یقین کرتے ہوئے اُسے نئے روپ کے ساتھ بھی سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے' مگر...... وہ اچانک ٹوٹ گئی تھی۔ جتنا اپنے غم کو بھلانے کیلئے وہ شہروز کے قریب ہوئی تھی' اُتنا ہی تقدیر نے اُس کے منہ پر درد کا تماچہ سگا دیا تھا۔

اِتنی بے دردی کے ساتھ اوندھے منہ گرایا تھا کہ وہ اپنی تکلیف پر بلبلا بھی نہ سکی تھی۔ وہ تمام دُکھ جو وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بھلا دینا چاہتی تھی' اُس ظالم کے بے درد الفاظ اور خود غرض سوچ نے اُسے پھر سے درد کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ اُسی دلدل میں کہ جس سے نکلنے کیلئے وہ شکاگو سے پاکستان شہروز علوی کا ہاتھ تھامنے کے لئے آئی تھی۔

● ● ●

کچھ بھی تو نہیں ویسا
جیسا تجھے سوچا تھا' جتنا تجھے چاہا تھا
سوچا تھا تیرے لب پر' کچھ حرف دُعاؤں کے
مہکیں گے میری خاطر

کچھ بھی تو نہیں ویسا' جیسا تجھے سوچا تھا
محسوس یہ ہوتا ہے' دُکھ جھیلے تھے جواب تک
بے نام مسافت میں' لکھنے کی محبت میں
پڑھنے کی ضرورت میں
بے سود ریاضت تھی' بے فیض عبادت تھی
جو خواب بھی دیکھے تھے اِن جاگتی آنکھوں نے
سب خام خیالی تھی
پھر بھی تجھے پانے کی' خواہش تو بچالی تھی
لیکن تجھے پا کر بھی' اور خود کو گنوا کر بھی
اِس حبس کے موسم میں کھڑکی سے ہوا آئی
اب نیند ہے آنکھوں میں
نہ دِل میں وہ پہلے سی تازہ سخن آرائی
نادیدہ رفاقت میں جتنی بھی ازیت تھی سب میرے ہی نام آئی۔

کہیں کوئی غرض' کوئی مطلب اُس نے شہروز علوی کی محبت سے وابستہ نہیں رکھا تھا' مگر پھر بھی اُسے اوندھے منہ گرنا پڑا تھا۔

پاکستان واپسی کے بعد وہ شہروز علوی جو اُس کی سانسیں گنتا نہیں تھکتا تھا' قدرے لاپرواہ ہو کر رہ گیا تھا۔ پہلے کی طرح اُس کے آگے پیچھے پھیرنا بھلا چکا تھا وہ' اور اِسی چیز نے ثمرن کو ہرٹ کیا تھا۔

صرف شہروز علوی کی بیگانگی نے' باقی سب کی بے لوث محبتوں کی خوشبو کو ماند کر دیا تھا' یہی وجہ تھی کہ وہ چاہ کر بھی اپنی خود ساختہ اُداسی کے خول سے باہر نہیں نکل سکی تھی' اُن دِنوں اُسے یہی لگتا تھا کہ شہروز علوی کی محبت گزرے سات سالوں میں مرگئی ہے' مگر اُس روز جب اُس نے اچانک چھپ کر قطعی اتفاقی طور پر احتشام رضا اور اُس کی گفتگو اپنے متعلق سنی تو اُس کے سارے مفروضے منہ لپیٹ کر سو گئے۔

کتنی مسرور تھی وہ اُس روز' کیونکہ مزنی کی معرفت اُسے یہ خبر ملی تھی کہ شاہ ولا کے بزرگ جلد ہی شہروز کے ساتھ اُس کی نسبت طے کر رہے ہیں' اور وہ یہی خوشی احتشام بھیا کے ساتھ شیئر کرنا چاہتی تھی' تبھی تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اُن کے کمرے کی طرف آئی' تو اندر سے آتی اُن کی بلند آواز نے بے ساختہ دہلیز پر اُس کے قدم روک لئے۔

وہ شاید نہیں یقیناً شہروز سے ہی کہہ رہے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا شہری' جب واقعی وہ تمہاری محبت ہے تو تُم اُس سے اپنے پیار کا اظہار کر کیوں نہیں دیتے' اب تو گھر والے بھی تُم دونوں کو ایک کر دینے کا فیصلہ کئے بیٹھے ہیں۔''

"سو وہاٹ یار! اُس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فرق پڑتا ہے' وہ لڑکی جو سمندر پار سے یہاں ہمارے بیچ بسنے آئی ہے اُس کی خوشیوں کے لئے تمہاری محبت کا اظہار بہت ضروری ہے۔"

کتنے اچھے تھے احتشام بھیا' اُس لمحے اُسے اُن پر بے حد پیار آیا تھا۔ تبھی اُس نے شہروز کو کہتے سنا۔

"فار گاڈ سیک یار! ہر وقت اُس کے وکیل نہ بنے رہا کرو' میں مانتا ہوں وہ اچھی لڑکی ہے' اور میں اُس سے محبت بھی کرتا ہوں' شاید اُس کے بغیر اکیلا جی بھی نہ سکوں' مگر...... میرا دِل اُس کی طرف سے صاف نہیں ہے' سات سال پہلے اُس کی لائف میں ضرور کچھ ایسا ہوا تھا جسے وہ سب سے چھپائے پھر رہی ہے' تُم مانو نہ مانو شامی' مگر اُس کی لائف میں کچھ غلط ضرور ہے' کچھ تو ایسا ہے جس نے اُسے سرتا پیر بدل کر رکھ دیا ہے' آئی ایم سوری شامی' مگر تم خود بھی ایک مرد ہو اور اِسی حوالے سے مرد کی فطرت کو بخوبی سمجھ سکتے ہو' مجھے شکوک وشبہات کے لبادے میں لپٹی محبوبہ نہیں چاہئے' اگر واقعی اُس کی زندگی میں میرے سوا کوئی نہیں تو اُسے خود آ کر مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرنا ہوگا بصورتِ دیگر وہ میری چاہت کی انتہاہ کو کبھی نہیں پا سکتی۔"

کمرے کی خاموشی کو چیرتی اُس کی تیز آواز نے دہلیز کے اُس پار کھڑی ثمرن ازہان کو پل میں عرش سے فرش پر لا پٹخا تھا۔

وہ اُس کے بارے میں اِتنا بدگمان ہوگا' اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

دِل میں یکدم درد کی تیز لہر اُٹھی تھی اور اُس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

"تُم پاگل ہو گئے ہو شہری' مت بھولو کہ تمہارا یہ فضول شک صرف اُس کے لئے ہی نہیں' بلکہ خود تمہارے لئے بھی نقصان کا باعث بن سکتا ہے' ثمرن جیسی معصوم لڑکی پر شک کرنا' گناہ کے مترادف سمجھتا ہوں میں۔"

احتشام رضا کو یقیناً اُس کے الفاظ پر غصہ آیا تھا' مگر وہ مطمئن تھا۔

"سوری میرے یار! میں خود اُسے غلط نہیں سمجھنا چاہتا' میرا دِل اُس کے لئے میلا نہیں ہے' بس میں اُسے اپنی محبت کا مان نہیں دے سکتا' اُس وقت تک جب تک وہ خود نہ جھک جائے۔"

"او کے...... اور اگر ایسا نہ ہوا تو......؟"

"تو کیا' وہ پچھتائے گی' ساری عمر اکیلے پن کا دُکھ اُٹھائے گی۔"

"اور تُم...... کیا تُم اُسے کھو کر خوش رہو گے۔"

"نہیں...... میری زندگی اور خوشیوں کیلئے اُس کی محبت لازم ہے' تم دیکھنا شامی بہت جلد وہ جھک جائے گی۔ خود اپنے منہ سے میری محبت کا اقرار کرے گی' کیونکہ میں نے اُس کی آنکھوں میں بارہا اپنی محبت کے چراغ جلتے دیکھے ہیں' آج کل کی لڑکیاں بہت ایڈوانس ہیں' زیادہ دیر تک کسی بھی احساس کو دِل

میں چھپا کر نہیں رکھ سکتیں' اور ثمرن تو ویسے بھی آزاد ماحول میں پرورش پانے والی ماڈرن لڑکی ہے۔ سو تُم دیکھ لینا' جیسا میں چاہتا ہوں ویسا ہی ہوگا' محبت' محبت ڈاٹ کام کے اِس کھیل میں جیت شہروز علوی کی ہی ہو گی۔"

کتنا غرور تھا اُسے خود پر۔

ثمرن کی نگاہوں سے اُسے گر کر زمین بوس ہونے میں فقط چند لمحے لگے تھے۔

"تم بہت غلط کر رہے ہو شہری' ایک نہایت فضول ضد وسوچ پر محبت جیسے مقدس جذبے کو سُولی چڑھا دینا کہاں کی دانش مندی ہے' اور پھر محبت میں اظہار کی پہل مرد کی طرف سے ہی اچھی لگتی ہے' ثمرن لاکھ بولڈ سہی' مگر میں جانتا ہوں وہ تُم سے محبت کے اظہار میں پہل کبھی نہیں کرے گی' یہ عورت کی نفسیات بہت عجیب وغریب ہے' تم کبھی نہیں سمجھ سکو گے' خدا کا واسطہ ہے یار' فضول ضد پر دِل کو قربان مت کرو' ورنہ خوشیوں کیلئے ترس جاؤ گے۔"

"نہیں ترستا یار' کچھ نہیں ہوتا' تم شرط لگا لو' میں اُس کے ہونٹوں سے اپنی محبت کا اقرار کروا کر رہوں گا' اگر ایسا نہ کر سکا تو اُسے بھی کبھی پتہ نہیں چلنے دُوں گا کہ میں اُسے کتنی محبت کرتا ہوں؟ خواہ ساری زندگی گزر جائے۔ اب میں اِس ضد کو چھوڑنے والا نہیں۔"

"ٹھیک ہے' تُو اپنی فضول ضد کو لے کر بیٹھے رہنا اور وہ کسی اور کی ڈولی میں بیٹھ کر چلی جائے گی۔"

اِس بار احتشام رضا کے سلگتے انداز پر شہروز نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"ایسے کیسے چلی جائے گی' مجھے یقین ہے وہ میرے سوا اور کسی کی نہیں ہوسکتی' اور تُم دیکھنا شامی ایسا ہی ہوگا' وہ خود اپنے منہ سے کہے گی کہ اُسے صرف مجھ سے شادی کرنی ہے اور کسی سے نہیں' پھر زندگی کا لطف آئے گا' تُم دیکھنا میں اُسے اِتنا پیار دُوں گا کہ وہ خود اپنے آپ کو بھول جائے گی۔"

"لعنت ہے ایسے پیار پر' جو خودداری کا خون بہا کر نصیب ہو' میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ثمرن جیسی ہیرا صفت لڑکی کے لئے تمہاری سوچ اِتنی گھٹیا بھی ہوسکتی ہے۔

یاد رکھو شہروز علوی' عورت خواہ کسی بھی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہو' اُس کے وقار کو داؤ پر کبھی مت لگاؤ' کیونکہ اچھی لڑکیاں خواہ دِل میں کسی کے لئے کیسے ہی گہرے جذبات کیوں نہ رکھتی ہوں' وہ اپنی نسوانیت کا وقار ڈوبنے نہیں دیتیں۔ شاید تم نہیں جانتے' عورت خواہ کتنی ہی بولڈ کیوں نہ ہو' محبت کے معاملے میں ہمیشہ مرد کی طرف سے پہل کی منتظر رہتی ہے۔ خود سے کبھی آگے نہیں بڑھتی' خواہ اس کشمکش میں اس کی پوری زندگی ہی کیوں نہ بیت جائے اور پھر محبت تو بڑا بے لوث سا جذبہ ہے یار' اس میں ایسی فضول سی ضدیں قطعی کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ وقت تمہارے ہاتھوں سے گیلی ریت کی مانند پھسل کر تمہیں زندگی کے ساحل پر تنہا کر دے تم اسے اپنا لو یار' ورنہ کہیں اسی وقت کے لئے تمہیں ساری زندگی پچھتانا ہی نہ پڑے۔"

"اوکم آن یار تمہیں اس کے لئے اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ویسے بھی جب تک وہ سے اپنے پیار کا اظہار نہیں کرے گی۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کروں گا' خیر چھوڑو اس فضول بحث کو الحال تو چلو مجھے مارکیٹ سے کچھ ضروری کتابیں خریدنی ہیں واپس آ کر اس مسئلے پر ڈسکس کریں گے۔"

لاپرواہی سے کہتا وہ احتشام کا ہاتھ تھام کر کمرے سے باہر نکلا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ گھ ہوئے اردگرد سے بے نیاز لمبے لمبے ڈگ بھرتا وسیع لاؤنج سے باہر نکل گیا' جب کہ ثمرن ازہان درواز کے ایک طرف ساکت کھڑی یوں اسے دیکھتی رہ گئی۔ جیسے قافلہ گزرنے کے بعد پیچھے دکھانے والا م فقط اڑتی ہوئی دھول ہی دیکھتا رہ جائے اس وقت اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی۔ یہ وہ اپنا وجود گھسیٹ اپنے کمرے تک ہی چلی آتی' تبھی گم حواس کے ساتھ شکستہ انداز میں وہیں بیٹھتی گئی۔

"جب تک وہ خود مجھ سے اپنے پیار کا اظہار نہیں کرے گی' میں آگے نہیں بڑھوں گا۔" بار بار فقرہ ذہن میں گونج رہا تھا اور وہ جیسے چکراتے سر کے ساتھ زمین میں دھنستی جا رہی تھی۔

"تو تمہارے نزدیک' میری پاکیزہ محبت کی قدر صرف اتنی ہی ہے شہروز علوی' تت...... تم چاہتے میں خود کو گرا کر تمہیں چاہے جانے کا مان سونپ دوں۔ اتنا حقیر سمجھتے ہو میرے جذبوں کو کہ میں خود تم اپنی محبت کی بھیک مانگتی پھروں' محبت کبھی بھیک میں بھی ملتی ہے بھلا؟ نہیں شہروز علوی' محبت کبھی بھیک م نہیں ملا کرتی' کتنا غلط سمجھتے ہو تم مجھے۔ میں تو اپنا زخم زخم وجود لئے تمہاری بانہوں میں سمٹنے آئی تھی تمہار کندھے سے سر ٹکا کے سارے آنسو بہانے آئی تھی میں اور تم نے تم نے مجھے منہ کے بل گرا ڈالا' پل م خاک کر ڈالا میری پاکیزہ محبت کو' مٹی میں ملا دیا میری شخصیت کا غرور۔"

آنسو نکل کر اس کے گالوں پر پھسل آئے تھے۔ مگر وہ اسی طرح بے حس وحرکت خاموش بیٹھی ر تھی۔

"تو تم چاہتے ہو کہ میں تم سے محبت کے اظہار میں پہل کروں تاکہ بعد میں تم میری اسی ایک خ کے لئے زندگی بھر مجھے شرمندہ کر سکو۔ تم چاہتے ہو میں اپنی زبان سے کہوں کہ ہاں شہروز علوی میری بائیس سالہ زندگی میں تم واحد شخص ہو جسے میں نے چاہا ہے دل کی گہرائیوں سے جسے اپنا مان کر ہر پل سوچا جس کے سینے پر سر رکھ کر میں نے اپنے سارے آنسو بہانے کی خواہش کی ہے۔ جس کا ساتھ پا کر میں ا ساری تھکن سارے دکھ درد بھلا دینا چاہتی ہوں۔ یہی چاہتے ہو ناں تم؟ تو سنو...... سنو شہروز علوی کہ میں سے پیار کرتی ہوں' بے حد بے تحاشا خود اپنے آپ سے بڑھ کر' بہت پیار کرتی ہوں میں تم سے مم...... میں یہ سب اب تم سے کبھی نہیں کہوں گی۔ تم اگر یہ چاہتے ہو کہ میں تم سے تمہاری محبت کی بھیک مانگ تمہارے آگے اپنا دامن پھیلاؤں اپنی خودداری اور نسوانیت کا خون کر دوں تو یہ محبت کی توہین ہوگی شہر علوی' میرے پرخلوص جذبوں کی توہین ہوگی اور...... اور ثمرن ازہان کو محبت کی توہین گوارہ نہیں' کبھی نہیں۔"

کتنے جگر کے ساتھ سسکتے ہوئے وہ بڑبڑاتی تھی' پھر یکلخت ہی اُٹھ کر تیزی سے بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور الماری میں رکھے شہروز کے گفٹ خوبصورت کارڈ خطوط سب نکال کر پھاڑ ڈالے۔

"تم نے مجھے بے موت مار ڈالا ہے شہروز' مگر کاش کہ تم اس کا احساس کر پاتے' کاش کہ تم میری آنکھوں سے چھلکتے محبت کے رنگوں کو ہی کافی سمجھ لیتے' سنو شہروز علوی میرے اندر مسمار ہوتی میری بے لوث محبت کی عمارت کا شور سنو' دیکھو میری آنکھوں میں سرد پڑتے جذبوں کو نہیں چاہئے مجھے تمہاری کھوکھلی محبت کا احسان چاہئے تمہارا سہارا کچھ نہیں چاہئے مجھے تم سے' سمجھ لو کہ آج کے بعد وہ ثمرن مر گئی ہے جو تم سے پیار کیا کرتی تھی' سمجھ لو کہ میں نے کبھی تمہیں چاہا ہی نہیں تھا۔ تم تا عمر انتظار ہی کرتے رہ جاؤ گے شہروز علوی' مگر یہ یورپی ماحول میں پروان چڑھنے والی لڑکی یہ زندہ لاش اب تم سے کبھی نہیں کہے گی کہ اس نے تم سے پیار کیا ہے۔"

دروازہ بند کر کے شہروز کی ایک ایک نشانی کو آگ کے سپرد کرنے کے بعد وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی وہاں اس کے سامنے اس وقت آگ میں شہروز علوی کی محبت نہیں بلکہ خود اس کا اپنا دل جل رہا تھا۔ خود اپنی شکستہ محبت کی لاش پر بیٹھی وہ بین کر رہی تھی' جب اچانک مزنی رحیم ہلکے سے دروازے پر ناک دے کر' کمرے کے اندر چلی آئی' مگر اندر جو حال اس نے ثمرن ازہان کا دیکھا تھا' اس پر وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"شٹ...... ثمرن...... آر یو آل رائیٹ جان؟"

بجلی کی طرح لپک کر شاکڈ حواس کے ساتھ وہ اس کے قریب پہنچی تھی' جب ثمرن ازہان اس سے لپٹ کر اور بھی بری طرح بلک اٹھی۔

"پلیز ثمرن بتاؤ تو سہی کہ آخر کیا ہوا ہے؟"

اسے خود سے لپٹائے کتنی ہی دیر تک روتے رہنے دینے کے بعد مزنی رحیم نے الجھ کر پوچھا' تو وہ اپنے حواس میں واپس لوٹ آئی۔ چونک کر مزنی کا منہ دیکھتے ہوئے اس نے اپنے آنسو رگڑ ڈالے' دل کا حال اس وقت بہت برا تھا' جو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ بتا نہیں سکتی تھی۔ مگر جو کچھ اس وقت اس نے مزنی رحیم کو بتایا وہ شاید وہ کبھی بتانا نہیں چاہتی تھی' مگر پھر بھی اپنے آنسوؤں کی وضاحت تو اسے کرنا ہی تھی۔ سامنے ہی راکھ ہوئے جذبوں کی نیلامی پر کوئی کہانی تو اسے سنانا ہی تھی' سو اس نے ان کمزور لمحوں میں اسفند شیرازی کا راز اس پر کھول دیا اسفند شیرازی نے اسے کیوں اغواء کیا۔ کیسے اس کے چہرے پر تیزاب پھینکا' سات سال قبل وہ اچانک شکاگو کیوں واپس چلی گئی' سب کچھ بتا دیا اسے جس سے مزنی رحیم کی ہمدردی اور محبت مزید بڑھ گئی تھی اس کے لئے۔

• • •

یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
جدھر جدھر اٹھے نظر' کچھ کمی سی لگتی ہے
بجھی بجھی ہے کہکشاں' دھواں دھواں لگے جہاں
ہوائیں بھی اگر چھوئیں' جلائیں ہم کو خوشبوئیں
چراغ کی یہ روشنی بھی' سانولی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
لہولہو ہے آرزو غبار سے چہار سو
کبھی تھیں' کبھی گماں' قدم کہیں نظر کہیں
جو ہوش میں بھی ہم رہیں' تو بے خودی سی لگتی ہے
یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے

تبھی اسی روز اس نے ہمیشہ کے لئے چپ چاپ' شہروز علوی کی محبت کو اپنے کمرے کی چار دیواری میں دفن کر دیا تھا' سمجھا دیا تھا خود کو کہ شہروز علوی کی رفاقت اس جیسی خوددار لڑکی کا نصیب نہیں ہے' مگر اس

باوجود وہ اگلے دو دن شدید بخار میں مبتلا رہی تھی۔ جس کے باعث مزنی اور احتشام کی منگنی کی تقریب التوا کا شکار ہوگئی تھی۔

نازک تو وہ پہلے ہی بہت تھی اس پر دو روز کے شدید بخار نے اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ تیسرے روز میں واپس آئی تو پہلی نظر ہی شہروز علوی کے متفکر چہرے پر پڑی تھی۔ اسی کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بے حال بیٹھا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے ثمرن؟'' اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ سرعت سے اس کی طرف لپکا تھا وہ بمشکل اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے بظاہر مسکرا کر بولی۔

''مجھے کیا ہوا ہے شہری؟...... میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''ہاں...... میں بھی شہری بھیا سے یہی کہہ رہی تھی مگر یہ جناب پچھلے دو روز سے بناء کچھ کھائے پیئے آپ کے بستر سے ٹیک لگائے بیٹھے خوامخواہ ٹینشن کری ایٹ کر رہے ہیں۔'' ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ لئے مزنی رحیم' ثمرن کی بات اچکتے ہوئے مسکرا کر بولی تو شہروز اسے محض گھور کر رہ گیا۔

نہیں معلوم ہے جاناں
کہ تم بھی ایک قاتل ہو
میرے اندر کا اک ہنستا ہوا انسان
تم نے مار ڈالا ہے

تھوڑی ہی دیر میں بڑی ماں چھوٹی ماں احتشام بھیا اور گھر کے دیگر افراد ثمرن کے کمرے میں چلے آئے تو شہروز دھیمے سے اس کے ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے چپ چاپ وہاں سے باہر نکل گیا۔

♦ ♦ ♦

گھر آ کر بھی وہ شدید ڈپریس رہی تھی بار بار ذہن کے کینوس پر اس معصوم سے بچے کی تصویر ابھر رہی تھی جو جانے کیوں اسے اپنی ماں سمجھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی سے بہتا ہوا خون اسے مضطرب کر رہا تھا۔ صائمہ اس کے لئے چائے کا کپ لے کر آئی۔ تو وہ دونوں ہاتھوں میں سر دبائے' خاصی نڈھال بیٹھی تھی۔

''آج آپ پھر لیٹ ہوگئیں آپا۔'' چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے معمول کی مانند اس نے پوچھا تھا جواب میں وہ ایک تھکی تھکی سی نگاہ اس کے خوبصورت سراپے پر ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''ہاں...... آج پھر میں پارک کی طرف چلی گئی تھی۔''

''آپ...... کیا آپ کو اب بھی یقین ہے کہ سلمان بھائی لوٹ کر آئیں گے اپنی رنگین دنیا چھوڑ کر۔''

''ہاں۔'' صائمہ کے سوال کے جواب میں اس کا سر بہت یقین کے ساتھ اثبات میں ہلا تھا۔

''اور اگر وہ لوٹ کر نہ آئے تو......؟ آخر کب تک انتظار کریں گی آپ ان کا۔''

"زندگی کی آخری سانس تک۔"

"آپ خود پر ظلم کر رہی ہیں آپا آپ کا انتظار لا حاصل ہے۔" اب کے صائمہ نے دب
میں احتجاج کیا تھا جواب میں ایک بے جان سی مسکراہٹ نازیہ شیرازی کے لبوں پر بکھر گئی۔

"کچھ آنکھیں انتظار کرتے نہیں تھکتیں صائمی بس پتھرا جاتی ہیں میری آنکھیں بھی سمجھ لو کہ
ہیں۔"

"ماں اور بابا آپ کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگے ہیں کیا سلمان بھائی کی محبت ماں پ
دونوں کی محبت پر بھاری ہے؟"

صائمی کے اس سوال پر اس نے بڑے عجیب سے انداز میں سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا
اگلے ہی پل آنکھیں موند کر بستر پر لیٹتے ہوئے بولی۔

"میرے اور سلمان کے بیچ کسی عشق و محبت کا سلسلہ تو تھا ہی نہیں صائمی اس نے کبھی مجھ سے
کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں...... میں خود پسند، انا پرست لڑکی میں بھی بھلا یہ سب کیسے
تھی اس سے؟ سو دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں اور ہم بچھڑ گئے۔" وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی
کی آنکھیں نمکین آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

"آپ سلمان بھائی کے بارے میں پتہ تو کریں آپا شاید ان کا کوئی دوست اس سلسلے میں
کوئی مدد کر سکے؟" صائمہ کے مشورے پر ایک مرتبہ پھر اس کے لبوں پر بڑی پھیکی سی مسکان بکھر کر
تھی۔

"کوئی اپنے آپ کو جان بوجھ کر گنواتا ہے صائمی تمہیں کیا لگتا ہے کیا میں نے اس کے ملن کو
نہیں کی ہوگی کیا وہ اس قابل تھا کہ اسے یوں آسانی سے فراموش کر دیا جائے۔ تم کیا جانو کہ اس کے۔"
پچھلے چھ سال میں نے کس اذیت کے عالم میں بسر کئے ہیں تمہیں کیا پتہ صائمی کہ وہ میرے لئے کیا ت
اب کے اس کے آنسو نکل کر گالوں پر لڑھک آئے تھے تبھی وہ ایک افسردہ سی نظر اس کے نڈھال سراپے
ڈالتے ہوئے بنا کچھ بھی کہے چپکے سے اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

"کہاں کھو گئے ہو سلمان، کبھی تو پلٹ کر پیچھے کی خبر لو، کبھی تو اپنے دیس کے بدلتے موسموں کا اح
جانو، کبھی تو واپس آ کر میری ان آنکھوں میں دیکھو سلمان جہاں برسوں سے گھمبیر سناٹے پڑاؤ ڈال کر
گئے ہیں آ کر دیکھو تو سہی پلیز۔"

آنسوؤں کا قافلہ جو آنکھوں سے روانہ ہوا تو پھر دور تلک گالوں پر بکھرتا چلا گیا۔ روز یونہی بکھر
کرچی کرچی ہو کر سمٹ جانا اب اس کے روز کا معمول بن کر رہ گیا تھا۔

"آپ...... میری مما ہیں ناں۔"

سلمان علوی کے تصورات میں پہلی بار کسی اور کے تصور نے دخل اندازی کی تھی پہلی بار اُ

تے ہوئے اس کی ذہنی روش بھٹک کر کسی اور سمت میں جا نکلی تھی۔
اعصاب جیسے اسی ایک بازگشت میں الجھ کر رہ گئے تھے تب شدید کوفت کا شکار ہو کر وہ اپنے بستر پر
ر بیٹھی۔

"پاپا...... یہ میری مما ہیں ناں......؟ پلیز بتایئے یہی میری مما ہیں ناں۔"

سماعتوں میں اب بھی اس معصوم سے بچے کا لہجہ بازگشت بن کر گونج رہا تھا اور وہ جیسے ساکت سی
ی مسلسل اس پھول سے معصوم بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کے بیگ میں اس بچے کے
کا قیمتی والٹ پڑا تھا مگر اس کی ذہنی رو جیسے بھٹک کر رہ گئی تھی۔

"اس بچے نے مجھے اپنی ماں کیوں کہا، میرا کیا واسطہ ہے اس کے ساتھ؟ کیوں میرے لئے چلا چلا
ر رہا تھا وہ آخر کیوں؟"

پورے تین دن یہی سوال اسے مسلسل ڈسٹرب کرتا رہا مگر ان تین دنوں میں وہ ایک بار بھی پارک
نہیں آ سکی تھی کچھ کام کی لوڈنگ زیادہ تھی تو کچھ ماں کی پریشانی کہ جن کی بیماری اب ختم ہونے کا نام ہی
ہیں لے رہی تھی۔ چوتھے روز وہ آفس سے ذرا جلدی باہر نکل آئی تھی۔ کچھ موسم بھی بہت اچھا ہو رہا تھا
تیجہ اس کے قدم خودبخود پارک کی جانب بڑھتے چلے گئے تھے۔ ہر روز کی مانند وہ اپنی مخصوص جگہ پر آ
ی تھی نگاہ کے سامنے اس وقت بھی کچھ چھوٹے چھوٹے سے معصوم بچے، کھیل میں مشغول دکھائی دے
ہے تھے مگر آج ان بچوں میں وہ بچہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا جو پچھلے تین روز سے بلاوجہ اس کے
صاب پر سوار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اس بچے کو تلاش کر رہی تھیں کہ جب اچانک ہی
ی نے پیچھے سے آ کر اس کی آنکھوں پر مضبوطی سے اپنے ہاتھ دھر دیئے تھے ایک لمحے کے لئے اس کے
میں موجود دل بہت بری طرح سے دھڑکا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس کی نگاہوں کے سامنے حیران کن منظر

◆ ◆ ◆

دوسری صبح خاصی روشن اور پُرسکون تھی۔ ہر طرف ہلکی ہلکی بکھری ہوئی دھوپ بہت بھلی لگ رہی
ا۔ وہ حائقہ بیگم کے ساتھ ناشتے کی ٹیبل پر آئی تو دادی ماں نے اُسے اپنے ساتھ والی کرسی پر ہی بٹھا

"بہت پیاری بچی ہے، اسے یہیں چھوڑ دو حائقہ، حویلی کی رونق میلاد دیکھ لے گی......"

"جی، میرا بھی یہی ارادہ تھا، ابھی تو میں اور سارہ گھر جا رہے ہیں، کچھ شاپنگ کرنی ہے، واپسی پر
ہما حویلی میں ارینج کر دوں گی سی بیٹی کا......"

گرم چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے اُنہوں نے بھی سبرینہ کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھا
جو سر جھکائے سارہ کے مقابل بیٹھی اپنے لانبے ناخن سے ڈائننگ ٹیبل کی سطح کو کھرچ رہی تھی۔ حائقہ

بیگم کے شوہر کے بارے میں کل شام ہی اُسے پتہ چلا تھا کہ اُن کی چند سال پہلے رحلت ہوگئی تھی۔

حائقہ بیگم اور سارہ ناشتے کے بعد اُس سے مل کر رخصت ہوگئیں تو دادی ماں نے اُس
احوال پوچھنا شروع کردیا۔

وہ بہت مختصر الفاظ میں اُنہیں اپنے متعلق فرضی کہانی سنا رہی تھی' جب کوئی تیز تیز قدم اُٹھا
ہال میں چلا آیا۔

''اماں...... میں نے مہندی کی تقریب کیلئے تمام انتظامات مکمل کروالئے ہیں' اور مہمانوں
گیسٹ روم اور دوسری حویلی بھی صاف کروادی ہے' مزید کوئی کام ہو تو بتائیں......''

خشک مگر مانوس آواز پر اُس نے فوراً چونک کر سر اُٹھایا تھا' جب نگاہ خود سے کچھ ہی فاصلے پر
ازہان کے خوبصورت سراپے پر جا پڑی' جو گھسی ہوئی بلو جینز پر وائیٹ ٹی شرٹ پہنے بے حد ہینڈسم
دے رہا تھا۔

وہ چاہنے کے باوجود اپنی نگاہوں کو اُس کے دِل کش سراپے سے ہٹا نہیں سکی تھی۔

ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ کوئی افسانوی ہیرو ہی دکھائی دے رہا تھا۔ تب اُس کا
چپکے سے دھڑکا تھا۔

عین اسی لمحے اس نے دادی ماں کو کہتے سنا تھا۔

''رنشاء کو لے آؤ بیٹے' وہ یہاں ہوگی تو حویلی کے سارے کام خود ہی سنبھال لے گی......''

''نہیں اماں' اُسے یہاں آنا ہوا تو خود ہی آجائے گی' مجھ سے اب مزید اُس کے ناز نخرے
اُٹھائے جاتے......''

''لیکن اِس بار غلطی تمہاری ہے' تم نے فضول ڈانٹا تھا اُسے' اب منانا تو پڑے گا ہی' آخر کو
ہے وہ تمہاری......''

دھڑ' دھڑ' دھڑ

سبرینہ احسان کے دِل میں ایک ساتھ جیسے کئی تیر یکلخت پیوست ہوکر رہ گئے تھے۔ دِل
احساسات کو بڑا زبردست دھچکا لگا تھا۔

وہ شخص' جس نے پہلی نظر میں اُس کے دِل کا قلعہ فتح کرلیا تھا' وہ اُس کا نہیں تھا۔ بھلا حائقہ
نے کب بتایا تھا اُسے کہ وہ شادی شدہ ہے۔ بتادیتیں تو شاید یوں ایک دم سے دِل پر چوٹ نہ لگتی۔

اِس لمحے اُس کا شدت سے من چاہ رہا تھا کہ وہ بلک بلک کر روئے' اپنی نادانی پر خوب ماتم کر
مگر چاہنے کے باوجود بھی وہ اُس وقت دادی ماں کے سامنے نہیں رو سکی تھی' ازہان اُن سے کچھ کہہ
مگر وہ کچھ بھی سننے سے قاصر ہوکر رہ گئی تھی۔

• • •

میں ریزہ ریزہ ہوا میں بکھر گیا چپ چاپ
تیرے فراق کا موسم گزر گیا چپ چاپ
کسی نے کان نہ ہرگز صدائے دِل پہ دھرے
میرے وجود میں اِک شخص مر گیا چپ چاپ

رخصت ہوئے دسمبر کی سرد ہوائیں' فضاء میں خنکی کے احساس کو بڑھاتی' شاید احساسات کو بھی منجمد کر رہی تھیں۔ مگر وہ خود اپنے آپ سے بے نیاز' ٹیرس پر کھڑی' دور اُفق کے پار ڈوبتے سورج پر اُداس نگاہیں جمائے جانے کن سوچوں کے تانے بانوں میں اُلجھی دکھائی دے رہی تھی۔

اُسے یاد آرہا تھا' جب وہ اپنے پاپا کی خواہش پر' اُن کی رحلت کے ٹھیک ایک ماہ بعد پاکستان آئی تھی تو بے حد نڈھال تھی۔ پیچھے کوئی بھی ایسا رشتہ نہیں رہا تھا' جو اُس کے پاؤں کی زنجیر بنتا' یا جس کی یاد اُس کے دِل میں چٹکیاں کاٹتی' صرف چند دوستوں کا ساتھ تھا' جن کی دُعاؤں کے حصار میں' بہت سے خوشنما خواب اپنی آنکھوں کے سپرد کرکے' وہ پاپا کے بتائے ہوئے ایڈریس پر' شدید خواری کے بعد بالآخر پہنچ گئی تھی۔ لندن کے خوشگوار موسم کے مقابلے میں پاکستان کی سلگتی دوپہروں نے اُسے خاصا بے حال کردیا تھا۔ اُس وقت وہ شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ اپنے پاپا کی زندگی میں بھی اُس نے کبھی پاکستانی لباس استعمال نہیں کیا تھا۔

شدید کڑکتی دھوپ میں براؤن گیٹ کے سامنے پہنچ کر کتنی ہی دیر تک وہ اپنے اعصاب کو مضبوط کرتی رہی تھی' تھکے تھکے سے وجود کو بمشکل سمیٹ کر اُس نے براؤن گیٹ کے سائیڈ میں لگی بیل پر انگلی رکھی تو پھر جیسے ہاتھ اٹھانا ہی بھول گئی' تب تقریباً پندرہ منٹ کے بعد کوئی خطرناک تیوروں کے ساتھ گیٹ کھول کر اُس پر دھاڑا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے......؟ زندگی میں پہلی بار کسی کے دروازے پر بیل دینے کا موقع مل رہا ہے کیا......؟''

گھسی ہوئی بلیک جینز پر بنیان پہنے رف حلئے کے ساتھ وہ یقیناً گہری نیند سے اُٹھ کر آیا تھا' تبھی اُس پر اپنا غصہ نکالا تو وہ مزید کنفیوز ہوکر رہ گئی۔

''سوری''

''مائی فٹ......' اب مجسمہ بن کر کیوں کھڑی ہوگئی ہیں' فرمائیں یوں بھری دوپہر میں دربدر بھٹکنے کی نوبت کیوں پیش آگئی آپ کو......؟''

اُس کا غصہ کسی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا۔ سبرینہ کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات مزید نمایاں ہو گئے تھے۔

تبھی وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر اُنہیں تر کرتے ہوئے بولی تھی۔

''مم...... مجھے مسز بیگم حائقہ دُرانی صاحبہ سے ملنا ہے' یہ...... اُنہی کا گھر ہے ناں......؟''

''جی اُنہی کا گھر ہے' مگر سوری وہ اِس وقت گھر پر نہیں ہیں' آپ بعد میں آیئے گا......''

کہنے کے ساتھ ہی اُس نے ٹھیک سے گیٹ بند کر دیا' تو سبرینہ کی آنکھیں بے بسی کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر آنسوؤں سے بھر آئیں۔

یہاں پاکستان میں اُسے ایسی بھی کسی سچویشن کا سامنا کرنا پڑے گا' اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا' شدید گرمی اور پر سے تھکن کا احساس اُسے چکر آنے لگے تھے' تبھی ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنی انگلی ڈور بیل پر رکھ دی۔ نتیجتاً تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ پھر پھنکارتا ہوا گیٹ سے برآمد ہوا تھا' مگر اِس بار وہ اُسے بولنے کا موقع دیئے بغیر خود ہی بول پڑی تھی۔

''دیکھئے میری بات سنئے پلیز' میں بہت دور سے آئی ہوں۔ اِس قدر شدید گرمی میں یہاں کھڑے ہو کر اُن کی واپسی کا انتظار کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے' نہ ہی میں اِس شہر میں کسی اور سے واقف ہوں' لہٰذا پلیز میرے حال پر رحم فرمائیں' میں یہاں کھڑے ہو کر آپ کو مکمل تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکتی......''

اُس کا چہرہ گرمی کی تمازت سے واقعی بہت سرخ ہو رہا تھا' تبھی وہ ایک گہری نگاہ اُس کے دِل کش سراپے پر ڈال کر گیٹ سے ہٹ گیا۔ سبرینہ نے اپنا سامان اُٹھا کر قدم آگے بڑھائے تو دِل بہت بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

''میں اِس وقت گھر پر اکیلا ہوں' ممی لوگ حویلی گئے ہوئے ہیں' اِسی لئے میں آپ کو اندر آنے کی دعوت دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا' بہرحال تشریف رکھیئے' میں آپ کے لئے ٹھنڈا لے کر آتا ہوں......''

اُسے وسیع ہال میں لانے کے بعد لاتعلق لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ وہاں مزید ٹھہرا نہیں تھا' جبکہ سبرینہ اُس کے جانے کے بعد بھی وہاں اُس کی موجودگی کے احساس کو محسوس کرتی رہی تھی۔ اپنے بابا کے بعد اُس نے وہ پہلا شخص دیکھا تھا جس سے اُس کا کوئی قریبی رشتہ تھا۔

''یہ لیجئے کولڈ ڈرنک' اور اب بتائیے مما سے کیوں ملنا چاہتی ہیں آپ؟''

کچھ ہی لمحوں میں پیپسی کی بڑی بوتل اور شیشے کا گلاس اُس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اُس نے پھر پوچھا تھا' جب وہ بولی۔

''میں لندن سے آئی ہوں' میرے پاپا نے روانگی سے قبل' مجھے حائقہ آنٹی کا ایڈریس تھما کر یہ نصیحت کی تھی کہ میں پاکستان میں صرف اُنہی سے ملوں' میرے پاپا نے حائقہ آنٹی کو اپنی بہن بنایا ہوا تھا' اِسی لئے......'' جانے کیا بات تھی کہ وہ فوری طور پر اُس پر اعتبار نہیں کر سکی تھی۔

''آئی سی' خیر میں مما کو ابھی فون کر کے آپ کی یہاں آمد کی اطلاع دے دیتا ہوں' شام تک وہ یقیناً یہاں آجائیں گی' تب تک آپ یہیں آرام کیجئے......؟''

اُس کی جھوٹی روداد پر کسی حد تک یقین کرتے ہوئے وہ اگلے ہی لمحے دوٹوک لہجے میں کہتا وہاں

ے اُٹھ گیا تھا' جواب میں سبرینہ اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وہیں صوفے پر نیم دراز ہو کر لیٹ گئی۔ ے سی کی ٹھنڈک سے سلگتے اعصاب پر ٹھنڈی پھوار کا کام کیا تھا' تاہم اِس سے پہلے کہ وہ نیند کی مہربان نہوں میں جھولتی' اُسے اپنے بائیں پاؤں پر کسی حشرات کے رینگنے کی حرکت محسوس ہوئی اور تب وہ ایکدم ے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

ذرا کی ذرا جو نگاہ اپنے پاؤں پر ڈالی تو بے ساختگی میں چیخ اُٹھی' کیونکہ اُس کے پاؤں سے تھوڑے ہی فاصلے پر زرد رنگ کا بچھو بڑی بے نیازی سے رینگتا جا رہا تھا۔ ازہان اُس کی چیخ پر بوکھلا کر فوراً اپنے کمرے سے نکلا تو وہ لپک کر اُس کے بازو سے لگ گئی۔ بائیں پیر پر جیسے کسی نے انگارہ رکھ دیا تھا۔

''کیا ہوا......؟''

اُسے تھر تھر کانپتے دیکھ کر اُس نے پریشانی سے پوچھا تھا' جب وہ شدید تکلیف کے عالم میں اُس کی جہ دُور جاتے بچھو کی جانب مبذول کرواتے ہوئے بولی۔

''اُس نے یہاں میرے پاؤں پر کاٹ لیا ہے......''

''اونو......''

وہ لمحے میں بے حد پریشان ہو اُٹھا تھا۔

اُس وقت فوری طور پر بچھو کو مارنے کے بعد اُس نے تیزی سے بائیک نکالی اور سر پر کیپ لئے بغیر برینہ کو اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تھا۔

گاڑی حائقہ بیگم اور اُن کے بچے گاؤں لے گئے تھے یہی وجہ تھی کہ اُس کا پارہ گزرتے ہر پل کے ساتھ بڑھتا آسمان کو جا لگا تھا۔ مفت میں گلے پڑی مصیبت پر وہ اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا تھا۔

شدید کڑکتی دھوپ میں جھلستے ہوئے اُس نے بائیک کو فل سپیڈ پر چھوڑ دیا تھا' جس کی وجہ سے سبرینہ مزید حواس باختہ ہو کر رہ گئی تھی' قطعی نہ چاہتے ہوئے بھی اُس نے ازہان کی کمر کے گرد مضبوطی سے اتھ لپیٹ لیا تھا۔

تکلیف کی شدت تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

ازہان کے غصے کا حال دیکھنے والا تھا۔ ایک تو شدید گرمی' اوپر سے اُس کا ساتھ چپکا وجود اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بائیک کو کسی چیز میں دے مارتا۔

خدا خدا کر کے ایک میڈیکل کلینک دکھائی دیا تو اُس نے فوراً بائیک روک دی۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں سبرینہ انجکشن لگوا کر اُس کے ساتھ کلینک سے باہر نکلی تو اُس کی شکل دیکھ کر وہ اپنا سارا غصہ بھول گیا۔ تکلیف کی شدت سے وہ خود زرد پڑ گئی تھی۔ اوپر سے لمبے سفر کی تھکان اور خواری۔

واپسی میں اُس نے اخلاقیات کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے بائیک کی سپیڈ نارمل رکھی تھی۔ گھر پہنچ کر اُس نے اُسے پھر سے لاؤنج میں سلانے کی غلطی دوبارہ نہیں کی' بلکہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ پھر بیڈ

پر بٹھا کر فریج سے جوس نکالا' اور جب تک سبرینہ نے گلاس ختم نہیں کر دیا وہ وہیں کھڑا رہا۔

"یہ میرا کمرہ ہے' فی الحال آپ یہیں آرام کریں' میں باہر لاؤنج میں ہوں' کسی چیز کی ضر پڑے تو بلا لیجئے گا......"

اپنے مخصوص مختصر انداز میں کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا تو سبرینہ اُس کے بیڈ کی پٹی ٹیک لگا کر پلکیں موند گئی۔

اُس کے وجود سے اب تک ازہان کی خوشبو آ رہی تھی۔

پہلو میں موجود دِل دھڑ دھڑ کرتا' اب بھی اُس کی قربت کو محسوس کر رہا تھا۔ پورے بدن پر ا لرزش طاری تھی۔

اُسے اپنا یہ کزن بے حد اچھا لگا تھا۔ اُس کے بارے میں اگر وہ Love at first sight کا کرتی تو شاید بے جا نہ ہوتا۔

پورے کمرے میں جیسے اُسی کی مخصوص خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے آنکھیں کھول کر ارد جائزہ لیا' ہر چیز سے ٹپکتی نفاست اُس شخص کے سوبر ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ اب سے پہلے اس نے وقت بھی دیارِ غیر میں بسر کیا تھا' وہ اُس میں بے حد محتاط رہی تھی۔ ضرورت کے سوا کبھی گھر سے باہر نہ ہی غیر ضروری لوگوں سے فضول روابط رکھتی تھی یہی وجہ تھی کہ اب تک اُس کے دل کا مندر ویران رہا تھا۔

ازہان وہ پہلا شخص تھا جس نے اُس کے دِل کے معصوم احساسات کو چھوا تھا۔ اُس روز گہری نی بانہوں میں جانے سے پہلے بہت دیر تک وہ اُس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ شام میں حائقہ بیگم آ تو وہ اُنہیں دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ازہان اُنہیں اُس کی تفصیلی رپورٹ پہلے ہی دے تھا۔

● ● ●

اُداس موسم کے رتجگوں میں
ہر ایک لمحہ بکھر گیا ہے
ہر ایک رستہ اُجڑ گیا ہے
پھر ایسے موسم میں کون آئے؟
کوئی تو جائے
تیرے نگر کی مسافتوں کو سمیٹ لائے
تیری گلی میں ہماری سوچیں بکھیر آئے
تجھ بتائے کہ کون کیسے اُچھالتا ہے وفا کے موتی
تمہاری جانب

کوئی تو جائے میری زبان میں تجھے بلائے
تجھے منائے
ہماری حالت تجھے بتائے' تجھے رُلائے
تو اپنے دِل کو بھی چین آئے!

رات کے پُر سکون لمحے خاموشی سے دھیرے دھیرے سرک رہے تھے' مگر نیند اسفند شیرازی کی غلافی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ ہر روز کی طرح آج بھی ایک عجیب سے الاؤ میں دہکتا دِل' کسی کروٹ قرار نہیں پا رہا تھا۔ گزشتہ سات سال سے دِل کی خلش اُسے بے قرار کئے ہوئے تھی۔

سوچوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو تصور کے پردے پر چھم سے دو خوبصورت براؤن آنکھیں آنسو چھلکاتے ہوئے اُبھر آئی تھیں۔

ایسا کب سوچا تھا اُس نے؟

بھلا ایسا کب چاہا تھا؟ کہ زندگی کی پُر تلخی پر کسک سہہ کر بھی اُس نے کبھی کسی کو بلاوجہ تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ وہ چھوٹا سا تھا جب اُس کی والدہ کی ڈیتھ ہو گئی تھی' شعور نے ابھی اِس صدمے کو ٹھیک سے سنبھالا بھی نہیں تھا کہ اُس کے والد' ایک پرائی عورت کو اُس کی مما بنا کر گھر لے آئے۔ وہ چونکہ حساس تھا اور اپنی مما سے بے حد اٹیچ بھی تھا' لہٰذا اس نئی تبدیلی کو چاہ کر بھی ذہن سے قبول نہیں کر پایا تھا۔ نتیجتاً بکھرتا چلا گیا۔

دادی ماں کے بے تحاشا لاڈ پیار کے باوجود سوتیلی ماں کے نا قابل برداشت رویئے نے روز بار روز اُس کے مزاج میں چڑچڑا پن اور بیزاری بھر دی تھی۔ بچپن جیسے تیسے گزر گیا۔ تاہم جوانی کی دہلیز پر پہنچتے ہی وہ اپنی دادو کو ساتھ لے کر' پاکستان سے باہر چلا گیا۔

کئی سال چپ چاپ گزر گئے۔

دیارِ غیر میں آ کر جہاں اُسے سب سے بڑا یہ فائدہ ہوا کہ وہ ذہنی اذیت سے مبرا ہو گیا' وہیں سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ وہ غلط صحبت میں پڑ کر اخلاقی اور اسلامی اقدار سے دُور ہوتا چلا گیا۔

دادی ماں' بہت عرصے تک اُس کی دوہری شخصیت سے فریب کھا کر اُس کی غلط سرگرمیوں سے بے خبر رہی تھیں۔ زندگی کے بہت سے سال دیارِ غیر میں "عیاشیوں" کی نذر کرنے کے بعد دادی ماں کے مجبور کرنے پر' بہت مختصر مدت کے لئے وہ اچانک اُن کے ساتھ دو چار ہفتوں کے لئے پاکستان چلا آیا تھا۔

اس روز موسم خاصا ابر آلود ہو رہا تھا۔ رم جھم بارش کا سلسلہ صبح سے ہی جاری تھا۔ وہ چونکہ اپنے گھر والوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا بنا کسی کو اطلاع کئے ایئر پورٹ سے ٹیکسی لے کر چلا آیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا۔

مکمل بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس بکھرے بکھرے سے بالوں کے ساتھ خوبصورت موسم کو انجوائے

کرتے ہوئے ٹیکسی سے اتر کر وہ پیدل گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایریا جانا پہچانا تھا' مگر گزشتہ دس سالوں میں یہاں اس قدر تبدیلیاں در آئی تھیں کہ اسے اپنا گھر ڈھونڈنا دشوار ہو رہا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں موسم کی خنکی مین مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ سرسبز درختوں کی جھولتی شاخوں اور اردگرد قطار در قطار لگے درختوں کا سبزہ نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ ٹاپ ٹاپ برستی پھوار کی ننھی ننھی بوندیں اس کے سیاہ ریشمی بالوں پر گر کر دودھیا ہیروں کی مانند جگمگا رہی تھیں۔ جو حسن اسے پاکستان میں دیکھنے کو ملا تھا۔ اس کی مثال یورپ میں ملنا بہت مشکل تھی۔

سرسبز درختوں کے بیچ کہیں کہیں ٹنڈ منڈ درختوں پر بیٹھے دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اب اپنے اپنے گھونسلوں کو واپس پلٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ مبہوت قدرت کے نظاروں میں مہنک کھوئے کھوئے سے انداز میں قدم اُٹھاتا آگے کو بڑھ رہا تھا' جب اچانک مسلسل بارش کی وجہ سے سڑک پر بن جانے والے کسی گڑھے کے باعث اس کا پاؤں مڑا اور اگلے ہی پل وہ اپنا توازن قائم نہ رکھتے ہوئے دھڑم سے زمین پر آ گرا۔

خوبصورت نفیس کپڑے ہاتھ میں پکڑا بھاری سوٹ کیس اور بائیں کندھے پر پڑا کوٹ سب کیچڑ کی نذر ہو کر رہ گیا تھا تبھی اس کی سماعتوں سے کسی کی مترنم ہنسی کی چھنکار ٹکرائی تھی۔

نگاہیں اٹھا کر اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو نظر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک محل جیسے گھر کے ٹیرس پر کھڑی ایک دوشیزہ منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کے باوجود کھلکھلاتے ہوئے سرخ ہو رہی تھی۔ زندگی میں بہت سی لڑکیوں کے ساتھ پالا پڑا تھا اس کا مگر اتنی حسین لڑکی نگاہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مغربی و مشرقی حسن کے امتزاج کی حامل وہ دلکش سی لڑکی کچھ ایسا سحر رکھتی تھی کہ وہ اپنی بے باک نگاہوں کو چاہ کر بھی اس کے دلکش سراپے سے ہٹا نہیں پایا تھا۔

ڈارک بلو کلر کے پلین سوٹ میں ملبوس پریوں سی شان و شوکت والی وہ خوبصورت لڑکی آنکھوں کے رستے دل میں اتر رہی تھی۔ مدہوشی کی یہ کیفیت نجانے کب تک برقرار رہتی کہ اگلے لمحے میں وہ مجسم حسن نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ تب ایک دم سے چونک کر وہ اپنے حواس میں واپس لوٹا تھا۔

اگلے بہت سے دن اس نے سخت بے کلی کی نذر کر دیئے تھے۔ دن کا قرار اور رات کی نیند دونوں سے محروم ہو کر رہ گیا' محض دل کی خوشنودی کے لئے یونہی بے سبب وہ کئی بار اس محل سے گھر کے سامنے سے گزرا تھا اکثر کئی کئی گھنٹے اسی گھر کے سامنے بائیک روکے موبائیل پر بے سبب دوستوں سے لمبی گپ شپ بھی لگاتا رہا تھا' مگر ان سب کوششوں کے باوجود وہ پھر دوبارہ اسے دکھائی نہیں دی تھی۔

دل کا اضطراب تھا کہ ہر گزرتے پل کے ساتھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ نجانے کون سا بندھن تھا کہ جس نے پاکستان میں اس کے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ گھر والوں کے نامناسب رویئے کے باوجود وہ پاکستان کا ہو کر رہ گیا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ اس حسین دوشیزہ کا کھوج لگاتا اس کے گھر والوں سے راہ

ورسم بڑھاتا اور بھیانک حادثہ ہوگیا تھا کہ جس کے متعلق اس نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا۔

دل کے اضطراب کے ساتھ ساتھ کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کے بادل بھی بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ پچھلے چند گھنٹوں میں وہ جانے کتنے پیکٹ خالی کر چکا تھا۔ یورپ سے دوبارہ پاکستان واپسی میں اس نے پورے تین سال کا عرصہ بیتا دیا تھا' مگر یہ قرار نجانے کس چڑیا کا نام تھا کہ اسے حاصل ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

گو اب بھی اسے پاپا کی بے نیازی تکلیف دیتی تھی۔ اب بھی انہیں اپنے سوتیلے بہن بھائیوں ساحر شیرازی اور رملہ کے ساتھ محو گفتگو دیکھ کر وہ اپنے اکیلے پن پر کڑھتا تھا' رات کے سناٹے اور دن کی بے حسی اسے اب بھی اذیتوں سے دوچار کرتی تھی۔ اب بھی اپنے اسٹیپ مدر کا نامناسب رویہ محسوس کر کے وہ چیختا تھا' مگر ان سب تکلیفوں کے باوجود وہ اس لڑکی کے تصور کو ذہن سے نہیں جھٹک پایا تھا کہ جسے دل میں بسا کر وہ خود اسے اذیتوں کے سپرد کر گیا تھا۔ نادانستگی میں ہی سہی' مگر جو گناہ وہ کر بیٹھا تھا اب اس کا ازالہ شائد کبھی ممکن نہیں تھا۔

• • •

منزلیں بھی اس کی تھیں' رستہ بھی اس کا تھا
ساتھ ساتھ چلنے کا فیصلہ بھی اس کا تھا
سب ہی اس کے اپنے تھے' قافلہ بھی اس کا تھا
اور پھر اچانک ہی راستہ بدلنے کا
فیصلہ بھی اس کا تھا
آج میں اکیلی ہوں' آج میرا دل مجھ سے
یہ سوال کرتا ہے
لوگ تو سب اس کے تھے
کیا خدا بھی اس کا تھا

وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ جب اس کے مقابل کھڑے اس چھوٹے سے بچے نے اچانک اس کی آنکھوں سے اپنے ہاتھ ہٹا کر آہستگی سے اس کا آنچل تھام لیا۔

''آپ اتنے روز تک مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟'' معصوم سی آنکھوں کا عجیب سا شکوہ اسے پھر پریشان کر گیا تھا۔

''مجھے چوٹ لگی تھی۔ پھر بھی آپ مجھ سے ملنے کے لئے نہیں آئیں۔ کیوں مما؟ کیا میری چوٹ پر آپ کو دکھ نہیں ہوا۔''

اب کے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ نازیہ شیرازی کا دل اس لمحے سخت اضطراب

کے عالم میں گرفتار تھا۔ سوچ سوچ کر بھی وہ اس معصوم سے بچے کے احساسات سمجھنے میں ناکام دکھ
دے رہی تھی۔

"مجھے آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا مما پلیز میرے ساتھ گھر چلیں ناں۔"

ننھے سے ہاتھ کی پشت سے آنسو رگڑتے ہوئے وہ اب اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا' جب اس
بمشکل اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"میں آپ کی مما نہیں ہوں بیٹے۔"

"نہیں آپ جھوٹ بول رہی ہیں آپ ہی میری مما ہیں۔"

اب کے وہ بری طرح سے مچلا تھا۔ جواب میں نازیہ شیرازی نے گھبرا کر مدد طلب نگاہوں
ادھر اُدھر دیکھا۔ پارک میں اس وقت اکا دکا لوگ موجود تھے' مگر ان میں سے بھی کوئی ان دونوں کی طر
متوجہ نہیں تھا۔

"میں ریئلی آپ کی مما نہیں ہوں بیٹے' پلیز ٹرائے ٹو انڈسٹینڈ می۔"

نا چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ قدرے بھیگ گیا تھا۔ جب کہ وہ بجھتی ہوئی نگاہوں سے اس
طرف دیکھ رہا تھا۔

"سلمان یہ لو آئس کریم بیٹے اور اب جلدی سے گھر چلو۔"

وہ ابھی بچے کو بہلانے کے لئے کوئی مناسب الفاظ سوچ ہی رہی تھی کہ عین اسی لمحے اس کا با
دونوں ہاتھوں میں آئس کریم کے کپ لئے اس کے قریب چلا آیا' جونہی نگاہ نازیہ شیرازی کے چہر
پڑی وہ وہیں ٹھٹھک کر رُک گیا۔

"پاپا' مما کو دیکھئے ناں' یہ مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں ان کا بیٹا نہیں ہوں۔"

آنے والے شخص کو قریب پاتے ہی اس نے منہ بسور کر شکایت کی تھی' جواب میں وہ ایک سرسر
نگاہ نازیہ شیرازی کے سادہ سے حلئے پر ڈالنے کے بعد خاصے محتاط انداز میں بولا۔

"میں نے اس روز آپ سے کیا کہا تھا مانی' چلو شاباش چل کر گاڑی میں بیٹھو۔"

"نہیں آج میں مما کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔" ضدی لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی آ
کریم والا کپ زمین پر دے مارا تھا۔

"دیکھو اچھے بچے فضول کی ضد نہیں کرتے۔ یہ آپ کی مما نہیں ہیں مانی' پلیز گھر چلو۔"

نازیہ شیرازی نے اس اونچے لمبے خاصے سنجیدہ شخص کو اس معصوم سے پانچ چھ سالہ بچے کے سا
قطعی بے بس پایا تھا' تبھی وہ خود کو ان دونوں باپ بیٹے کی طرف متوجہ رکھنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"نہیں یہی میری مما ہیں انہوں نے مجھ سے پیار کیا تھا۔"

اسے اپنی مما ثابت کرنے کے لئے اس نے اپنی الگ ہی منطق بنائی ہوئی تھی۔ نازیہ شیرازی کا

لمحے کے لئے اس معصوم سے بچے کے احساسات پر تڑپا تھا' مگر اگلے ہی پل وہ چہرہ پھیر کر ان دونوں
بیٹے سے لاتعلق ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

"سلمان پلیز گھر چلو بیٹے میں آل ریڈی بہت تھک گیا ہوں' پلیز مجھے مزید پریشان مت کرو۔"

"مجھے مما چاہئے پاپا یہی والی مما چاہئے۔ آئی پرامس پھر میں آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گا۔"

اب کے اس کے الفاظ پر نازیہ کے ساتھ ساتھ اس کے مقابل کھڑے اس خوبرو سے شخص کا چہرہ
ندامت سے سرخ پڑ گیا تھا کہ جس نے پہلی سرسری ملاقات کے بعد دوبارہ اس کی طرف نگاہ ڈالنا بھی
ارہ نہیں کی تھی۔

"چلو گھر میں جتنی رعایت دیتا ہوں تم اتنا ہی سر چڑھتے جا رہے ہو میرے۔" کہنے کے ساتھ ہی
شخص نے بچے کے بازو کو مضبوطی سے جکڑ لیا تو وہ جیسے تڑپ کر رہ گیا۔

"مما...... مما پلیز مجھے روک لو' پلیز مما...... مما پلیز۔"

اپنے باپ کی گرفت میں پوری طرح مقید ہونے کے باوجود وہ زور زور سے ہاتھ پاؤں مارتے
ئے چلا جا رہا تھا۔ پارک میں موجود اکا دکا لوگ بھی اب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ تبھی شاید اس
دماغ کی رگیں پھڑ پھڑائی تھیں۔ شدید غصے کے عالم میں' وہ خود پر سے اپنا کنٹرول یکسر کھو بیٹھا تھا۔ لہٰذا
اختیار ہو کر اس نے ایک تھپڑ بچے کے پھول سے نازک گال پر جڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو جیسے
موجود ہر چیز گویا ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ خود نازیہ شیرازی کا دل اس پل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔

"محبت کی زبان تمہیں سمجھ میں نہیں آتی کیوں میرے سر کا درد بن کر زندہ رہ گئے ہو تم۔"

وہ مزید یہ تماشہ نہ دیکھ سکی لہٰذا بری طرح سے چلا اٹھی تھی۔

"بس بہت ہو گیا آپ کا غصہ اب اور نہیں۔"

بچے نے جو اسے اپنی سیٹ سے اٹھ کر بولتے ہوئے دیکھا تو نم آنکھوں کے ساتھ فوراً دوڑ کر اس
لپٹ گیا۔

"مما آئی لو یو مما میں آپ کے ساتھ رہوں گا' پلیز مجھے اکیلا چھوڑ کر کہیں مت جانا پلیز۔"

مفت کی مصیبت گلے پڑ رہی تھی' مگر وہ بچے کا معصوم سا دل توڑنے کے حق میں نہیں تھی' لہٰذا گھٹنوں
بل زمین پر بیٹھ کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"آئی لو یو ٹو بیٹا۔ میں ہی آپ کی مما ہوں اور اب آپ کو کوئی مجھ سے الگ نہیں کر سکتا۔"

اس کے الفاظ نے بچے کے ساتھ ساتھ مقابل کھڑے اس خوبرو سے سنجیدہ شخص کو بھی نہایت شاکڈ
ڈالا تھا کہ جو اس وقت اپنی غلافی نگاہوں میں حد درجہ حیرانگی لئے خاصی بے یقینی کے عالم میں یک ٹک
اکی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

• • •

دھوپ کی دشت میں آ گئے سائباں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
اوڑھ لیں گے کسی دن زمین آسماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے
زخم دل کے جزیرے بھی تھے جا بجا' جن سے ٹکرا گئے
دل کے پاتال میں ایک درد نہاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

''آ گئیں تم......ارے میں پوچھتی ہوں کہاں تم سارا دن؟ اور یہ کون سا ٹائم ہے تمہارا گھر آنے کا......''

وہ جونہی گھر میں داخل ہوئی صبیحہ بیگم کی زناٹے دار آواز نے قدم وہیں روک دیئے۔ آج ایک مرتبہ پھر وہ شدید بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

''ماں......میں تو......میں تو کالج میں ہی تھی' اور میں اپنے نوٹس مکمل کر رہی تھی اور......''

''بس لڑکی بہت دھول جھونک لی تم نے ہماری نگاہوں میں۔ آ لینے دو تمہارے باپ کو تمہاری منحوس کتابوں کو آگ نہ لگوا دی تو صبیحہ نام نہیں میرا' غضب خدا کا دیدوں کا سارا پانی ہی ڈھل گیا' کا' ذرا خوف خدا ہوا سے......''

سختی سے اس کی بات کاٹ کر وہ پھر سے انگارے چبانے لگیں تو سنعیہ کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''میرا یقین کرو ماں۔ میں کالج میں اپنے نوٹس ہی مکمل کر رہی تھی۔ آپ چاہیں تو میری دوست سے پوچھ سکتی ہیں۔''

آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھر آیا تھا۔ تبھی صبیحہ بیگم نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور دوبارہ سے اپنی پسندیدہ انڈین فلم دیکھنے میں مشغول ہو گئیں۔ تو ناچار سنعیہ بے بسی سے اپنے لب کاٹتے ہوئے مرے مرے سے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

آج اسے ایک مرتبہ پھر اپنی مما بے حد یاد آ رہی تھیں۔ صبح سے ہی ان کا دل بے حد اداس ہو رہا تھا کیونکہ آج اس کی مما کی برسی تھی۔ آج ہی کے روز وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں تھیں' سنعیہ کے لئے یہ دن غم کا حامل تھا' مگر گھر میں اور کسی کو بھی قطعی کوئی پروا نہیں تھی۔ مما نے کیسے پھولوں سے بڑھ کر پرورش کی تھی۔ کبھی ہلکے سے بھی اسے نہیں ڈانٹا تھا' مگر یہ عورت مسلسل اس کی زندگی عذاب کئے ہوئے تھی۔

اپنے کمرے میں بستر پر گرتے ہی' وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔

''آپ اتنی جلدی' اتنی دور کیوں چلی گئیں مما...... جانا ہی تھا تو اپنی سنی کو بھی ساتھ لے جاتیں۔ کس کے سہارے چھوڑ گئیں مما......اب میں کیسے جیوں گی آپ کے بغیر؟''

گرم گرم آنسوؤں کا لاوا پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر پھیل آیا تھا۔ سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

تنہا اجاڑ' بے رونق زندگی میں اک مما کی خواہش' اس کی اعلیٰ تعلیم کا خواب ہی تو اس کے جینے کا سہارا رہ گیا تھا' مگر اس کی سوتیلی ماں کو یہ بھی گوارہ نہیں تھا۔ یہ عورت جسے اس کے پاپا اس کی مما کی وفات کے ڈیڑھ سات ماہ بعد ہی بیاہ کر گھر لے آئے تھے' ہر ممکن طریقے سے اس کا یہ حسین خواب توڑ دینا چاہتی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں جیسے پھٹ جانے کو تیار ہو گئی تھیں۔

میں تھک گئی ہوں
اس زندگی سے شاید اکتا گئی ہوں
نہیں ہے اتنا حوصلہ کہ سہہ سکوں
ان موسموں کی شدت......
اب برداشت نہیں کر سکتی
راتوں کو دیر تلک جاگ کر تارے گننا' اب بہت دشوار لگتا ہے
ہر نئی صبح اک امید اور ان دیکھے احساس کے ساتھ طلوع ہوتی ہے
اور ہر اک شام' اپنے دامن میں ایک انجانا دکھ اور اداسی سمیٹے
رخصت ہو جاتی ہے
یہ پرانے اداس منظر دیکھ دیکھ کے میری آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں
اور میرے پاؤں ان کٹھن راستوں پر چلتے چلتے شل ہو گئے ہیں
زندگی کے اس صحرا میں' میں بہت دور تلک چلے جانا چاہتی ہوں
اپنے کرچی کرچی وجود کو سمیٹ کر' مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھنا
روز جینا' روز مرنا' بہت اذیت ناک ہے
میں جینا چاہتی ہوں' یا شاید مرنا چاہتی ہوں
بس......روح کی تسکین چاہتی ہوں

شام کے دھندلکے تیزی سے گہرے ہو رہے تھے' جب پاپا نے ملازم کے ہاتھ اسے بلا بھیجا۔ دل کے اندر ہی کانپ کر رہ گیا۔ گرم سیال نگینے بہت تیزی سے پلکوں کی باڑ کراس کر کے پھر سے گالوں پر آ گئے تھے۔ آنے والی قیامت کا تصور وہ بخوبی کر سکتی تھی۔ تبھی مرے مرے سے قدموں کے ساتھ اچھی طرح سر پر جما کر وہ لاؤنج میں چلی آئی' جہاں اس کے پاپا غیاث الدین صاحب [illegible] صوفے پر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ صبیحہ بیگم بھی اسی صوفے پر براجمان تھی۔ جب [illegible] فاصلے پر کھڑی مزے سے چیونگم چباتے ہوئے اسے خاصی قابل رحم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"السلام وعلیکم پاپا!" ان کے پاس پہنچ کر بمشکل اس نے ہلکی سی آواز میں سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں ثانی' کیا کرتی پھر رہی ہو تم آج کل؟"

سرخ انگارے جیسی بڑی بڑی آنکھیں' ماتھے پر ہزاروں سلوٹیں' وہ ان کی طرف ایک نظ کانپ گئی تھی۔

"پاپا...... وہ مما غلط......"

"تڑاخ۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتی' غیاث الدین صاحب کے تھپڑ۔ آنکھوں میں تارے نچادیئے۔

"گستاخ' بدزبان لڑکی تمہیں شرم نہیں آتی اپنی ماں کو جھوٹا کہتے ہوئے' بس...... بہت سے تمہارا کالج جانا بند' بہت پڑھ لکھ کر تمیز سیکھ لی تم نے اب مزید اور نہیں۔"

ایک منٹ میں سختی سے اپنا فیصلہ سنا کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے سنعیہ درد سے بلبلا کر رہ گئی۔

"نہیں پاپا' پلیز ایسا مت کریں مجھے معاف کردیں' پلیز...... پلیز پاپا......"

مضبوطی سے ان کے پاؤں پکڑے وہ گڑگڑاتی رہی لیکن غیاث الدین صاحب کا پتھر دل ہوا۔ لہٰذا ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑ ان کے پیچھے پیچھے ہی صبیحہ بیگم بھی مسکراتی نگاہوں سے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کمرے میں چلی گ

"چچ چچ...... بیچاری پڑھاکو لڑکی۔ سنو ایسا کرو کہ اپنی یہ موٹی موٹی کتابیں۔ کسی ردی کا کے ہاتھ فروخت کردو' تاکہ چار پیسے ہی مل جائیں وگرنہ...... مما تو پھر انہیں آگ لگا ہی دیں گی۔"

اپنے خوبصورت لانبے' کیوٹکس لگے ناخنوں سے کھیلتے ہوئے۔ پنکی دل جلے انداز میں سنعیہ کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ آہستہ سے نفی سے سر ہلاتے ہوئے وہ پھوٹ پھو پڑی تھی۔

♦ ♦ ♦

سوچا تجھ کو پھول کہوں میں
لیکن پھول بکھر جاتا ہے
سوچا تجھ کو چاند کہوں میں
لیکن چاند غروب ہو جاتا ہے
سوچا تجھ کو خواب کہوں میں
لیکن خواب تو مر جاتا ہے
سوچا تجھ کو وقت کہوں میں
لیکن وقت گزر جاتا ہے

سوچا تجھ کو شام کہوں میں
لیکن شام تو ڈھل جاتی ہے
اور تو ڈھلتی شام نہیں ہے
تیرا کوئی نام نہیں ہے

خود فراموشی کے عالم میں' ٹیرس کے آہنی جنگلے پر دونوں کہنیاں ٹکائے وہ دھیمے دھیمے یہ نظم گنگنا رہی جب اچانک احتشام بھیا نے دبے پاؤں پیچھے سے آکر "باؤ" کہتے ہوئے اسے ڈرا دیا۔

"توبہ شامی بھیا' آپ نے تو میرا دل ہی نکال دیا تھا۔"

احتشام نواز کی مسکراہٹ پر قدرے خفگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ثمرن نے شکایت کی تھی' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"سوری بھئی' اصل میں تم اتنی گم سم سی ہو کر کھڑی تھیں کہ بے مقصدی میری رگ ظرافت پھڑک ویسے یہاں کیوں کھڑی ہو' نیچے سب لوگ تمہارا ناشتے کی ٹیبل پر انتظار کررہے ہیں۔"

"ہاں...... وہ میں بس نیچے آ ہی رہی تھی کہ یہاں کھڑے ہو کر نیچے لان کے رنگا رنگ پھولوں کو کر رک گئی۔ کتنی خوبصورت زندگی ہے ناں یہاں کی؟ کیسے دلفریب موسموں کا دیس ہے پاکستان؟"

احتشام کی آنکھوں میں چھپے ممکنہ سوال سے بچنے کے لئے اس نے فوراً رخ پھیر کر دھیمے لہجے میں بڑاتے ہوئے کہا تھا' جب وہ بغور اس کی سوجھی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھ کر قدرے سنجیدگی سے لے۔

"جب یہ دیس اتنا ہی پیارا ہے تو یہاں سے فرار کے راستے کیوں ڈھونڈ رہی ہو ثمی۔"

جس ممکنہ اذیت سے وہ بچنا چاہتی تھی۔ وہی اذیت اب بانہیں کھولے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی' ی وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

"میں نے اپنا مستقبل پاکستان سے وابستہ کردیا ہے بھیا' اس دیس سے فرار اب ممکن نہیں ہے رے لئے۔"

"تو پھر کل کی تقریب میں تم نے شہروز کے پرپوزل کو ملتوی کیوں کردیا؟ جب یہ طے ہے کہ تم نوں کو ایک ہونا ہے' تو پھر یہ فرار کیوں ثمی؟"

مرنی نے غالباً اس کا صاف انکار ان لوگوں تک نہیں پہنچایا تھا' تبھی وہ سرد آہ خنک فضاؤں کے سپرد رتے ہوئے اداسی سے بولی۔

"میں ابھی زندگی کے کسی بھی امتحان کے لئے مینٹلی تیار نہیں ہوں بھیا' میرا مطلب ہے' ابھی میں ادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں نہیں نبھا سکتی' پھر ویسے بھی یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی ریں گے' پاپا کریں گے' میں اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کے لئے بااختیار نہیں ہوں۔"

ثمرن ازہان کے اداس الفاظ پر بغور سوچتے ہوئے وہ ابھی کچھ کہنے ہی جا رہے تھے کہ اسی پل فا
وہاں چلی آئی۔

’’ثمرن آپی‘ شام بھیا‘ آپ لوگوں کو مما نیچے ناشتے کے لئے بلا رہی ہیں۔‘‘

فائزہ کی پکار پر احتشام نواز نے فوراً ہی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

’’لو میں تو بھول ہی گیا۔ کہ نیچے ناشتے پر ہمارا شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے‘ ویسے تم باتونی بہت
ثمرن۔‘‘ مسکرا کر اپنا سارا الزام ثمرن ازہان پر ڈالتے ہوئے وہ شرارت سے بولے تو ثمرن کے سا
ساتھ فائزہ بھی ہنس پڑی۔

’’توبہ کریں احتشام بھیا‘ چلاکی میں تو آپ کو شیطان بھی اپنا گرو مانتا ہے۔‘‘ ہنس کر ثمرن ازہان
طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنا نقطہ نظر واضح کیا تھا۔

’’اچھا...... اور تم...... تم بھی تو مکر و فریب میں نانی ہو اس کی۔ بتاؤں تمہارے کارنامے۔‘‘

ایک دم مصنوعی غصے سے اسے گھورتے ہوئے وہ شرارت سے بولا۔ تو فائزہ پھر سے کھلکھلا کر ہنس
پڑی۔

’’معافی دے دیں بھیا جی اور نیچے چلیں پلیز‘ وگرنہ اب شہروز آ جائے گا۔‘‘

مسکرا کر کہتی فائزہ کے پیچھے وہ دونوں بھی ہنستے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئے تھے۔

سامنے ہی وسیع ہال میں ڈائننگ ٹیبل کے گرد سب لوگ بیٹھے آپس میں گپ شپ لگاتے ہو
انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ تبھی وہ سرسری سی اک نگاہ سب پر ڈالتے ہوئے ادب سے سلام کرتی بڑی ما
کے پہلو میں جا بیٹھی۔

’’وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی رحمت ہے‘ کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔‘‘

وہ ابھی سب کو سلام کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھی ہی تھی کہ بڑے تایا کے بیٹے واصف نے کن اکھیوا
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چہک کر شعر پڑھا۔ جواب میں وہ اپنی مکمل توجہ اس پر مرکوز کرتے ہوئے
بدو لہجے میں بولی۔

’’جناب! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ خاکسار کو یہاں آئے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوگ
ہے‘ آپ کی آنکھیں ہی اب کھلی ہیں تو میں کیا کروں؟‘‘

’’واؤ...... یہ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی زبان وہاں شکاگو میں ہی بھول آئی ہیں جب ک
یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔‘‘

واصف نے یقیناً اس کے الفاظ کو انجوائے کیا تھا‘ تاہم اس سے پہلے کہ وہ پھر اسے کوئی کرارہ
جواب دیتی۔ بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے آف موڈ کے ساتھ شہروز علوی وہاں چلا آیا۔

’’میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہوا ہے کہ میرے کمرے میں کسی کو نہ جانے دیا کریں‘ پھر بھی

کام والی ہر روز گھس کر کوئی نہ کوئی چیز غائب کر دیتی ہے‘ اب بھی دیکھئے مجھے اپنے موزے نہیں مل رہے
ں۔‘‘ ثمرن ازہان نے اس کی آواز پر فوراً اسے پیشتر مچلتے دل کو سنبھالتے ہوئے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا‘ مگر
وہ اس وقت اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

’’وہ سب ٹھیک ہے‘ مگر تم یہ اس طرح سے سوٹڈ بوٹڈ ہو کر آخر جا کہاں رہے ہو؟‘‘

چھوٹی ماں نے قدرے حیران نگاہوں سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ جب وہ ذرا سا
رخ پھیر کر بولا۔

’’آفس جا رہا ہوں‘ کچھ ضروری کام ہے وہاں۔‘‘

’’ضروری کام ہے تو ہوا کرے‘ مگر آج کوئی آفس نہیں جا رہا‘ سنا تم نے۔‘‘

’’ممی پلیز...... تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گا۔‘‘

’’نہیں ایک بار منع کر دیا تو سمجھو کر دیا‘ فضول بحث مت کیا کرو مجھ سے ویسے بھی احتشام کی شادی
نزدیک ہے‘ تم گھر پر رہو اور شاپنگ کرنے میں ہماری مدد کرو۔‘‘

چھوٹی ماں کے سخت لہجے پر چار و ناچار وہ برا سا منہ بناتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر‘ عین ثمرن ازہان
کے مقابل آ بیٹھا‘ روٹھی روٹھی سی اک نگاہ اس پر ڈالی تو ثمرن نے تیزی سے چہرے کا رُخ پھیر لیا۔

’’مما...... یہ لوگ آج کل ہم سے بڑے الگ تھلگ سے رہنے لگے ہیں‘ ان سے پوچھئے تو آخر
پرابلم کیا ہے؟‘‘

وہ جو اس پر اپنی خفگی کا بار ڈالنا چاہ رہا تھا‘ اب اس کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے
خاموش نہ رہ سکا تو احتشام نواز کی رگ ظرافت جیسے پھر سے پھڑک اٹھی۔

’’تاں...... آپ خود کیوں نہیں ’’لوگوں‘‘ سے پوچھ لیتے کہ انہیں کیا مسئلہ ہے۔‘‘ احتشام نواز کی
صاف چوٹ پر اس نے قدرے گھور کر خفگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

’’چلو اب کھا جاؤ یہاں بیٹھے بیٹھے‘ مجھے نظروں ہی نظروں میں۔‘‘

وہ پھر سے اپنے کمانڈ...... انداز میں بولے تو ثمرن سمیت وہاں بیٹھے سبھی افراد کی ہنسی چھوٹ گئی۔
جب کہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے شہروز علوی کے لبوں کو بھی چھو لیا۔

’’ثمی بیٹے‘ کیا شردل بھائی کی دوبارہ تم سے کوئی بات ہوئی؟‘‘

اب کے بڑی بڑی پھپھو نے اسے مخاطب کیا تھا‘ جس پہ ایک مرتبہ پھر سب کی نگاہیں اس کی طرف
متوجہ ہوئی تھیں۔

’’نہیں پھپھو...... جس روز انہوں نے مجھے پاکستان کے لئے روانہ کیا تھا‘ اسی روز وہ خود ہانگ
کانگ کے لئے فلائی کر گئے تھے‘ پاپا کو احتشام بھیا کی انگیج منٹ تقریب اٹینڈ نہ کرنے کا بہت افسوس تھا‘
مگر کچھ بزنس پرابلم کی وجہ سے انہیں ایسا کرنا پڑا۔ تاہم اُمید ہے کہ جلد ہی وہ پاکستان ضرور آئیں گے۔‘‘

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے بیٹی' ہماری تو آنکھیں ترس گئی ہیں اسے دیکھنے کے لئے'
سال قبل یہاں سے تعلیم حاصل کرنے گیا تھا' مگر ایسا گیا کہ پھر پلٹ کر اس گھر کا کبھی نہیں ہو سکا۔
زندگی دیارِ غیر میں گزار ساتھ سال قبل اگر اسے ہماری یاد آئی تھی تو صرف چند دن رہ کر واپس پلٹ گ
جانے اتنی ساری محبتوں کو بھلا دینے کا حوصلہ کہاں سے سمیٹ لایا ہے وہ۔''

اب کے بڑے تایا شاہ نواز ازہان نے خود کو گفتگو میں شریک کیا تھا۔ تبھی وہ دھیمے سے بول
تھی۔

''پاپا نے آپ لوگوں کو کبھی نہیں بھلا دیا بڑے پاپا' وہ جب بھی پاکستان کا' آپ سب کا ت
کرتے تھے' ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی تھیں' میں کبھی اندازہ نہیں لگا پائی کہ وہ آپ لو
سے کس قدر پیار کرتے ہیں؟ ہاں مگر...... پندرہ سال قبل جب مما میری گود میں اپنی بیماری کی آخری آ
پہنچ کر درد سے کراہ رہی تھیں اور اس وقت پاپا انہیں بے یار و مددگار تڑپتا چھوڑ کر یہاں پاکستان
چھوٹے تایا کی ڈیتھ پر چلے آئے تھے' تب میں نے جانا تھا کہ وہ آپ لوگوں سے کتنا پیار کرتے ہیں
اگلے ہی ہفتے وہ واپس چلے آئے تھے' مگر میرا یقین کیجئے تایا ابو' ان کی آنکھوں میں مما کی موت کے
نہیں تھے۔ وہ صرف اور صرف چھوٹے تایا کی ڈیتھ پر نڈھال تھے رو رو کر انہیں یاد کر رہے تھے۔ مما
شادی کے لمحات پر پچھتا رہے تھے' حالانکہ مما نے زندگی بھر انہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ کوئی آز
کوئی الزام نہیں دیا تھا۔ ہمیشہ ان کی رضا میں راضی رہی تھیں۔ دکھ سہہ کر بھی ہر پل مسکراتی رہی تھیں
پھر بھی وہ انہیں پا کر آپ سب کو کھو دینے کے دکھ میں مبتلا رہے تھے۔ کتنی عجیب بات ہے ناں تایا ابو
جس مما کے لئے انہوں نے آپ سب کو چھوڑا اسی مما کی موت پر وہ ان کی بجائے آپ لوگوں کے لئے
رہے تھے۔''

انکشاف کرتی ثمرن ازہان کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ تاہم اس سے قبل کہ
اس سے اظہار ہمدردی کرتا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھال کر اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔

''سوری...... جذبات کی رو میں بہہ کر میں بھی جانے کیا کیا کہہ گئی۔'' سب کی طرف بھیگی نگاہ
سے دیکھتے ہوئے اس نے آہستہ سے ایکسکیوز کیا تھا۔

''تایا ابو...... اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا تھی۔''

اگلے ہی پل وہ نظریں جھکاتے ہوئے پھر سے شاہ نواز ازہان صاحب سے مخاطب ہوئی تھی
جواب میں وہاں بیٹھے سبھی افراد نے قدرے چونک کر خاصی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

• • •

ابھی وہ درد باقی ہے
اگرچہ وقت مرہم ہے

مگر کچھ وقت لگتا ہے
کسی کو بھول جانے میں' دوبارہ دل بسانے میں
ابھی کچھ وقت لگتا ہے
ابھی وہ درد باقی ہے
میں کس طرح نئی الفت میں اپنی ذات گم کر دوں
کہ میرے جسم و وجدان میں ابھی وہ درد باقی ہے
ابھی اس شخص کی مجھ پر نگاہ سرد باقی ہے
ابھی تو عشق کے رستوں کی
مجھ پر گرد باقی ہے
ابھی وہ درد باقی ہے

چھ سالہ معصوم سا بچہ' اس کے ساتھ لگا بے حد مسرور ہو رہا تھا' جب کہ وہ اپنے مقابل کھڑے اس
سنجیدہ شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''میں اس بچے کی ٹریجڈی کو سمجھنے سے قاصر ہوں' مگر پھر بھی آپ کا بی ہیویئر اس بچے کے ساتھ
افزا نہیں ہے۔''

مقابل کی نگاہوں میں اب بھی حیرانگی کا عنصر نمایاں تھا' مگر نازیہ شیرازی نے اپنی توجہ اب پھر اس
معصوم سے بچے کی جانب مبذول کر لی تھی' جو اس لمحے اس سے پھر بچھڑ جانے کے خوف سے سہا'
قمیض کو نہایت مضبوطی سے پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔

''آپ اپنی مما سے پیار کرتے ہیں ناں؟'' ذرا سا جھک کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے اس نے
تھا۔

''ہاں۔'' خوشی و خوف کی ملی جلی کیفیت میں مبتلا اس نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''مما سے پیار کرتے ہو' تو مما کی بات بھی ماننا پڑے گی بیٹے!''

اب کے اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے بال سنوارنے تھے' جواب میں وہ اس کے مزید قریب

''ابھی آپ پاپا کے ساتھ جاؤ جان' ابھی مما آپ کے ساتھ گھر نہیں چل سکتی۔''

''کیوں نہیں چل سکتی' وہ احمد اور زیب کی مما تو ہر وقت ان کے ساتھ رہتی ہیں' پھر آپ میرے
ریوں نہیں رہ سکتی مما۔''

معصوم سی آنکھوں میں فوراً ہزاروں شکوے امڈ آئے تھے۔ جواب میں وہ نہایت محبت سے اس کے
پھولے گال چومتے ہوئے بولی۔

"مما کی مجبوری ہے بیٹے' ابھی آپ پاپا کے ساتھ گھر جاؤ' میں تھوڑی دیر میں خود آپ کے
جاؤں گی۔"

"پرامس۔" بچے نے بہت آس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
مسکرا کر بولی۔

"ایک دم پکا پرامس۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر اپنے مقابل کھڑے بچے کے باپ سے
ہوئی تھی۔

"سوری مسٹر مگر فی الحال یہ سب ضروری تھا اور یہ...... آپ کا والٹ اس روز یہاں گر گیا
نے سنبھال لیا۔ چیک کر لیجئے' آپ سے انشاء اللہ پھر تفصیلی ملاقات ہوگی۔"

وہ اب بھی حیران حیران سا خاموش کھڑا تھا۔ تبھی نازیہ شیرازی نے اس کی طرف سے تو
ایک بھرپور نگاہ پھر سے اپنے قریب کھڑے چھوٹے سے بچے پر ڈالی' پھر نہایت محبت سے اس کو
چومتے ہوئے۔ اس سے کل پھر ملنے کا پرامس کرتی' وہ پارک سے باہر نکل آئی تھی۔ زندگی نے بہت
طریقے سے اپنا ڈھب بدلا تھا۔ نازیہ شیرازی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس دوراہے پر کس طرح
سنبھال کر رکھے۔

• • •

"اب کیسی طبیعت ہے بیٹی؟"

جونہی اس کے آنسو تھمے' حائقہ بیگم نے بہت پیار سے اس کے ریشمی بال سمیٹتے ہوئے
جواب میں وہ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

"چلو اب بتاؤ کون ہو آپ؟ اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں۔"

ازہان یقیناً انہیں تمام معلومات بہم پہنچا چکا تھا۔ تبھی وہ اپنی سرخ آنکھیں مزید رگڑتے
بولی۔

"میرا نام سبرینہ ہے اور مجھے میرے بابا نے یہاں پاکستان میں آپ سے ملنے کے لئے کہا تھا

"آپ کے بابا نے ...... ؟ کیوں ...... ؟ میرا مطلب ہے وہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

حائقہ بیگم ابھی تک اپنے لاڈلے بھائی کی اکلوتی اولاد کو پہچان نہیں پائی تھیں۔ پہچانتی بھی
زندگی میں پہلی بار اس سے مل رہی تھیں۔ درمیان میں انیس بیس سال کا فاصلہ تھا۔

"بابا کہتے تھے آپ مجھے دیکھتے ہی لپک کر بانہوں میں بھر لیں گی۔ یہ جان جائیں گی کہ میں
کے لاڈلے بھائی کا خون ہوں' بابا کے بقول میری شکل اُن سے بہت ملتی ہے' کیا اب بھی آپ نے
نہیں پہچانا حائقہ پھوپھو؟"

اُس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ پھٹی پھٹی نگاہوں میں بے یقینی

غبار صاف دکھائی دے رہا تھا' تب وہ لاؤنج میں پڑے اپنے بیگ سے وہ چند تصویریں نکال لائی تھی' جن
میں ماضی کے چھ لمحے قید تھے' وہ جانتی تھی اُسے پاکستان میں اپنی شناخت کیلئے' اپنے پاپا کی ان بے جان
تصویروں کی ضرورت پڑے گی لہٰذا وقت رخصت وہ اِنہیں اپنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔

حائقہ بیگم نے تمام حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد' بہت زور سے کھینچ کر اُسے اپنے گلے
سے لگایا تھا۔ قطعی دیوانگی کے عالم میں وہ اُس کی پیشانی اور گالوں کو بھی چوم رہی تھیں۔

"یا اللہ' مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا کہ میں ایک مدت کے بعد اپنے احسان سے متعلق کسی حوالے
سے مل رہی ہوں......"

اُن کے الفاظ و انداز سے بخوبی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنے لاڈلے بھائی کو کس قدر عزیز رکھتی ہونگی۔

"احسان کیسا ہے بیٹے؟ وہ...... وہ آیا کیوں نہیں تمہارے ساتھ' کیا ابھی تک ناراض ہے
وہ......؟"

اُس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اُنہوں نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ پوچھا
تھا' جب وہ اُن کو بھی دھوکے میں رکھتے ہوئے بمشکل اپنا دُکھ چھپا کر مدہم لہجے میں بولی۔

"نہیں پھوپھو' پاپا آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں' کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اُنہوں نے آپ کو
فراموش نہیں کیا' مگر...... اُن کی بہت سی مجبوریاں ہیں پھوپھو' فی الحال وہ پاکستان نہیں آ سکتے......"

اِس لمحے اُس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اُس کا لہجہ بھی بھر آیا تھا۔

"اچھا...... وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ اپنا خیال تو رکھتا ہے ناں وہ......؟ صحت تو اچھی ہے ناں اُس کی؟"

"جی...... بہت اچھی ہے' بہت سکون میں ہیں وہ......"

آنسوؤں کا قافلہ اب پلکوں سے روانہ ہو کر گالوں تک آ پہنچا تھا' جب وہ اُس کے آنسو پونچھتے
ہوئے بولیں۔

"روؤ نہیں بیٹے' اب تو آپ میرے پاس آ گئی ہو' میں آج ہی احسان سے بات کرونگی' اُس کا نمبر دو
مجھے' پھر دیکھنا کیسے ڈانٹتی ہوں میں اُسے' بہت ڈرتا ہے وہ مجھ سے چاہے بوڑھا کیوں نہ ہو گیا ہو' میرے
لئے تو اب بھی چھوٹا سا بچہ ہی ہے' تُم آرام کرو' میں تب تک خدا کی پاک ذات کے حضور شکرانے کے دو نفل
ادا کر آؤں۔"

اُس کے گال تھپتھپاتی' وہ اپنی بات مکمل کرنے کے ساتھ ہی اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں تو
سبرینہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ابھی نجانے اُسے اور کتنی ہی ایسی آزمائشوں کی پل صراط سے گزرنا تھا۔ جانے کتنے جھوٹ بولنا
تھے۔

اگلے روز ناشتے کے بعد حائقہ پھوپھو نے پھر اُس سے احسان صاحب کے نمبر کے بارے میں

پوچھا تو وہ صاف جھوٹ بولتے ہوئے اُنہیں پھر ٹال گئی۔

''پھوپھو! مجھ سے اُن کا نمبر کھو گیا ہے' زبانی یاد بھی نہیں کیا تھا' لندن سے پاکستان آتے ہوئے راستے میں سیل بھی کہیں گر گیا' بٹ یوڈونٹ وری' پاپا کے پاس آپ کا لائین نمبر ہے' میں کچھ روز تک اُن سے رابطہ نہیں کرونگی تو وہ خود ہی کال کرلیں گے' تب آپ اُن سے بات کرسکتی ہیں......''

اُس کے تفصیلی جواب و معذرت پر وہ بجھ کر رہ گئی تھیں۔ تبھی وہ اُن کا دھیان بٹانے کی غرض سے اپنا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے التجائیہ لہجے میں بولی۔

''پھوپھو! میں حویلی جا کر وہاں دادا دادی سے بھی ملنا چاہتی ہوں' اُس گھر کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جہاں پر پاپا نے جنم لیا تھا' مگر...... مگر میں ڈرتی ہوں کہ حائقہ پھوپھو! اگر دادا جی اور دادی ماں نے' مجھے قبول نہ کیا تو......؟ اگر اُنہوں نے بابا کا غصہ مجھ پر نکالا تو......؟''

''ایسا نہیں ہوگا بیٹے' بہت سال بیت گئے ہیں' اب اُن کا غصہ وہ پہلے جیسا نہیں رہا......''

''میں بھی ایسا ہو' مگر پھر بھی آپ فی الحال اُنہیں میرے بارے میں کچھ بھی سچ مت بتایئے گا' پلیز......''

اُس کے ملتجی انداز پر کچھ لمحوں کیلئے وہ سوچ میں پڑ گئی تھیں' مگر بعدازاں وہ اُسے تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

''ٹھیک ہے' جیسا آپ کہو گی میں ویسا ہی کرونگی' ویسے بھی آج کل حویلی میں حمدان کی شادی کی تیاریاں چل رہی ہیں' میرا بڑا بیٹا ہے حمدان' حویلی میں کم ہی رہتا ہے' مگر آج کل شادی کے سلسلے میں مستقل وہیں قیام ہے' ازہان تو خیر بچپن سے ہی وہیں پلا بڑھا ہے' احسن کے بعد اِسی نے ابا جی کو سنبھالا ہے' بہت پیار کرتے ہیں وہ اِس سے' ایک بیٹی بھی ہے میری' سارہ' تمہاری ہم عمر ہی ہوگی' بہت شرارتی ہے' حویلی چلو گی تو سب کے بارے میں جان جاؤ گی......''

وہ اُسے بتا رہی تھیں' اور سبرینہ بہت دلچسپی سے سب کے بارے میں سنتی رہی تھی۔

اگلے روز وہ حائقہ بیگم اور ازہان کے ساتھ حویلی چلی آئی تھی۔

یہاں پہنچ کر سب سے پہلا ٹکراؤ ہی اُس کا ذرنشاء آفندی سے ہوا تھا' جو حویلی کے ملازمین سے لان میں لگے امرود کے پیڑ سے' پکے ہوئے میٹھے امرود اُتروا رہی تھی' اُس نے اُسے سارہ سمجھا تھا' مگر حائقہ پھوپھو اُس کی جانب توجہ دیئے بغیر' اُسے ساتھ لئے اندر بڑھ گئی تھیں' جہاں حویلی کے وسیع ہال میں دادی ماں کے پاس گاؤں کی سیدھی سادھی بہت سی عورتیں اکٹھی ہوئیں' مختلف کاموں کے لئے مشورے کر رہی تھیں۔ اُس کا دِل ایک مرتبہ پھر زور سے دھڑکا تھا۔ سالوں بعد زندگی میں پہلی بار وہ اُس چہرے کو دیکھ رہی تھی' جس کی محبت میں اُس نے اپنے پاپا کو ہمیشہ بے قرار دیکھا تھا۔

حائقہ پھوپھو نے اُس کا تعارف اپنی کسی دوست کی بیٹی کی حیثیت سے کروایا تھا' مگر پھر بھی وہ بہت

...ائیت و محبت کے ساتھ پیش آئی تھیں' سبرینہ اُن کے مشفق سینے میں منہ چھپا کر رونا چاہتی تھی' مگر اُسے ...کا موقع نہیں ملا۔

حویلی میں ایک چیز جو اُس نے اسپیشلی نوٹ کی تھی' وہ ذرنشاء آفندی کی اہمیت تھی۔ وہ ہر کام میں ...ن پیش رکھی جا رہی تھی' ہر بات میں اُس سے مشورہ لیا جا رہا تھا۔ سارہ اور حمدان بھیا کا اخلاق بھی اُسے ...بے حد اچھا لگا تھا۔

حائقہ بیگم کے سوا کوئی بھی اُس کی اصل شناخت سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔ سب اُسے حائقہ بیگم کی ...ست کی بیٹی کی حیثیت سے ہی کمپنی دے رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ذرنشاء آفندی سے ہار گئی تھی۔ ازہان اُس سے چھین گیا تھا اور وہ بدنصیب بے خبر رہ گئی تھی۔

حویلی میں اُس روز حمدان بھیا کے تیل کی رسم چل رہی تھی' گہما گہمی اور رونق میلا اپنے عروج پر تھا' ...ر...... اُس کا دِل بے حد اُداس ہو رہا تھا' لہٰذا وہ ٹیرس سے اُٹھ کر اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

چاہنے کے باوجود وہ ازہان کا ساتھ ذرنشاء آفندی کے ساتھ قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ آنکھوں میں ...ہ پاتے خواب اور دِل میں طے ہوئے پُرانی حویلی سے منسلک خوب صورت ارادے سب خاک ہو گئے ...ے۔ دِل کی نگری بسنے سے پہلے ہی اجڑ گئی تھی مگر اِس کے باوجود اُسے خود کو سنبھالنا تھا۔

آج سے کچھ سال قبل اس نے اپنے پاپا سے پوچھا تھا۔

''پاکستان کیسا ہے پاپا؟ وہاں کے لوگوں میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ اُنہیں باوجود کوشش کے بھی ...اموش نہیں کیا جا سکتا۔'' جواب میں اس نے پاپا نے سرد آہ بھرتے ہوئے نہایت حسرت زدہ لہجے میں جو ...لجھ کہا تھا' وہ آج ان الفاظ کی تغیر میں خود اپنی ذات کو الجھا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

• • •

کبھی ویران رستوں پر
کوئی انجان سی دستک' اگر تم کو سنائی دے
صدا اِک شکل میں آ کر کہے
محبت نام ہے میرا......
پلٹ کر دیکھنا مت تم
کہ اس راہِ محبت میں اذیت ہی اذیت ہے

''خدا کا نام لے یار اور گاڑی نکال' مجھے پوری اُمید ہے کہ آج وہ کالج نہیں آئے گی۔''

وہ دونوں پچھلے ایک گھنٹے سے گرلز کالج کے سامنے گاڑی روکے کھڑے تھے۔ ایک نرم مان... ...ذکی کی بے تاب نگاہیں سامنے وسیع روڈ پر جمی تھیں۔ جہاں سے ہر روز وہ اس پیاری سی لڑکی کو کالج آتے ...نے دیکھتا کہ جو پچھلے کئی ماہ سے اس کے دل میں گھس آئی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ از حد مصروفیت کے باوجود اگر ایک دن بھی اس کا دیدار نہ کرتا' تو وہ پو
اس کا شدت بوریت کی نذر ہو جاتا تھا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا۔ سارے دن ایک عجیب سی بے قراری اپنے احاطے میں لئے رہتی تھی اور شب میں نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور چلی جاتی۔

وہ جو آج تک خود دلوں کو کھونا سمجھ کران سے کھیلتا آیا تھا۔ اب جانے یہ کیسا مکافات عمل تھا کہ ایک بالکل عام سی لڑکی کی محبت میں بے حال ہو کر رہ گیا تھا۔

"عمر پلیز یار' نکل یہاں سے اب تو کالج شروع ہوئے بھی دو گھنٹے ہو گئے ہیں' اب اس کے
کی اُمید چھوڑ دو۔"

کافی دیر بعد پھر جاوید نے اس کا مضبوط کندھا ہلاتے ہوئے کہا' تو وہ دکھ سے گہری سانس
کے سپرد کرتے ہوئے چپ چاپ گاڑی میں آبیٹھا۔

"پتہ نہیں یار آج ایسا کون سا مسئلہ درپیش آ گیا اسے جو وہ کالج نہیں آئی۔"

غصے سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ قدرے دکھی لہجے میں بولا تو جاوید نے کسی قدر ہمد
سے اس کی طرف نگاہ کی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا یار' کہ آخر پوری دنیا چھان مارنے کے بعد تجھے اس عام سی لڑکی میں ک
نظر آیا؟ کیوں اس کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو تم۔ خوبصورت لڑکیوں کی تمہیں کوئی کمی ہے کیا؟"

اب کے جاوید کے لہجے میں کسی قدر جھنجلاہٹ نمایاں تھی' تبھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ عمر عبا
نقوی کے گداز لبوں پر بکھر کر رہ گئی۔

"تم نہیں سمجھو گے یار یہ دلوں کے سودے ہیں' دل کے لین دین میں خوبصورتی کبھی شرط نہیں ہوتی' محبت تو بس ایک نظر کا کھیل ہے اور اس لمحاتی کھیل میں کب' کہاں کسے شکست ہو جائے کیا خبر!"

نگاہیں سامنے وسیع روڈ پر مرکوز کئے وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا تو جاوید حیرانگی سے دنگ
گیا۔ کہاں تو وہ عاشقوں کو "ست جانور" کا خطاب دیا کرتا تھا' محبت کرنے والوں کا مذاق اڑاتا تھا کہاں اب خود طلسماتی جملے بول رہا تھا۔ وہ حیران نہ ہوتا تو اور کیا کرتا؟

"عمر آر یو او کے یار۔"

بغور اس کی براؤن بھیگی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جاوید نے اپنائیت سے پوچھا' تو ایک زخمی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے عمر عباس نقوی نے آہستہ سے اپنی پلکیں موند لیں۔

"آئی ڈونٹ نو۔"

"عمر میرے یار یہ رستہ ٹھیک نہیں ہے' مت لگا خود کو محبت کا روگ۔ یہ تیرے بس کا کھیل نہیں ہے
بس رنگ برنگی تتلیوں سے من بہلا اور زندگی کو انجوائے کر۔"

اپنی دانست میں اس نے عمر کو بڑا نایاب مشورہ دیا تھا' مگر اس نے جاوید کی نصیحت پر کان نہ

رہے۔

♦ ♦ ♦

اپنی رسوائی تیرے نام کا چرچا دیکھوں
اِک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں
شام بھی ہو گئی دھندلا گئیں آنکھیں بھی میری
بھولنے والے میں کب تک تیرا رستہ دیکھوں
تو میرا کچھ بھی نہیں لگتا' مگر اے جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لئے دل کو دھڑکتا دیکھوں
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جانے کا ہر روز تماشہ دیکھوں
سب ضدیں اس کی میں پوری کروں ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اسے ہنستا دیکھوں
مجھ پر چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رت میں مہکتا دیکھوں
میں نے جس لمحے کو پوجا ہے اسے بس ایک بار
خواب بن کر تیری آنکھوں میں اترتا دیکھوں
تو میری طرح سے یکتا ہے مگر میرے حبیب
جی میں آتا ہے کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

پلکیں موندے نہایت جذب کے عالم میں۔ وہ پروین شاکر کی یہ خوبصورت نظم سنا رہا تھا' جب کہ
ید افسردگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کن سوچوں میں الجھ گیا تھا۔

پچھلے تین ماہ سے یہ شخص محض ایک عام سے نقوش والی سیدھی سادھی لڑکی کی راہ میں' دیوانوں کی
ح پلکیں بچھائے اپنا ہر ضروری سے ضروری کام پس پشت ڈالے' کھڑا رہتا تھا۔ لیکن ان پچھلے تین ماہ
ں ایک مرتبہ بھی اس لڑکی نے کبھی نظر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا' مگر پھر بھی وہ اس کے پیچھے پاگل
ہا تھا کیوں؟

اگر یہ واقعی محبت تھی تو بہت عجیب تھی' کم از کم وہ ایسی محبت کا ہرگز قائل نہیں تھا۔ بچپن سے عمر کو جانتا
وہ رگ رگ سے واقف تھا اس کی۔ وہ جو باپ کی وفات کے بعد اکلوتا ان کے کروڑوں کی جائیداد پر
ل رہا تھا' جس کے سر پر نہ ممتا کا مہربان سایہ تھا' نہ بہن بھائیوں کا سہارا' محض ملازموں کے ساتھ
بنگلے جیسے وسیع گھر میں لاابالی سے زندگی بسر کرنے والا وہ شخص محبت کے چکر میں الجھنے والا نہیں تھا۔

تو پھر اب......اب ایسا کیا ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھا؟

سوچ سوچ کر اس کا اپنا دماغ بھی درد کرنے لگا تھا۔ اگلے چار پانچ روز تک یہی سلسلہ جاری تھا۔ روز وہ کالج گیٹ سے قدرے فاصلے پر گاڑی روک کر کھڑے ہوتے' لیکن ہر روز انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ جانے اس لڑکی کو زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا' کہ پچھلے پانچ روز سے دکھائی ہی نہ دے رہی تھی۔ گزرنے والے ان پانچ روز میں عمر عباس نقوی کا حال دیکھنے والا تھا۔ اپنے کھانے پہننے اوڑھنے کی سدھ بدھ بھلائے وہ محض اس سادہ سی لڑکی کے لئے' بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپ رہا تھا۔

♦ ♦ ♦

تم نجانے کس جہاں میں کھو گئے......؟
ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے
تم نجانے کس جہاں میں کھو گئے......؟
نیند بھی آتی نہیں چین بھی آتا نہیں
دل کو یہ کیا ہو گیا ہے' کوئی شے بھاتی نہیں
لوٹ کر میرا جہاں چھپ گئے ہو تم کہاں......؟
تم کہاں......تم کہاں......؟
تم نجانے کس جہاں میں کھو گئے......؟
ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا کیئے' وہ اپنے بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے بیٹھی' سکون سے پلکیں موندے مکمل طور پر اس گیت کے بولوں میں کھوئی ہوئی تھی' جب اچانک صائمہ' دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر کمرے کے اندر چلی آئی۔

''آپا! یوں کمرے میں اندھیرا کیئے کیوں بیٹھی ہو؟''

ہمیشہ کی طرح اس کے سوال میں گہری اپنائیت تھی، تبھی وہ ڈیک کا بٹن آف کر کے سیدھی ہو ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں۔ بس یونہی کچھ تھکن محسوس ہو رہی تھی تو لیٹ گئی۔''

اس کی وضاحت پر صائمہ شیرازی نے محض چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کی تھی، پھر آہستہ نگاہیں جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

''ایسا کب تک چلے گا آپا! کسی کا انتظار کرنے کے لئے سات سال کا عرصہ بہت طویل ہوتا آپ نہیں جانتی پچھلے کئی روز سے اماں آپ کے متعلق سوچتے ہوئے رات بھر جاگتی رہتی ہیں۔ آپ کے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟''

اب کے خاموش رہنے کی باری نازیہ شیرازی کی تھی۔

''پلیز آپا! اس خود فراموشی کے دور سے اب باہر نکل آیئے، محبت اداس موسموں کے ٹھہرنے کا نہیں ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں میں۔''

گہری سانس بھرتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھوں کی شفاف ہتھیلیوں پر ایک افسردہ سی نگاہ ڈ تھی۔

''میں جانتی ہوں صائی کہ اسے لوٹ کر نہیں آنا، میں جانتی ہوں کہ میں نے اس سے محبت کر خود اپنے ہاتھوں اپنا دل اجاڑا ہے، مگر تم بے فکر رہو صائی، میں اپنے غم کی بھٹی میں تمہاری خوشیاں جلنے نہ دوں گی۔''

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا آپا!''

صائمہ شیرازی کو بے ساختہ اپنی نگاہیں چرانا پڑیں تھیں۔

''یو ڈونٹ وری۔ میں جلد ہی اماں اور بابا سے اس مسئلے پر بات کروں گی۔''

اب کے اس نے اپنا دایاں ہاتھ، مقابل بیٹھی صائمہ شیرازی کے بائیں گال پر دھر دیا تھا۔

''آپا پلیز مجھے غلط مت سمجھیں، میں اپنی بات نہیں کر رہی ہوں، میں جسٹ آپ کی اور اماں، بابا بات کر رہی ہوں، آپ کو صرف یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آپ سلمان بھائی کو بے وفا مت سمجھ ... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان گزشتہ سات سالوں میں ان کی ڈیتھ......''

''نہیں۔''

وحشت سے لرزتے ہوئے نازیہ شیرازی نے فوراً اس کی بات کاٹی تھی۔

''آئندہ ایسا کبھی سوچنا بھی مت صائی، میں جانتی ہوں وہ زندہ ہے، کیونکہ جب تک میرے

دھڑکتا رہے گا۔ اسے موت نہیں آ سکتی، میرے سینے میں دھڑکتا مچلتا یہ دل، اس بات کی شہادت ہاں کہیں بھی ہے زندہ ہے۔''

مان علوی کے لئے اس کی محبت کبھی صائمہ شیرازی سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی، لیکن اس وقت جو ے نازیہ شیرازی کی آنکھوں میں مچلتی نظر آئی تھی، اس نے بخوبی اسے باور کروا دیا تھا کہ سلمان ت میں اس کے لئے کیا ہے۔ تبھی شاید وہ کچھ لمحے لب بھینچ کر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

سوری اصل میں، میں آپ کو یہ بتانے کے لئے آئی تھی کہ باہر ایک صاحب آپ سے ملنے کے ہیں، شاید آپ کے کوئی آفس کولیگ ہوں، بہر حال جلدی سے باہر آ جایئے وہ اماں کے پاس بیٹھے

ں بات مکمل کرتے ہی صائمہ شیرازی کمرے سے باہر نکل گئی، تو نازیہ شیرازی مزید الجھ کر رہ گئی، ے ملنے یوں گھر پر کون آ سکتا ہے؟ مدت ہوئی، سلمان علوی کے بعد تو اس نے کسی سے ایسا کوئی ں رکھا تھا کہ کوئی یوں اس سے ملنے کے لئے گھر تک چلا آتا؟

ن کے ساتھ ساتھ، اس وقت اس کی ظاہری حالت بھی خاصی ابتر ہو رہی تھی، تبھی وہ جلدی سے چھینٹے ٹھنڈے پانی کے مار کر، ہاتھوں سے ہی بال اور لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے اپنے ے نکل کر باہر صحن میں چلی آئی، جہاں اماں اپنی مخصوص چارپائی پر بیٹھی، اس اجنبی شخص کے ساتھ مشغول تھیں، جو اس کی جانب پشت کیئے، کرسی پر بیٹھا، بڑے آرام سے چائے کی چسکیاں بھر رہا

السلام علیکم!''

.یہ شیرازی کے السلام علیکم کے جواب میں، جونہی اس اجنبی شخص نے گردن گھما کر ایک نظر اس کی ھادہ حیران رہ گئی۔

ارے......؟ آپ...... آپ یہاں تک کیسے آئے؟''

پے سامنے بیٹھے سنوان ہمدانی کو دیکھ کر وہ شاکڈ ہی تو رہ گئی تھی، جب اس نے چائے کا کپ اپنے ے چھوٹے سے ٹیبل پر رکھتے ہوئے، احترام سے کھڑے ہو کر بتایا۔

ایکسکیوزمی مس نازیہ! کہ میں نے آپ کو مطلع کیئے بغیر ناحق زحمت دی، اصل میں پچھلے دو تین پاند کی طبیعت بہت خراب ہے، نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بھی، وہ صرف آپ کو ہی یاد کر رہا ہے، ے سمجھانے اور بہلانے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن وہ میری ایک نہیں سن رہا، مسلسل آپ کے ہے، دراصل اتنے دنوں سے اس نے آپ کو پارک میں بھی نہیں دیکھا، تو اس کا من بہل نہیں رہا وڑی دیر کے لئے اس سے مل آئیں، شاید وہ آپ کو دیکھ کر سنبھل جائے۔''

ہلہ کے ایک ایک لفظ میں سچائی تھی، مگر نازیہ شیرازی نے آہستہ سے رخ پھیر لیا تھا۔

"سوچ کیا رہی ہو بیٹی! اس بچے کی زندگی کا سوال ہے' تھوڑی دیر کے لئے چلی جا۔"

اسے خاموش کھڑے دیکھ کر ماں نے اپنے لب کھولے تھے۔ تبھی وہ اضطراب مروڑتے ہوئے بولی۔

"اندھیرا ہو رہا ہے ماں' پھر میری طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے' کل چلی جاؤں گی۔"

"کل جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے' تم نے بھلا پہلے کسی کے لئے کچھ سوچا ہے' گی؟ میری بات نہ ماننے کی تو ویسے بھی تم نے قسم کھا رکھی ہے۔"

اس سے پہلے کہ سنوان ہمدانی کچھ کہتا' وہ غصے سے بول پڑیں۔ نتیجتاً نازیہ شیرازی ا قدم اس اجنبی شخص کے ساتھ چپ چاپ دہلیز کی طرف بڑھانے پڑے۔ غالباً نہیں وہ یقیناً ا کے گوش گزار کر چکا تھا۔ تبھی وہ اس کی ہمدردی میں' اس کے سامنے ہی اسے لتاڑنا شروع ہو گئیں نازیہ نے اپنے قدم گھر سے باہر نکالے تو سامنے ہی اس کی شاندار کرولا کھڑی نظر آ گئی' نے اس کے لئے فرنٹ ڈور کھولا' تو وہ خاموشی سے چپ چاپ اندر بیٹھ گئی۔

"سوری اگین' میری وجہ سے آپ کو ڈانٹ سننا پڑی' میرا یقین کیجئے' اگر چاند کی طبیعت ہوتی تو میں کبھی آپ کو یہ زحمت نہ دیتا۔"

اسے خاموشی سے باہر دیکھتے ہوئے پا کر ایک مرتبہ پھر اس نے وضاحت کی تھی' جواباً نگاہ اس کے متفکر چہرے پر ڈالتے ہوئے رسان سے بولی۔

"اٹس او کے' میں آپ کی وجہ سے ٹینشن میں نہیں ہوں' بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس

"کیا ہوا طبیعت کو؟ آپ پچھلے کچھ روز سے پارک بھی نہیں آ رہی ہیں۔"

"ہاں وہ بس آفس سے واپسی کے بعد کچھ تھکن ہی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ پھر کہیں ہی نہیں چاہتا' آپ بتائیے' میرے گھر تک رسائی کیسے ممکن ہوئی؟"

اپنی ذات کو کریدنا اسے کچھ خاص پسند نہیں تھا۔ تبھی فوراً بات بناتے ہوئے سوال داغا' تو سامنے وسیع روڈ پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"لاسٹ ٹائم جب آپ پارک سے اپنے گھر واپس لوٹی تھیں تو اتفاق سے میں نے آپ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا آج آپ کے محلے میں ہی اِدھر اُدھر سے پوچھتے ہو۔ دہلیز تک آ پہنچا' اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری اس جسارت کو اگنور کر دیں گی۔"

نازیہ شیرازی کا سپاٹ چہرہ اسے ندامت کے شدید احساس میں مبتلا کر رہا تھا' تبھی اس مرتبہ پھر معذرت سے کام لیا' تو آپ ہی آپ ایک دلفریب سی مسکراہٹ' نازیہ شیرازی کے لبوں پر بکھر کر رہ گئی۔

اسی اثناء میں سنوان ہمدانی کا گھر آ گیا' تو وہ جلدی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی

نکل آئی صرف ایک لمحے کے لئے اس کا دل نامحسوس اندیشوں کے خوف سے لرزا تھا' لیکن اگلے ہی پل اس نے سختی سے اپنے خوف پر قابو پا کر قدم سنوان ہمدانی کی ہمراہی میں گھر کی طرف بڑھا دیئے۔

گیٹ کے اس پار سرسبز وسیع لان میں لگے مختلف پھولوں کے پودے اور سایہ دار درخت' ایک عجیب سی فرحت کا احساس دلا رہے تھے۔ لان عبور کر کے وہ آگے طویل راہداری میں چلے آئے' جس کا اختتام ایک کشادہ لاؤنج تک پہنچ کر ہوا تھا۔ لاؤنج میں بچھا صاف ستھرا کارپٹ' اس بات کا ثبوت تھا یہ اس گھر میں گند پھیلانے والا کوئی نہیں تھا۔

سنوان کی ہمراہی میں باقدم چلتی وہ ایک ایک چیز کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی کہ اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر وہ خاصی بری طرح سے لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"سنبھل کر مس نازیہ!"

پلٹ کر اسے اپنے مضبوط ہاتھوں کا سہارا دیتے ہوئے سنوان ہمدانی نے اپنائیت سے کہا' تو وہ اس کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت سے فوراً نکلتے ہوئے' آہستہ سے اپنا سرخ چہرہ جھکا گئی۔ ایک لمحے میں دل کی دھڑکنیں خاصی بری طرح سے منتشر ہوئی تھیں۔

صد شکر کہ سامنے ہی چاند کا کمرہ تھا' وگرنہ ابھی نجانے اسے اور کتنی بار ایسی ٹھوکریں کا سامنا کرنا پڑتا۔

لاؤنج اور خوبصورت لان کی مانند چاند کا کمرہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ نازیہ شیرازی تو ایسے گھر محض خوابوں میں ہی دیکھ سکتی تھی۔ تبھی وہ بمشکل اپنا ازلی اعتماد بحال کرتے ہوئے چاند کے بیڈ کے قریب آئی تو وہ میڈیسن کے زیر اثر گہری نیند سویا ہوا تھا۔

خوبصورت سا معصوم چہرہ پچھلے کچھ ہی روز میں کس قدر مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اوپر سے اس کا وجود یوں جل رہا تھا گویا ابھی کسی تندور سے نکالا ہو۔ سوتے ہوئے بھی اس کی سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ تب جیسے ایک لمحے کے لئے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اور پھر اگلے ہی پل بے ساختگی کے عالم میں' اس نے آہستہ سے جھکتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی۔ دودھ یا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا اس کے ساتھ' مگر اس کے باوجود بچے کا حال دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

کتنی خودغرض تھی وہ کہ پچھلے کئی روز سے وہ اس معصوم سے بچے کی خبر ہی نہیں لے سکی تھی کہ جو اسے اپنی حقیقی ماں سمجھ کر' نجانے اس کے حوالے سے کتنی معصوم آرزوئیں' اپنے دل میں بسا بیٹھا تھا۔ ماں شاید سچ ہی کہتی تھی وہ واقعی خودغرض تھی۔ اپنی ذات سے ہٹ کر کسی اور کے لئے سوچنا۔ اس کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔ اس روز پارک میں کتنی معصومیت سے اس بچے نے اس سے پھر شام میں ملنے کا پرامس کیا تھا' مگر اس نے نہایت لاپروائی سے اس کے پیار کے ساتھ ساتھ اس سے کیئے پرامس کو بھی یکسر فراموش کر دیا

تھا۔

کس قدر ترسا ہوا تھا وہ ماں کی ممتا کو‘ مگر نازیہ شیرازی نے اس کی اس محرومی کو اپنا دردِ سر نہ سمجھ
ہوئے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

کسی بھی انسان کی انسانیت محض اس کے احساس سے عیاں ہوتی ہے‘ مگر مدت ہوئی وہ تو اپنا ہر ق
کا احساس گنوا بیٹھی تھی۔ شاید سلمان علوی جاتے ہوئے اس کے سارے محسوسات بھی اپنے ساتھ لے گ
تھا‘ تبھی تو وہ بے حس بنی بھٹکتی پھرتی تھی۔

”مما......مم......مما......“

نیم غنودگی میں بھی اس کے لب محض اسی لفظ کی گردان کر رہے تھے۔ تبھی نازیہ نے اپنائیت سے ا
ہاتھ اس کے سر کے گھنے بالوں میں پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ جانے یہ اس کی قربت کے لمس کا اثر تھا یا واقع
اس کی نیند پوری ہو چکی تھی کہ نازیہ کے سر میں ہاتھ پھیرتے ہی اس نے فوراً پلٹ سے اپنی آنکھیں کھو
دیں۔

”مما......مما آپ آ گئیں......آپ آ گئیں مما......“

بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے‘ وہ فوراً اٹھ کر اس سے لپٹ گیا‘ تو نازیہ نے بھی اسے اپ
مہربان پناہ میں لے کر اس کے معصوم سے چہرے پر اپنے پیار کی برسات کرنے میں قطعی دیر نہیں کی۔

”دیکھا پاپا! میں نے کہا تھا ناں میری مما ضرور آئے گی۔“

خوشی اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر تھی۔ تبھی اس نے فخریہ انداز میں سنوان کی طرف دیکھ
ہوئے کہا‘ تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

♦ ♦ ♦

نہ تھا مسئلہ کسی جیت کا‘ نہ ہی ہار کی کوئی بات تھی
میرے اعتبار کا معاملہ‘ تیرے اختیار کی بات تھی
کوئی جستجو بھی نہیں رہی‘ مگر اب سکون بھی نہیں رہا
وہ جو بے قراری دے گئی‘ وہی تو قرار کی بات تھی

ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے‘ شاہ ولا کے سبھی مکین استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے
اور وہ کپکپاتی پلکیں جھکائے اپنے کپ کے کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”وہ بات دراصل یہ ہے تایا ابو! کہ آپ لوگوں کی محبت دیکھتے ہوئے میں نے اب ہمیشہ کے لئے
پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

اپنے مطلب کی بات تک پہنچنے کے لئے اس نے پہلے تمہید باندھی تھی۔

”اب کے پاپا سے میری بات ہوئی تو میں یقینی طور پر انہیں بھی باقی کی زندگی پاکستان میں بسر

کرنے پر مجبور کروں گی‘ بہرحال ابھی جو بات میں آپ سے کرنا چاہ رہی ہوں وہ یہ ہے تایا ابو! کہ یہاں
مسلسل فراغت نے مجھے سخت بور کر دیا ہے۔ اسی لئے سوری۔ آپ کی پرمیشن کے بغیر دو تین روز پہلے میں
نے اپنی ایک دوست کی توسط سے یہاں کراچی کی ایک فرم میں جاب کے لئے اپلائی کر دیا‘ بائے چانس
میں وہاں سلیکٹ ہو گئی ہوں ابھی اگلے چند روز میں مجھے آفس جوائن کرنا ہے اسی لئے میں آپ کی
اجازت چاہ رہی ہوں۔“

مسلسل ذہنی اذیت سے چھٹکارہ پانے کا جو حل اس نے ابھی تین روز قبل نکالا تھا۔ اب وہ غبار بھی
اس نے ”شاہ ولا“ کے مکینوں کی سماعتوں کی نذر کر دیا تھا‘ نتیجتاً سبھی اپنی جگہ جیسے شاکڈ رہ گئے تھے۔

”میں جانتی ہوں تایا ابو‘ کہ میرے اس اقدام سے یقیناً آپ لوگوں کو شاک لگا ہے‘ مجھے یہ بھی
معلوم ہے کہ آج تک کبھی ”شاہ ولا“ کے کسی مرد نے پرائے لوگوں کی ملازمت نہیں کی ہے کجا کہ عورت‘ مگر
میں اس ذہنی ڈپریشن سے نکلنا چاہتی ہوں‘ فقط چند روز کے لئے ہی سہی‘ مگر دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنا چاہتی
ہوں‘ جب تک پاپا یہاں نہیں آ جاتے‘ میں کچھ اپنے بل بوتے پر کرنا چاہتی ہوں تایا ابو پلیز۔“

ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے سبھی لوگ‘ اب بھی حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر ثمرن
ازہان کو جیسے اب کسی کی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ اب بھی پلکیں جھکائے بیٹھی۔ شاہ نواز ازہان صاحب کے
فیصلے کی منتظر تھی۔ تبھی شاید ہلکا سا کھنکھار کر آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

”ثمی بیٹے! خدا جانتا ہے کہ تم ہمیں بے حد عزیز ہو‘ اس گھر میں ہماری محبتوں میں اگر کہیں تمہیں کوئی
کمی محسوس ہوئی ہے تو ہم سے کہو بیٹا ہم ہر طرح سے تمہاری شکایت دور کرنے کی کوشش کریں گے‘ مگر یوں
گھر سے باہر نکل کر سکون و راحت کے مواقع تلاشنا خود کو آزمائش میں ڈالنا‘ اسے ترک کر دو بیٹا! ہمیں اپنی
بچیوں کا گھر سے باہر نکل کر پرائے لوگوں کی ملازمت کرنا‘ بالکل بھی پسند نہیں۔“

شاہ نواز صاحب کے دھیمے مگر پُرمحبت لہجے پر ان کی وائف وجیہہ بیگم بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا
نہیں بھولی تھیں۔

”ثمی جان! اللہ گواہ ہے کہ میں نے کبھی تمہیں اپنی فائزہ سے الگ نہیں سمجھا‘ ایک عرصے سے میری
یہ خواہش تھی کہ تمہیں شیر دل بھائی سے کہہ کر گود لے لوں‘ مگر وہ نہیں مانے اب اللہ نے اگر تمہیں ہم سب
لوگوں کے درمیان بھیج دیا ہے تو ہمیں اپنا سمجھو بیٹا! جو تکلیف جو پریشانی ہے کھل کر ہم سے شیئر کرو جان
یہاں سب تمہارے اپنے ہیں۔“

”میں جانتی ہوں بڑی ماں۔“

وجیہہ بیگم کی محبت پر اس نے فوراً اپنی نم نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”میں نے آپ سب کی محبتوں پر کبھی شک نہیں کیا ہے‘ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو شاید میں دوبارہ لوٹ
کر کبھی پاکستان واپس نہیں آتی‘ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میرے دل میں آپ کے لئے‘ قدسیہ ممی کے لئے۔

آمنہ پھپھو کے لئے تایا ابو کے لئے۔ احتشام بھیا' مزنی' فائزہ' واصف' ثمر اور شہروز سب کے لئے پیار ہے' مگر آپ نہیں جانتیں بڑی ماں' کہ جب مزنی اور فائزہ یونیورسٹی چلی جاتی ہیں' ثمر' واصف و کالج چلے جاتے ہیں' احتشام بھیا اور شہروز آفس چلے جاتے ہیں' تو میں خود کو کتنا اکیلا محسوس کرتی ہوں دن گزارنا میرے لئے عذاب ہو جاتا ہے بڑی ماں' اسی لئے میں نے اپنی مصروفیت کا بہانہ ڈھونڈا ہے جاب میری خوشی ہے اور ماں' باپ ہمیشہ بچوں کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں' بھی اگر آپ لوگ ایسا نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے میں خود سر نہیں ہوں بڑی ماں۔''

نا چاہتے ہوئے بھی بالآخر اس کے لہجے میں نمی در آئی تھی' تبھی وجیہہ بیگم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا' تو شاہ نواز ازہان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔

''اوکے بیٹا! جیسی تمہاری مرضی۔ تمہاری خوشی میں ہی ہماری خوشی ہے۔''

محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے بخوشی اجازت دے ڈالی' تو پھر جیسے کسی کو بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ رہی۔ تاہم اس دوران مضطرب بیٹھے شہروز علوی نے ضرور ایک سلگتی نگاہ اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی۔ تن بدن میں یک لخت ہی گویا آگ لگ گئی تھی۔ تبھی سب لوگوں کو اس کے ساتھ ہنستا بولتا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور اگلے ہی پل کرسی کو پیچھے دھکیل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں مقید ہو گیا۔

اسے کہیں نہ کہیں تو بچھڑ ہی جانا تھا
یہ حادثہ بھی میری زندگی میں آنا تھا
وہ ایک شخص مجھے ساری عمر ترسے گا
نصیب اس کے کہ اس نے مجھے گنوانا تھا

''تم جاب کیوں کرنا چاہتی ہو؟''

وہ اپنے کمرے میں بک شیلف میں کتابیں ترتیب دے رہی تھی' جب وہ خطرناک تیور لئے اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ جواب میں وہ قدرے پلٹ کر سرسری اک نگاہ' اس کے بکھرے سراپے پر ڈال کر' بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

''میری مرضی' آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''ہاں ہے اعتراض پھر......؟''

وہ سلگ کر ہی تو رہ گیا تھا اس کے انداز پر' تبھی تیزی سے آگے بڑھ کر' اسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا تو وہ مزید بے نیازی سے کہہ اٹھی۔

''میں اپنا برا بھلا خود سمجھتی ہوں شہری' آپ کو میرے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''شٹ اپ۔ تم نے ابھی عقل میں ڈپلومہ نہیں لیا ہے کہ اپنا برا بھلا جان سکو' اپنے فیصلے خود کر سکو۔''

لگتی نگاہیں اس کے چہرے پر جما کر وہ قدرے درشتگی سے اسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ تو لمحے کے ھے سے قبل ثمرن ازہان کی آنکھیں' نمکین آنسوؤں سے بھر آئیں۔ تبھی اس نے سرعت سے اپنا قا۔

'اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لئے مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے شہروز' میں ہوں اپنا بھلا برا خود سوچ سمجھ سکتی ہوں۔''

س قدر بیگانگی سے اپنا آپ' چھڑاتے ہوئے اس نے قطعی سرد مہری کے انداز میں کہا تھا۔ جواب کے مقابل کھڑا۔ خوبرو سا شہروز علوی ٹکر ٹکر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

'ثما...... آخر ہوا کیا ہے تمہیں......؟ پلیز مجھے بتاؤ...... کیا پرابلم ہے......؟ کسی نے کچھ کہا ہے تم ؟''

ں کے لئے ثمرن کا یہ انداز بالکل نیا اور حیران کن تھا۔

'ایسی کوئی بات نہیں ہے شہروز' آپ پلیز جایئے یہاں سے۔''

ہ اس کے سامنے اپنا بھرم کھونا نہیں چاہتی تھی' تبھی لہجے میں بے رخی سموتے ہوئے بولی تو وہ جیسے رہ گیا۔

'کیوں کر رہی ہو تم یہ سب ثما؟ پلیز مجھے بتاؤ' تم جانتی ہو ناں کہ میں تمہاری ناراضگی افورڈ نہیں کر

مرن کے سخت اجنبی رویے نے اسے خاصا ہرٹ کیا تھا' تبھی وہ قدرے تھکے تھکے سے نڈھال بولا تو ثمرن کی مصنوعی مضبوطی و سرد مہری کا خول بھی جیسے چٹخ کر رہ گیا۔ کس قدر غور سے اس نے ی کے خوبصورت کلین شیوڈ چہرے کی طرف دیکھا تھا' جہاں اس وقت اداسی ہی اداسی بکھری رہی تھی۔ روشن سیاہ' ستارہ سی آنکھوں میں غم و حزن کا طوفان ہلکورے لے رہا تھا۔ عجیب شخص غرض بھی تھا اور اس سے محبت بھی کتنی شدید کرتا تھا۔

'شہری...... تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا میں تمہاری ناراضگی افورڈ کر سکتی ہوں' دیکھو جتنی میں تمہیں عزیز ی مجھے اتنے ہی عزیز ہو' ہم اچھے دوست ہیں شہری اور اچھے دوست ایک دوسرے سے ہرگز خفا یا ں ہوتے۔''

ں کے اداس چہرے پر نظریں جمائے وہ بے حد رسان سے بولی تھی شہروز زخمی نگاہوں سے لب ے دیکھنے لگا۔

'تو پھر تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو؟ تین چار روز سے بالکل الگ تھلگ رہنے لگی ہو۔ بات ہی نہیں کوئی۔''

پرسکون نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا' وہ قدرے نہ سمجھی کے انداز میں بولا تو ایک گہری مسکراہٹ

ثمرن ازہان کے گلابی لبوں کو چھوگئی۔ تبھی وہ قدرے فریش لہجے میں بولی۔

''مائی لارڈ۔ باوجود اس کے کہ ایسی کوئی بات نہیں' خاکسار دونوں کان پکڑ کر آپ سے
طلبگار ہے۔''

اس کے انداز میں قدرے شوخی تھی' تبھی وہ خاموش ہوئی تو اسے گھور کر دیکھتے ہوئے
دھیمے سے مسکرادیا۔

''چلو اب بتاؤ یہ اچانک جاب کرنے کا بھوت کیوں سوار ہوا تھا تمہارے ذہن پر۔''

وہ پھر سے اسی لائین پر آگیا تو ثمرن ازہان کے مسکراتے ہوئے لب پھر سے فوراً سمٹ گ

''آئی ایم سوری شہری۔ فی الحال تمہارے اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔''

''اوکے میں اس سلسلے میں تم سے زبردستی کر بھی نہیں سکتا' مجھے بس اتنا بتا دو کہ تمہیں یہ
کرنے کی ضرورت کیا ہے آخر؟''

''پتہ نہیں۔'' اس کے جھلائے ہوئے لہجے کے سوال پر ہلکا سا رخ پھیرتے بہت مدہم لہجے
نے کہا تھا۔ جواب میں وہ کچھ دیر خاموشی سے لب بھینچے' بہت غور سے اس کی لرزتی ہوئی پلکوں کو
پھر بناء کچھ کہے۔ تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے کی دہلیز سے باہر نکل گیا۔ شہروز علوی کے باہر نکلتے
ازہان کی آنکھوں میں کب سے رکے آنسوؤں کا سلسلہ گالوں پر رواں ہو گیا تھا۔ اب وہ اسے کیا بتا
کیوں جاب کرنا چاہتی ہے کیسے بتاتی کہ اب تمہارا سامنا کرتے ہی میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ت
دینے کا احساس جگر کاٹنے لگتا ہے اور میں اپنی آنکھوں کا یہ راز تم پر آشکار نہیں کرنا چاہتی۔ میں خود
چاہتی ہوں شہروز' تمہاری پرفریب محبت کے سحر سے خود کو نکالنا چاہتی ہوں' میں وہ نہیں کر سکتی' جو تم چا
مجھے یہ درد تنہا پینا ہے شہری' تم سے بچھڑ کر یونہی جینا ہے مجھے......

♦ ♦ ♦

میں سماعت کا کاسہ لئے شہر میں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مکاں در مکاں
وہ صدا جو اچانک کہیں کھو گئی
راستے میں کہیں مجھ سے گم ہو گئی
تھک گئی چھپ گئی یا کہیں سو گئی
راستہ جیسے دشت بلا ہو گیا
چند دنوں میں نجانے یہ کیا ہو گیا
شہر کا شہر چپ کی ردا اوڑھ کر
سو گیا دفعتاً مجھ سے منہ موڑ کر

میں سماعت کا کاسہ لئے شہر میں
ڈھونڈتا پھر رہا ہوں مکاں در مکاں
کوئی آواز دے کر بلائے مجھے
وہ کہاں ہے خدارا بتائے مجھے

''پاپا' پاپا پلیز مجھے کالج جانے دیں' میرے ایگزیم سر پر ہیں پاپا! میں فیل ہو جاؤں گی' میرا پورا سال ضائع ہو جائے گا' پلیز پاپا!''

پوری رات وہ سسک سسک کر روتی رہی تھی اور اب صبح ناشتے کی ٹیبل پر وہ ایک مرتبہ پھر اپنے باپ کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔ یہ وہ باپ تھا جو اس کی مما کی زندگی میں اس کے ناز اٹھاتے نہیں تھکتا تھا۔ لیکن اب سوتیلی ماں کے قابو میں آ کر جیسے خود بھی سوتیلا ہو کر رہ گیا تھا۔

کتنی دیر سے وہ ان کے سامنے گڑگڑا کر التجائیں کر رہی تھی' لیکن وہ شان بے نیازی سے ناشتے میں مشغول رہے تھے۔ اب ناشتے کے بعد بھی انہوں نے نظر اٹھا کر سرسری سے انداز میں اس کے ستے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا' پھر فیصلہ کن نگاہوں سے صبیحہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی' جواب خود بھی ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

''کیا کہتی ہو بیگم؟ پھر سے کالج جانے کی اجازت دے دوں اسے۔''

اخبار اٹھا کر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا' جب صبیحہ بیگم نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے بولیں۔

''بھئی یہ آپ دونوں باپ بیٹی کا معاملہ ہے' مجھے درمیان میں مت گھسیٹیں' ویسے بھی میرا کام تو آپ کو صرف انفارم کرنا تھا۔ اب نفع و نقصان کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے' کل کلاں کو کچھ الٹا سیدھا ہو گیا تو مجھے دوش مت دیجئے گا۔''

وہ چونکہ پہلے ہی اخبار چاٹ چکی تھیں لہٰذا اب پوری رغبت کے ساتھ دیسی گھی کے پراٹھوں سے انصاف کر رہی تھیں' ساتھ میں اپنی لخت جگر پنکی کی ناز برداریاں بھی اٹھا رہی تھیں۔ تبھی سنعیہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔

''ماں...... ماں پلیز...... مجھے یہ امتحان دے لینے دیں' پھر میں آپ سے کوئی فرمائش نہیں کروں گی' پلیز مجھے کالج جانے دیں ماں' پلیز......''

جب اس نے دیکھا کہ باپ اس ہوشیار عورت کی مٹھی میں دبا ہے' تو وہ اسی کے آگے سراپا التجاء بن گئی۔ تبھی ایک بڑی دلفریب سی فخریہ مسکراہٹ صبیحہ بیگم کے ہونٹوں پر ابھری اور وہ اس پر اپنا احسان دلاتے ہوئے بولیں۔

''اچھا...... اچھا...... زیادہ مظلوم بننے کی ضرورت نہیں ہے' جلد از جلد یہ امتحان کلیئر کرو' پھر آگے

ایڈمیشن لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔"

"جی۔"

آنسوؤں سے لبالب بھری نگاہیں جھکا کر اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا' پھر اپنے کمرے میں آکر اپنی مما کی تصویر سے لپٹتے ہوئے بلک بلک کر رو پڑی۔

آج اسے کالج سے غیر حاضر ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔

سخت پڑھائی کے دن تھے' پھر وہ اپنی جماعت کی نہایت ذہین سٹوڈنٹ تھی' لہٰذا سبھی استاذہ اس کی مسلسل غیر حاضری کو لے کر خاصے متفکر تھے۔ استاذہ کے ساتھ ساتھ اس کی قریبی فرینڈز بھی بہت زیاد پریشان تھیں' کیونکہ سنعیہ نے کبھی اتنے دنوں تک غیر اعلانیہ چھٹی نہیں کی تھی۔ سب نے اپنے اپنے طور پر اس سے رابطے کی کوشش کی تھی' مگر صبیحہ بیگم اور پنکی نے اس کی کیسی دوست کا اس سے رابطہ نہیں ہونے دیا تھا۔

گھر میں دو دو گاڑیاں ہوتے ہوئے بھی وہ روزانہ اکیلی پیدل کالج آیا جایا کرتی تھی۔ سر سے ممتا کا سایہ کیا اٹھا' زندگی ایک دم سے اس کے لئے کسی دشت کی مانند ہو کر رہ گئی تھی' جس میں آبلہ پا چلنا' اب جیسے اس کے نصیب کا حصہ بن چکا تھا۔

اس روز بھی وہ جلدی جلدی تیار ہو کر کالج کے لئے نکلی تو اس کی راہ میں پچھلے ایک ہفتے سے شدید بے قرار عمر عباس نقوی کی خوبصورت مقناطیسی نگاہیں جیسے ایک دم سے جگمگا اٹھیں۔ جاوید کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی۔ تبھی وہ بھرپور جوش سے اس کے مضبوط کندھوں کو جھنجھوڑتے ہوئے چلا کر بولا۔

"عمر..... عمر دیکھ یار' وہ آرہی ہے۔ تو نے سچ کہا تھا کہ وہ ضرور آئے گی' دیکھ وہ سیدھی اس طرف ہی آرہی ہے' جا یار آج کہہ دے اپنے دل کی ہر ایک بات اسے' پھر جانے زندگی میں یہ موقع ملے نہ ملے' تین ماہ بہت ہوتے ہیں یار' آج کھول دے خاموشی کا یہ قفل اور جا کر سنا دے اسے اپنے دل کی ہر حکایت جا یار تجھے ہماری دوستی کا واسطہ۔ آج اس پر ہر بھید کھول کر رکھ دے۔"

اپنا ہاتھ اس کے مضبوط کندھے پر رکھے وہ اسے کنوینس کر رہا تھا' جب کہ عمر ہر بات سے بے خبر چپ چاپ کھڑا اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے پچھلے ایک ہفتے کی پیاس بجھا رہا تھا۔

"ایکسکیوز می مس!"

جونہی وہ تیز تیز چلی ان کے قریب سے گزرنے لگی' بلا آخر جاوید نے ہمت کے چپو سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے پکار لیا۔ جواب میں وہ ازحد سہم کر ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"سوری مس! سرِ راہ آپ کو یوں پکارنے پر معذرت چاہتا ہوں' مگر وہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جو میرا دوست ہے ناں عمر۔ یہ آپ سے بہت شدید قسم کی محبت کرتا ہے' اس کا حلیہ دیکھ لیں پچھلے ایک ہفتے سے یہ آپ کی راہ میں کھڑا دیوانوں کی طرح آپ کے آنے کا انتظار کر رہا ہے' آپ کے معاملے میں یہ کسی

بات سننے کو تیار نہیں ہے' یہاں تک کہ میری بھی نہیں۔"

ایک ہی سانس میں تمام احوال اس کے گوش گزار کرتے ہوئے وہ سانس لینے کو رکا' تو سنعیہ نے زیادہ حیرانگی کے عالم میں اس شخص کے پیچھے کھڑے اس نوجوان کا سرسری جائزہ لیا تھا' جواب بھی گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا' عجیب پیاسی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تب یک لمحے کے لئے اس کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوئی تھیں۔

بڑی ہوئی شیو' ملگجا سا لباس' تھکی تھکی سی آنکھوں میں پڑے رتجگوں کے سرخ ڈورے' خشک ہونٹ ایک ناکام عاشق دکھائی دے رہا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ اس درجہ پزل ہوئی تھی' کچھ کہنے کی کوشش میں وا ہوتے لب' محض تھرتھرا کر رہ

تبھی وہ ایک دم سے چونکی تھی اردگرد سے گزرتی گاڑیوں کے ہارن نے اسے حقیقت کی تلخ ترین

ا پٹخا تھا۔

سوری مسٹر! میں پیار محبت جیسی فضول خرافات میں الجھنے والی لڑکی نہیں ہوں۔ لہٰذا برائے مہربانی راخیال اپنے دل سے نکال دیجئے۔ ویسے بھی آپ کو عشق بگھارنے کے لئے بہت سی لڑکیاں مل ا۔ لیکن میرے گھر میں سے کسی نے اگر مجھے یہاں کھڑا دیکھ لیا۔ تو میں زندگی بھر کے لئے باہر کی نے سے محروم ہو جاؤں گی' سمجھے آپ۔"

ماصی سرعت سے اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ایک سیکنڈ کے لئے بھی نہیں ٹھہری تھی۔ نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنا چاہا تھا' مگر عمر نے فوراً اس کا ہاتھ تھام کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک

"نہیں یار مجھے اس کی رسوائی گوارہ نہیں ہے۔"

"لیکن جب تک اسے تمام حقیقت سے آگاہی نہیں ہوگی۔ وہ تم سے محبت کیسے کرے گی عمر۔"

جاوید قدرے جھنجھلاتے ہوئے گاڑی میں آبیٹھا تھا۔ تب وہ خود بھی سست روی سے اپنی سائیڈ کا دل کر اس کے برابر آبیٹھا۔

"تم زبردستی اس کے دل میں میری محبت ڈالو گے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم جسے چاہیں۔ اس کے دل بت' اپنی طلب زبردستی ڈال دیں' محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے یار' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس محبت ئی تڑپ نہ ہوتی۔ تین سال' تین ماہ' تین ہفتے تو کیا' میں تین صدیوں تک یونہی اس کے راستے اس کی راہ دیکھتا رہوں گا' چاہے پتھر ہو جاؤں۔ وہ جب تک میری طرف محبت کی نگاہ سے نہیں مں پیچھے نہیں ہٹوں گا جاوید۔"

یہ گمبیر انداز تھا اس کا' مگر اس سے پہلے کہ جاوید اسے کچھ کہتا' وہ زن سے گاڑی سٹارٹ

کر کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

ادھر سنعیہ جب کالج میں داخل ہوئی تو اس کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں اتز کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ انہیں جواب دے آئی تھی۔ جانے وہ کون لوگ تھے؟ جانے اس ''داستار سے ان کا مقصد کیا تھا؟

''یا اللہ مجھ پر اپنا رحم کر' مجھے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے' اے اللہ میرے ایمان وسا حفاظت فرما۔''

وہیں اپنی کلاس روم میں بیٹھ کر پلکیں موندتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خدا سے کئی د ایک ساتھ مانگ لی تھیں۔

اسمبلی کے بعد کلاس لگی تو اس کی عزیز از جان دوست ماریہ' اسے کلاس میں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک

''سونو' آر یو اوکے؟ اس طرح سے کلاس میں کیوں بیٹھی ہو تم' باہر پریڈ ہو رہا ہے ہمارا۔''

''مجھے یہ پریڈ اٹینڈ نہیں کرنا مان۔''

''کیوں؟ آئی مین تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ واقعی اس کے لئے پریشان ہو گئی تھی۔

''نہیں میرے سر میں بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں بخار بھی رہا۔ اسی لئے کالج نہیں تھی۔''

اپنی غیر حاضری کا یہی معقول بہانہ اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ لہٰذا اس نے ماریہ کے گوش گزارد اثناء میں ان کی تیسری فرینڈ ثنا بھی کلاس روم میں چلی آئی۔

''خوش آمدید محترمہ سنعیہ غیاث صاحبہ۔ فرمایئے آج کالج کیسے آنا ہوا آپ کا۔''

وہ اس کی طویل غیر حاضری پہ خاصی جلی بیٹھی تھی۔ تبھی طنزیہ لہجے میں بولی تو سنعیہ اس کی طرف کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''تم دونوں فی الحال میڈم شازیہ کا پریڈ اٹینڈ کر لو۔ بعد میں ساری بات میں تمہیں بتاتی ہوں اسے خود بھی دل کی ہر بات ان دونوں کو بتائے بغیر چین کہاں ملتا تھا۔ لہٰذا بڑے آرام سے چھینکتے ہوئے اس نے کہا تو ماریہ اور ثناء دونوں اسے مشکوک نگاہوں سے گھورتی ہوئیں' کلاس روم۔ نکل گئیں۔

دوسرا پریڈ میڈم صائقہ کا تھا لیکن وہ آج غیر حاضر تھیں' لہٰذا وہ تینوں کلاس روم سے نکل کر سر میں پھیلی ہلکی ہلکی دھوپ میں آ بیٹھیں۔

''ہاں اب بول لڑکی پچھلے ایک ہفتے سے تو نے اپنے درشن کیوں نہیں کروائے اور ہمارے فون کرنے پر ہم سے بات کرنا کیوں گوارہ نہیں کی۔''

ثناء نے اس کے مقابل بیٹھتے ہی سوال داغ دیا تھا۔ جواب میں اس نے اپنے ساتھ پیش آ۔

وادادا انہیں کہہ سنائی۔

''او تمہاری سوتیلی ماں تو مجھے امریکی وزیر خارجہ کی خاص سہیلی لگتی ہیں' کیا شاطر دماغ پایا ہے محترمہ یسے کچھ نہ کچھ قصور تو تمہارا بھی ہے' تم انہیں منہ توڑ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ تمہاری یہ خاموشی ہی للم کرنے کے لئے مزید شہہ دیتی ہے' تمہاری جگہ میں ہوتی تو دیکھتی کہ وہ کیسے مجھ پر ظلم کرتی ہیں۔''

ثناء ہمیشہ سے مزاج کی تیز رہی تھی۔ لہٰذا اس وقت بھی سنعیہ کی روداد پر ایموشنل ہوتے ہوئے سنعیہ نے آہستہ سے سر اٹھاتے ہوئے ایک گہری سانس خنک ہوا کے سپرد کر دی۔

''مجھے اس گھر میں رہنا ہے ثانی' اگر میں نے ذرا سا احتجاج بھی کیا' تو اماں میرا جینا دوبھر کر دے

''اچھا اور ابھی جو زندگی تم جی رہی ہو وہ تو جیسے بہت اچھی ہے ناں۔''

''جیسی بھی ہے' میں در در کے دھکے نہیں کھا رہی ہوں۔ ماں کا بس چلے تو ایک لمحے میں مجھے کسی بھی غیرے کے ساتھ رخصت کر دیں۔ پھر میرے خوابوں کا کیا ہوگا؟ میں اپنی مما کی خواہشوں کو کیسے تک پہنچاؤں گی۔''

حسب معمول اپنی مما کے ذکر پر اس کی خوبصورت آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں۔ تبھی زید خاموش نہ رہ سکی۔

''تمہاری زبان کو بھی چین نہیں ہے ثانی' جب دیکھو فضول تپی رہتی ہو تم' رلا دیا ناں سونو کو۔'' وہ سنعیہ سے بے حد اٹیچ تھی۔ لہٰذا اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکی۔

''پلیز مان' ثناء کو کچھ مت کہو' مما کے ذکر پر یونہی آنکھیں بھر آتی ہیں میری' خیر تم لوگوں کو ایک ٹک نیوز سناؤں؟''

قدرے اشتیاق سے ان کی دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔ جب دونوں راثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتہ ہے آج جب میں گھر سے کالج آ رہی تھی تو کالج گیٹ کے پاس' پہلے سے دو صاحب کھڑے راہ دیکھ رہے تھے۔ اپنے لباس اور گفتگو وغیرہ سے تو کسی امیر گھرانے سے منسلک لگ رہے تھے' مگر ت انہوں نے کہی اسے سن کر تو میرا دل اتھل پتھل ہو گیا۔''

سنعیہ نے آگے کا سارا ماجرا بھی من و عن ان کے گوش گزار کر دیا تھا۔ تبھی ثناء ٹھنڈی آہ بھرتے ے مسکرا کر بولی۔

''ہائے او میر یار با۔ اس الٹہر منیار پر بھی کسی اچھے سے لڑکے کو عاشق کر دے' آخر یہ محبتوں کی تمام یاں بے قدروں سے ہی کیوں وابستہ ہوتی ہیں؟''

اس کی بات پر سنعیہ اور ماریہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا تھا۔ پھر سنعیہ نے ہی ایک زبردست دھموکا

اس کی پشت پر رسید کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

''یار مجھے تو بہت زبردست قسم کی بھوک لگ رہی ہے' ناشتہ بھی نہیں کیا' لہٰذا میرے ساتھ چلو۔''

''چلو پورے ایک ہفتے بعد مل کر کھانے کا موقع میسر آیا ہے۔ ہم انکار تھوڑی کریں گے اب کے ماریہ نے لب کشائی کی تھی۔ لہٰذا وہ تینوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں کینٹین کی طرف بڑھ گئیں۔

♦ ♦ ♦

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے۔ سبک روی سے چلتی ٹھنڈی ہوا اُ ایک عجیب سی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ آج صبح سے ہی اس کی آنکھیں بات بے بات بھر رہ جانے کیوں ایک دم سے بہت اداس ہو رہا تھا۔

تب مغرب کے اس پار ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں کو چپکے سے الوداع کہتے ہو تھی۔

''آئی مس یو پاپا! مس یو وری مچ۔''

اسے خبر بھی نہ ہوئی اور ایک اداس سا آنسو اس کی آنکھ سے پھسل کر نیچے کی طرف لڑھکا بے بس ہوتے ہوئے وہ پھر سے اپنی پرسنل ڈائری کھول بیٹھی تھی۔

''پاپا! یہاں سب کچھ بہت اچھا ہے۔ مہکتی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں' گرجتے برستے بادل بہاریں' خشک پتے گراتی خزائیں' خوشبوئیں بکھیرتے۔ سب بہت اچھا ہے پاپا' آپ کا نو بہت پیارہ ہے' لیکن...... کاش آپ یہاں آ کر دیکھ سکتے' پاپا کہ آپ کے بغیر ''نور ہاؤس'' میں ٹھہر گئی ہے' یوں لگتا ہے جیسے اس حویلی کے مکین زبردستی جینے پر مجبور ہوں۔ دادی ماں' حائقہ سب آپ کے بغیر خوش رہنا بھول گئے ہیں پاپا' کیوں کیا آپ نے ایسا......؟ کیوں محض ا لئے ان سب کے دلوں میں وہ ناسور بھر دیا' جو بائیس سال گزر جانے کے باوجود بھی بھرنے کا نا رہا' آپ نے ان سب سے زندگی کا احساس چھین لیا ہے پاپا' ان سب کو تاعمر سلگنے پر مجبور کر د نے! میں خود میں ان سب کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کا حوصلہ نہیں پا رہی ہوں پاپا' میرے اع تھکنے لگے ہیں۔ یہاں کی ایک ایک چیز' مجھ سے آپ کی باتیں کرتی ہے۔ آپ کے ہاتھوں سے پودے مجھ سے آپ کا احوال دریافت کرتے ہیں۔ مسلسل جھوٹ بول بول کر میری روح پر بار لگا ہے۔ آئی مس یو پاپا' مس یو وری مچ۔''

کپکپاتے ہاتھوں سے قلم چھوٹ کر دور جا گرا' تو وہ ڈائری پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو

''سبرینہ...... آر یو او کے بیٹا!''

حائقہ پھپھو جانے کس لمحے وہاں چلی آئی تھیں۔ تبھی وہ سرعت سے اپنی آنکھیں رگڑ کر جلدی سے ڈائری بند کرتے ہوئے بولی۔

''جی ہاں پھپھو' آپ بتایئے کوئی کام تھا؟''

''نہیں...... تم روئی ہو ناں؟''

آنسوؤں سے بھیگی پلکیں ان سے ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں' تبھی وہ مشکوک انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں تو سبرینہ نے بے ساختہ اپنی نگاہ چرالی۔

''نہیں پھپھو...... وہ...... اصل میں پاپا کی بہت یاد آ رہی تھی' تو یونہی آنکھیں بھر آئیں۔''

''ارے ہاں' میں تو بھول ہی گئی تم ابھی احمد سے میری بات کراؤ' آج اسے میری ڈانٹ سے کوئی نہیں بچا سکتا' سمجھتا کیا ہے وہ اپنے آپ کو؟ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ ساتھ' وہ اب اپنی اولاد کا دل بھی دکھا رہا ہے' سگے بھانجے کی شادی میں شرکت کے لئے نخرے دکھا رہا ہے' ابھی تک ہماری طرف سے دل صاف نہیں ہوا اس کا۔''

حائقہ پھپھو جو بولنا شروع ہوئیں تو پھر رکی نہیں' جب کہ وہ پہلے سے زیادہ ہرٹ ہو کر رہ گئی تھی۔

''پاپا کا موبائل' مسلسل آف ہے پھپھو۔''

فوری طور پر یہی بہانہ اس کے ذہن میں آیا تھا۔ جواب میں حائقہ بیگم کے چہرے پر مایوسی بکھر گئی۔

''اوکے تم دل چھوٹا مت کرو' ہم سب ہیں ناں یہاں تمہارے پاس' اس سے تو میں دو دو ہاتھ کر کے ہی رہوں گی' آخر کب تک موبائل آف رکھے گا اپنا' وہ کیا کہتے ہیں سیانے؟ کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی' جانتی ہوں اسے۔ اب ہمت نہیں ہو رہی ہے ناں بات کرنے کی۔ اسی لئے چھپتا پھر رہا ہے' بہرحال تم نیچے چلو' میں ازہان سے کہتی ہوں تمہیں مارکیٹ لے چلے' تھوڑا دل بھی بہل جائے گا اور حمدان کی شادی کے لئے اپنی مناسب تیاری بھی کر لینا۔''

پتہ نہیں وہ واقعی بولنے کی شوقین تھیں یا محض اس کا دل بہلانا چاہ رہی تھیں۔ تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ سبرینہ کا دل بہل گیا تھا۔ ازہان کے تذکرے پر ایک دم سے دھڑکنوں کا شور اس کی سماعتوں میں گونجا تھا۔ حائقہ پھپھو کے ساتھ جس وقت وہ نیچے ہال میں آئی' ازہان صوفے پر بیٹھا اپنے شوز کے تسمے باندھ رہا تھا۔

''ازہان' سبرینہ کو کچھ شاپنگ کرنی ہے' تم مارکیٹ تو جا ہی رہے ہو' اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

حائقہ بیگم کے حکم پر ازہان نے محض اک سرسری سی نگاہ اٹھا کر ان کے پہلو میں کھڑی سبرینہ احمد کو دیکھا پھر دوبارہ سے اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے بولا۔

''سوری مما......! میں اس وقت ذرنشاء کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں' انہیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیجئے۔''

خشک لہجے میں اپنی بات کہنے کے بعد وہ وہاں مزید ٹھہرا نہیں تھا' جب کہ حائقہ پھوپھو مارے شرمندگی کے بغلیں جھانکنے پر مجبور ہوگئی تھیں۔

''ڈونٹ وری پھپھو' خود میرا بھی دل اس وقت کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا ہے' مین اوپر جا کر آرام کر لیتی ہوں۔''

دکھتے دل پر ضبط کے پہرے لگائے' وہ فوراً اوپر اپنے کمرے کی طرف آ گئی تھی۔

''یا خدا...... کتنے عجیب لوگوں کا مرکز ہے یہ ''نور ہاؤس'' میں کیسے یہاں اپنا مقام بنا پاؤں گی پتہ نہیں یہ لوگ میری حقیقت جاننے کے بعد مجھے یہاں جگہ بھی دیں گے یا نہیں۔''

بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے اس نے قطعی پریشانی کے عالم میں سوچا تھا اور پھر انہی تانوں بانوں میں الجھتی نجانے وہ رات کے کس پہر گہری نیند میں چلی گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

''مما...... اس روز آپ نے پکا پرامس کیا تھا کہ آپ شام میں ضرور آئیں گی' میں نے آپ کا بہت انتظار کیا' مگر آپ نہیں آئیں' کیوں مما۔''

اس کی گود میں بیٹھا' وہ اب باقاعدہ حساب کتاب لے رہا تھا۔ تبھی وہ آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''آئی تو تھی بیٹے' لیکن آپ اس وقت سو رہے تھے' لہٰذا میں آپ کو ڈسٹرب کیئے بغیر واپس چلی گئی۔''

فوری طور پر یہی بہانہ اس کے ذہن میں آیا تھا سو اس نے بنا ڈالا۔ جواب میں وہ قدرے افسردگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوہ...... اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا' لیکن آپ مجھے جگا دیتی ناں مما' میں نے آپ کے لئے اتنی ڈھیر ساری چاکلیٹس اور آئسکریم خریدی تھی۔''

باتوں میں بھلا بچوں سے کوئی جیت سکا ہے' لہٰذا وہ بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے محض دھیمے سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''پتہ ہے مما! میں نے اپنے سارے دوستوں کو آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ اور وہ عدنان ہے ناں' میرا کلاس فیلو' میں نے اس سے کہا کہ' میری مما بہت خوبصورت ہیں' لیکن وہ کہتا ہے کہ اس کی مما زیادہ خوبصورت ہیں' میرا اسکول میں اس کے ساتھ جھگڑا بھی ہو گیا تھا' جب اس نے کہا کہ اس کی مما آپ سے زیادہ خوبصورت ہے' تو میں نے اسے بہت زور سے دھکا دے دیا' اس کے سامنے والے دو دانت ٹوٹ گئے' ہا...... ہا...... ہا......''

وہ اپنے گزشتہ دنوں کا کارنامہ سنا کر خوش ہو رہا تھا جب وہ نرمی سے اسے سرزش کرتے ہوئے

بولی۔

''بری بات بیٹا! لڑنا جھگڑنا تو شیطانی بچوں کا کام ہے' لیکن آپ تو بہت اچھے بچے ہو' پھر کیوں اپنے دوست کو تکلیف پہنچائی آپ نے؟''

''وہ اپنی مما کو آپ سے زیادہ خوبصورت کہہ رہا تھا مما! اور پھر یہ دیکھئے' اس نے مجھے بھی تو چوٹ پہنچائی ہے۔''

اپنی پیشانی سے بال ہٹا کر اس نے نازیہ کو اپنا زخم دکھایا' تو بے ساختہ اس نے بچے کی روشن پیشانی چوم لی۔

''اوہ یہ تو واقعی بہت بری بات ہے' لیکن مائیں تو سب کی پیاری ہوتی ہیں بیٹے! جس طرح آپ کو اپنی مما سب سے زیادہ پیاری لگتی ہے اسی طرح آپ کے دوستوں کو بھی اپنی اپنی مما سب سے زیادہ اچھی لگتی ہیں نہیں سمجھے آپ......؟؟؟''

''سوری مما! آئندہ میں کسی کی مما کو برا نہیں کہوں گا۔''

ایک لمحے میں وہ اس کی بات سمجھ کر فوراً ایکسکیوز کر گیا تھا' تبھی وہ اسے مزید پیار کرتے ہوئے بولی۔

''ماں کا لفظ ہی دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے بیٹے! آپ یہ دیکھیں کہ دنیا میں قدرتی اور ظاہری طور پر ہمارے پاکستان سے بڑھ کر کتنے بے شمار ملک ہیں' ہم بے شک ان ممالک کی ترقی اور خوبصورتی کو سراہتے ہیں۔ لیکن دلی طور پر پوری سچائی کے ساتھ یہی کہتے ہیں کہ ہمارا پاکستان سب سے زیادہ خوبصورت ہے' کیونکہ یہ ہمارا اپنا دیس ہماری اپنی دھرتی ماں ہے اسی کا حوالہ ہماری فخریہ پہچان ہے' ہے ناں۔''

''جی مما!'' بچے نے فوراً اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔ جب کہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھا سنوان ہمدانی' خاص دلچسپی نگاہوں سے اپنے اکلوتے لخت جگر کو بہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''مما اب تو آپ واپس نہیں جائیں گی ناں۔ اب تو ہمیشہ یہیں اس گھر میں میرے ساتھ رہیں گی ناں۔''

اسے چپکے سے وال کلاک کی جانب دیکھتے پا کر فوراً اس نے سوال کر دیا تھا جواب میں وہ قدرے لڑبڑا کر الجھی ہوئی نگاہوں سے سنوان ہمدانی کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جس نے فوراً سے پیشتر اپنی نگاہیں پھیر لی تھیں۔

''اوکے آپ نہیں چاہو گے تو میں نہیں جاؤں گی' لیکن دیکھو ناں بیٹے! جس طرح آپ کو اپنی مما سے پیار ہے بالکل اسی طرح میں بھی اپنی مما سے بہت پیار کرتی ہوں' ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' بہت بیمار رہتی ہیں وہ اب آپ ہی بتاؤ۔ کیا مجھے ان کی دیکھ بھال نہیں کرنی چاہیئے' فرض کرو اگر میری طبیعت

بہت زیادہ خراب ہو تو کیا آپ میرے پاس نہیں رہو گے' کیا میری دیکھ بھال نہیں کرو گے آپ۔''

ہر مشکل کا حل نکالنا اسے بخوبی آتا تھا' لہٰذا سنوان ہمدانی کے بے بسی سے نگاہیں چرانے پر بہلانے کے لئے اس نے ایک مرتبہ پھر عذر تراشا تھا۔ جواب میں بچے کی آنکھوں میں مچلتی بے قرار داستان وہ بخوبی پڑھ سکتی تھی۔

''مما! آپ کی مما کب ٹھیک ہوں گی؟'' بہت معصوم سا سوال تھا اس کا تبھی وہ اس کے گال سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''یہ تو اللہ کو معلوم ہے بیٹے! وہی صحت اور بیماری دینے والا ہے۔''

''مما! اگر میں اللہ سے دعا کروں کہ وہ آپ کی مما کو اچھا کر دے تو کیا اللہ میری دعا سے آپ کو ٹھیک کر دے گا؟''

''ہاں بیٹے! اللہ بچوں کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔''

''پھر آپ کی مما ٹھیک ہو گئیں تو آپ ہمیشہ کے لئے آ جائیں گی ناں؟''

ایک مرتبہ پھر اس کے معصوم سوال نے نازیہ شیرازی کو نگاہیں چرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''مون ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹا! چلو سو جاؤ آرام سے۔''

نازیہ شیرازی کو پھر سے مشکل میں گھرا دیکھ کر سنوان تیزی سے اس کی مدد کے لئے آگے بڑھا مگر بچہ اس کی بات ماننے کی بجائے نازیہ سے مزید چمٹ کر رہ گیا۔

''نہیں میں سوؤں گا تو مما پھر سے چلی جائیں گی۔''

''نہیں جائیں گی' یہیں تمہارے پاس رہیں گی' صبح اٹھ کر اطمینان کر لینا۔''

''نہیں اس روز بھی میں سویا ہوا تھا تو مما چلی گئی تھیں۔''

بچہ کسی طور پر نازیہ شیرازی سے الگ ہونے پر تیار نہیں تھا' تبھی وہ اپنائیت سے اس کے گال چو ہوئے بولی۔

''کیا آپ اپنی مما کی بات بھی نہیں مانو گے' چلو شاباش سو جاؤ۔''

''او کے لیکن میں آپ کی گود میں سوؤں گا۔''

بے اعتباری سی بے اعتباری تھی' مگر نازیہ شیرازی اس بار اسے ہرٹ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا آ سے اس کی شرط مان لی۔

شب کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے جب وہ بچے کو سلا کر سنوان کی ہمراہی میں اپنے گھر واپس تھی۔ مارے تھکن کے پورا جسم ٹوٹ رہا تھا' مگر اس کے باوجود وہ ماں اور بابا کے پاس بیٹھی' ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے اسے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹنا نصیب ہوا تھا۔

آج پہلی بار وہ سلمان علوی کی بجائے اس چھوٹے سے معصوم بچے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جو نے کیوں اسے اپنی سگی ماں سمجھتے ہوئے اس سے اپنی ڈھیر ساری امیدیں وابستہ کر بیٹھا تھا۔ آپ ہی پ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی امڈ آیا۔

''میں تمہیں بھول کیوں نہیں جاتی سلمان' کیوں درد بن کر میری رگ رگ میں سرائیت کر گئے ہو ؟''

''کیوں تم سے ہٹ کر کسی اور کے متعلق نہیں سوچ پاتی میں' مجھے میرا اختیار واپس لوٹا دو سلمان' یز۔''

دل ہی دل میں سلمان علوی سے مخاطب ہوتے ہوئے' وہ بے آواز سسک پڑی تھی۔

♦ ♦ ♦

''شیراز انڈسٹریز میں یہ اس کا پہلا دن تھا اور پہلے ہی دن وہ خاصی ہٹ ہو گئی تھی۔ شہروز کو گہری رے جھنجوڑ کر جگانا' زبردستی تیار کرنا بہت مشکل مرحلہ تھا' مگر اس سے بھی زیادہ مشکل مرحلہ اسے اب در ن آیا تھا۔''

اس کمپنی میں جاب اسے مزنی کی ایک دوست عائشہ کے توسط سے ملی تھی۔ لہٰذا آفس میں پہنچنے کے ر وہ سب سے پہلے عائشہ سے ہی ملی تھی۔ دعا سلام اور آفس سے متعلق دو چار باتوں کے بعد وہ ابھی اس ے مزید کچھ جاننا ہی چاہتی تھی' جب اچانک اسے باس نے اپنے کیبن میں طلب کر لیا۔ زندگی میں پہلی بار قدرے نروس ہو رہی تھی۔ اجنبی لوگوں کے مابین' ماتحت کی حیثیت سے کام کرنا واقعی بہت مشکل تھا۔ م اپنے اعصاب کو قدرے مضبوط کرتی وہ جونہی اپنے باس کے کمرے میں داخل ہوئی' نگاہیں پھر سے را گئیں۔

وقت نے ایک مرتبہ پھر اس شخص کو اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا جس سے وہ بے انتہا نفرت محسوس تی تھی۔

کانچ سی خوبصورت نگاہوں میں بکھری حد درجہ حیرانگی نے مقابل کو بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ نے پر مجبور کر دیا تھا۔

''پلیز کم ان مس ثمرن شیردل اینڈ سٹ آن یور سیٹ۔''

وہ جو فون کریڈل پر ڈال کر مکمل توجہ کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ قدرے نرم لہجے میں بولا اچار ثمرن کو اپنے قدم آگے بڑھانے پڑے۔

''تھینکس۔'' اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد بہت آہستگی کے ساتھ اس نے کہا تھا۔

''تو آپ ہیں' ہماری نیو آفس ورکر' مس ثمرن شیردل۔''

جگمگ کرتی روشن سیاہ نگاہیں' اس کے سفید پڑتے چہرے پر دلچسپی سے جماتے ہوئے اس نے

پوچھا تھا جب ثمرن نے محض آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے' لیکن کیا آپ کو اندازہ ہے کہ اپنی جاب کے پہلے ہی دن آپ کتنی لیٹ آفس پ
.حرحال کیا آپ کو لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں؟''

گزرے ہوئے سات سالوں نے اس پر ذرا سا اثر بھی نہیں ڈالا تھا۔ وہ وہ سیاہی چارم
گڈ لکنگ تھا۔ جیسا سات سال پہلے اسے ثمرن نے دیکھا تھا۔

سب سے زیادہ اہم چیز جو اسے پرکشش بناتی تھی وہ اس کا اندازِ گفتگو اور دیدہ زیب ڈ
تھی۔

''مس ثمرن......آر یو اوکے؟''

اسے مسلسل خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ قدرے پریشانی سے گویا ہوا تھا۔ جو ساکت
انداز میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

♦ ♦ ♦

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا کیئے' وہ بیڈ پر اوندھا پڑا تھا۔ جب جاوید ہلکے سے دروازہ پش ک
اس کے قریب چلا آیا۔

''خدا کا نام لو عمر' دن کے گیارہ بج رہے ہیں اور جناب ابھی تک بستر سے نہیں نکلے' چھٹی د
دن کا یہ مطلب تو نہیں کہ سارے دن کمرے میں گھس کر' الوؤں کی طرح پڑے سوتے رہو۔''

اس کی پشت پر زبردست دھموکا جڑنے کے بعد وہ اب کھڑکیوں پر پردے ہٹانے لگا تھا۔ س
کی تیز کرنیں جونہی سرعت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ اوندھا لیٹا عمر عباس جھنجلا اٹھا۔

''پلیز یار' ابھی جاؤ تم یہاں سے' میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔''

''ہاں ایسا تو ہو گا ہی رات بھر جاگ جاگ کر تارے گنو گے اور صبح سب گائیں گھوڑے بیچ کر خوا
خرگوش کے مزے لوٹتے رہو گے تو سر تو بھاری ہو گا ہی' وہ تم نے سنا نہیں کہ صبح بیداری کے کتنے ڈھیر
فوائد ہیں' خیر میں مزید تمہارے ناز نخرے برداشت نہیں کروں گی۔ لہٰذا فوراً سے پیشتر بستر سے نکل کر با
لے لو' ورنہ آج تمہیں میرے ہاتھوں ضائع ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''کیا مصیبت ہے یار؟ صبح ہی صبح تم کسی عذاب کی صورت میرے سر پر مسلط ہو جاتے ہو' مہ
زندگی پر میرا اپنا ہی کوئی اختیار ہے کہ نہیں۔''

عمر کے قدرے شکایتی لہجے میں جاوید نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''چچ......چچ......چچ......عشق نے غالب نکما کر دیا تھا' ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے۔''

''اب اگر تم نے مزید بکواس جاری رکھی' تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔''

حسبِ توقع وہ فوراً سے پیشتر خاصا بھڑک اٹھا تھا۔ جواب میں جاوید مزید کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''کیوں......لگی ناں سیدھی دل پر جا کر؟ خیر کوئی بات نہیں' ہو جاتا ہے اکثر ایسا' واردات عشق
عجیب رہی ہے' بے خبری میں لٹ جاتا ہے انسان' تم فکر نہ کرو' اس راہ گزر پر بڑے بڑے بادشاہ اپنی
یریں لٹا بیٹھے۔ تیرا تو ابھی محض قرار گیا ہے۔''

''مر و تم۔''

اس پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے سلیپر پہنتے ہوئے' وارڈ روب سے کپڑے نکال کر سیدھا واش
م میں گھس گیا۔ جب کہ جاوید ہنوز مسکراتے ہوئے' شوخ سی دھن گنگنا کر اس کے کمرے کا بکھرا ہوا
بلاؤ سمیٹنے لگا۔

♦ ♦ ♦

بے اماں درد میرے دل میں پناہ مانگتا ہے
جرم ناکردہ بھلا کیسی سزا مانگتا ہے
بے ہنر ہوں میرے لفظوں میں اثر کیسے ہو
خود ہی تو جان لے کیا دست دعا مانگتا ہے

شام کے دھندلکے خاصے گہرے ہو رہے تھے۔

سبک روی سے چلتی ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں اس کے اعصاب کو قدرے سکون بخش رہی تھیں۔ آج ایک مدت کے بعد جانے کیوں اسے اپنی ممانی کی بے حد یاد آ رہی تھی۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جتنی چھوٹی تھی اتنی ہی ضدی اور غصیلی بھی ہوا کرتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنی مما سے روٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔

تب وہ اسے منانے کے لئے اس کے پیچھے بھاگتی رہتی تھیں۔ کبھی اسے اس کی فیورٹ پری کی کہانی سناتیں تو کبھی اس کی پسندیدہ ڈش بنا کر کھلاتیں۔ اس کی گڑیا کے نئے نئے کپڑے بنا کر دیتی سنعیہ کو یاد تھا۔

ایک بار ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ پورے تین دن تک وہ بخار میں پڑیں جلتی رہی تھیں، ے ابا انہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں گئے۔ سنعیہ ان کے بغیر پورے گھر میں بولائی بولائی سی تھی۔ اسے اپنا ہوم ورک مکمل کرنا تھا، مگر ریاضی کے مشکل سوال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ام میں غیاث الدین صاحب اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر آئے تو وہ اپنی سکول کی کاپیاں اٹھائے ے پاس آ گئی۔

"ابا...... مجھے ہوم ورک کرنا ہے، یہ سوال حل کر دیں نا۔"

اماں کا بخار شاید بہت تیز ہو گیا تھا۔ تبھی وہ آنکھیں بند کیئے بے سدھ پڑی تھیں۔ تاہم غیاث صاحب نے اسے خاصی ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"آتے ہی میرے سر نہ ہو جایا کر سنعیہ غیاث، سخت زہر لگتی ہیں مجھے تیری یہ عادتیں......"

"مگر میں نے کیا کہا ہے ابا! یہ سوال ہی تو حل کرنے کے لئے کہا ہے۔"

اپنے باپ کے الفاظ پر وہ از حد حیران ہو کر بولی تھی۔ کیونکہ دن بھر وہ اپنی ماں کو خوب ستاتی تھی، ہ تو اسے کبھی یوں نہیں ڈانٹتی تھیں، لیکن پھر ابا نے اتنا سخت لہجہ کیوں اپنایا تھا؟ اس لمحے آپ ہی آپ آنکھیں لبا لب آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔ مگر ابا نے اس کے آنسوؤں کی طرف نہیں دیکھا تھا، وہ اس ختی سے دبوچ کر غصے سے چلائے تھے۔

"میرے سامنے زبان چلاتی ہے، کاٹ کر رکھ دوں گا تیری یہ گز بھر کی زبان، چل جا، جا کر کام کر اپنا ڈھا کی لوٹھا ہو رہی ہے، پر بچپنا نہیں گیا ابھی تک......"

حقیقت میں آج سے پہلے اس نے کبھی اپنے ابا کو اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اب بھی وہ اتنے کیوں ہو رہے تھے سنعیہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ تبھی شاید اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا، میں غیاث الدین صاحب نے شدید مشتعل ہوتے ہوئے، اس کے منہ پر ایک زوردار تمانچہ جڑ دیا

تب اس کی ماں، اس کی تکلیف پر ہڑ بڑا کر اٹھی تھی۔ اپنی سوجھی ہوئی سرخ سرخ آنکھیں بمشکل کر اس نے سنعیہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ نقاہت کے مارے اس سے ٹھیک طرح سے بولا بھی جا رہا تھا۔ مگر پھر بھی اس نے سنعیہ کو پاس بلاتے ہوئے غیاث الدین صاحب سے مخاطب ہو کر کہا

"مجھ بدنصیب کا غصہ اس معصوم بچی پر کیوں نکال رہے ہو غیاث، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ جو ہاتھ اٹھا رہے ہو اس پر۔"

"بکواس بند کرو اپنی اور مت سکھاؤ اسے اپنی جیسی عادتیں۔"

اماں کے شکوے پر وہ مزید برہم ہوئے تھے۔ تبھی سنعیہ سہمتے ہوئے اپنی ماں کی گود میں جا چھپی

تھی۔

''خدا کا خوف کرو غیاث' میری بیماری کا نہیں تو محلے والوں کے سکون کا ہی خیال کرلو۔''

ایک مرتبہ پھر مدہم آواز میں اس کی ماں نے انہیں نارمل کرنا چاہا تھا' مگر ایک مرتبہ پھر انہیں ناکا[م] ہوئی تھی۔

''تو اپنی بکواس بند کر اور جا کر کہہ دے اپنے باپ کو بیس ہزار کا انتظام نہیں کر سکتا تو تیرے منحو[س] وجود کو بھی یہاں سے لے جائے۔ میرے لئے اب بھی لوگ اپنی بیٹیاں ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ کو[ئی] کال نہیں ہے مجھے لڑکیوں کا......''

سنعیہ کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکا تھا کہ اس جھگڑے کی بنیادی وجہ کیا تھی۔

''جانتی ہوں میں...... بیٹیاں بہت بڑا بوجھ ہوتی ہیں اپنے والدین پر' تبھی تو وہ جیسے تیسے اس بوجھ اتارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں' مگر یاد رکھ غیاث الدین' اللہ نے تجھے بھی بیٹی جیسی رحمت سے نوا[زا] ہے' بے شک اللہ' ظلم کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہے' اس سے ڈر غیاث الدین میرے باپ کے پا[س] اگر اتنی بڑی رقم ہوتی' تو وہ کبھی مجھے انکار نہ کرتا' میرے سوا آخر اس کا اور ہے ہی کون......؟''

اماں کے بجھے ہوئے شکستہ لہجے کے جواب میں اس کا باپ شدید مشتعل ہوتے ہوئے اپنی جلی کٹ[ی] سنا کر گھر سے باہر نکل گیا تھا' جب کہ رضیہ بیگم' شدید کرب کے انداز میں اپنی پلکیں موندتے ہوئے بے آواز رو پڑی تھیں۔

''تو نے مجھے مار کیوں نہیں دیا ابا! کیوں اپنے ہاتھوں سے جانتے بوجھتے اس جہنم میں دھکیل دیا مجھے؟''

اس روز سنعیہ نے اپنی ماں کو بہت کرب ناک انداز میں روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے اپنی ماں کے رونے سے بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ اپنا ہوم ورک بھی اس وقت وہ بالکل بھول گئی تھی۔ لیکن اب وہ گزرے ہوئے لمحات اس کی یادوں میں آ کر اسے شدید اذیت سے دوچار کر رہے تھے۔

•••

کبھی کبھی بس یوں ہی تنہا......
بے وجہ' بے مصرف بیٹھے
ہلکی نمی کے بے رنگ چادر
بینائی کے پار کے سارے اجلے منظر دھندلاتی ہے
دل میں اک بے نام اذیت
ڈار سے بچھڑی کونج کی مانند کرلاتی ہے
نا پرکھا کم درد چھوڑا -

اک بھرپوری انگڑائی سے جاگ اٹھتا ہے
تو اس لمحے کیوں لگتا ہے
جیسے وہ بھی یوں ہی تنہا......
بے وجہ' بے مصرف بیٹھا
میری یاد میں رویا ہوگا

''آپا...... آپ کو اماں اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔''

وہ پلکیں موندے' اداس بیٹھی' جانے کن سوچوں کے بھنور میں الجھی ہوئی تھی' جب صائمہ شیرازی ے دروازے پر دستک دے کر کمرے کے اندر چلی آئی۔ نازیہ کو اس وقت بہت تھکن فیل ہو رہی تھی۔ مہینے کے آخری دنوں میں چونکہ پرچہ مارکیٹ میں آنا ہوتا تھا' لہٰذا اس کی مصروفیات بڑھ جاتی ں۔ دیر تلک کام کرتے رہنے کی وجہ سے' سر بھی بری طرح دکھنے لگتا تھا۔

ابھی بھی وہ پین کلر لے کر آرام کرنے کی غرض سے اپنے بستر میں بیٹھی تھی' مگر صائمہ شیرازی سے ے اماں کا پیغام سنا کر اچھا خاصا بے آرام کر دیا تھا۔

''کیا بات ہے صائمی......؟ کیا پھر سے کوئی نیا رشتہ آیا ہے؟''

طبیعت پر چھائی سستی کی وجہ سے اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے صائمہ سے پوچھ لیا تھا۔ جواباً وہ ایک پور نگاہ اس کے اداس سراپے پر ڈالتے ہوئے مدہم لہجے میں بولی۔

''ہاں...... شاید ایسا ہی کوئی مسئلہ ہے' میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتی' لیکن اس بار ابا بہت سیریس ا آپا! یہ رشتہ شاید ان کی کسی منہ بولی بہن کے بیٹے کا ہے۔ لڑکا اچھا خاصا میچور ہے' پڑھا لکھا اور کماؤ ہے' ابا کی بہت عزت بھی کرتا ہے ابا بتا رہے تھے' ابھی چھ ماہ قبل ہی اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا ہے' اب وہ ابا پر تمہارے لئے دباؤ بڑھا رہے ہیں۔ مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے آپا!'' صائمہ شیرازی کے ے میں الجھن نمایاں تھی۔ تبھی وہ اپنا سر بیڈ کی پشت سے ٹکاتے ہوئے ایک دھیمی سی مسکراہٹ اپنے اداس ں پر پھیلا کر نرمی سے بولی۔

''کیا اچھا نہیں لگ رہا ہے؟''

''یہی کہ موصوف نہ صرف شادی شدہ ہیں' بلکہ ابھی بیوی کے مرنے کے چھ ماہ بعد ہی دوبارہ سر پر سجانے کے خواب بھی دیکھنے لگے۔ یہ مرد اتنے بے حس' اتنے خود غرض کیوں ہوتے ہیں آپا!''

نازیہ محسوس کر سکتی تھی کہ صائمہ آج کل ضرورت سے زیادہ حساس ہوتی جا رہی تھی۔

جانے یہ تقدیر کا قصور تھا یا حالات کی ستم ظریفی' کہ ان دونوں بہنوں کے لبوں سے' مسکراہٹوں کا ق جیسے ٹوٹ ہی گیا تھا۔

نازیہ شیرازی کو کبھی کبھی خود پر بڑا غصہ آتا تھا۔

جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ اپنی وجہ سے‘ بے مقصد اپنے گھر والوں کو پریشا
رہی ہے۔

آخر دنیا میں اور لوگ بھی تو محبت کرتے ہیں؟ اور لوگوں کے ساتھ بھی تو بے وفائی ہوتی ہے؛ لوگوں کی آنکھوں میں بھی تو آنسو ٹھہر جاتے ہیں‘ لیکن وہ تو اس کی طرح‘ زندگی کو خود پر حرام نہیں کر یہاں سب لوگ خوشیوں کے خواب دیکھ کر‘ دکھ کی فصل کاٹتے ہیں‘ لیکن اس کی طرح دکھ کا اشتہار تو نہیں بنتا۔

”کیا بات ہے آپا؟ آج پھر آپ بہت اداس دکھائی دے رہی ہیں۔“

اسے مسلسل خاموش پاکر‘ صائمہ شیرازی اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی‘ جواب میں جانے اس کی آنکھیں آپ ہی آپ لبالب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

”میں بہت بری ہوں ناں صائمہ‘ بیٹیاں اپنے ماں باپ کا کتنا سوچتی ہیں‘ ان کے لئے کتنی قربا دیتی ہیں‘ لیکن میں کتنی خود غرض ہوں‘ محض اپنی وجہ سے تا حال تم سب کو مسلسل دکھ دے رہی ہوں اذیت کا شکار ہو کر‘ تم سب کو پریشانی سے دوچار کر رہی ہوں‘ میں کیا کروں صائمہ......؟ میری اپنی زند بھی میرا کوئی اختیار نہیں رہا۔“

آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھر آیا تھا‘ تبھی صائمہ شیرازی نے اپنا ہاتھ اس کے سرد ہاتھوں پر رکھ دیا۔

”آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں آپا؟ کوئی اور جانے یا نہ جانے‘ لیکن میں سلمان بھائی سے آپ محبت کے تعلق کو خوب سمجھتی ہوں‘ آپ جو درد پچھلے سات سال سے دل ہی دل میں سہہ رہی ہیں‘ میں سے خوب واقف ہوں آپا‘ کاش کوئی معجزہ ہو جائے اور سلمان بھائی واپس آپ کی زندگی میں آ جائیں“

”آمین۔“

زیر لب کہتے ہوئے اس نے جیسے ہی پلکیں موندی‘ دو آنسو بڑی خاموشی سے‘ اس کی پلکوں لڑھک کر گالوں پر پھیل آئے۔

”او مائی گاڈ...... میں تو چولہے پر دودھ رکھ کر آئی تھی‘ اب دیکھ لیں آپا‘ آپ سے باتوں سے میں اپنا کام تک بھول جاتی ہوں۔“

ماحول کی کثافت کو کم کرنے کے لئے‘ صائمہ شیرازی فوراً اس کے قریب سے اٹھ کھڑی ہوئی تبھی وہ بھی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے‘ بیڈ کے نیچے سے اپنے سلیپر تلاش کرنے لگی۔

”یہ اماں اور ابا بھی پتہ نہیں کچھ سمجھتے کیوں نہیں ہیں‘ ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے شادی نہیں مگر مجال ہے جو میری بات ان کی سمجھ میں آ جائے۔“

بہت مدھم آواز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ صائمہ کے ساتھ ہی اپنے کمرے سے باہر نکل کر اما

رے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جہاں وہ ابا کے ساتھ بیٹھیں دھیمے لہجے میں یقیناً اسی کے متعلق باتیں کر رہی ں۔

♦ ♦ ♦

”آپ......؟“

اپنے سامنے بیٹھے اسفند شیرازی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

اپنے گھومتے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ وہیں اس کے سامنے‘ اس کی اجازت کے بغیر کرسی پر گئی تھی۔ اسفند شیرازی اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے‘ تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا۔

”مس ثمرن...... آر یو آل رائیٹ......؟“

ثمرن کے حواس اس وقت اپنے ٹھکانے پر نہیں تھے۔ بصارتوں کو غیر متوقع طور پر خاصا شدید دھچکا لگا تھا۔ وہ تو یہاں گھر سے فرار پانے کے لئے آئی تھی۔ شہروز علوی کا سامنا نہ کرنے کا سوچ کر آئی تھی۔ مگر تقدیر نے یہ کیسا مذاق کیا تھا اس کے ساتھ‘ کہ ایک درد سے بچا کر‘ دوسرے شدید درد کے حوالے کر دیا تھا۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی‘ کم سے کم اس جلاد صفت شخص کے سامنے تو بالکل نہیں‘ لیکن آنسوؤں نے اس کا بھرم نہیں رکھا تھا۔

ایک بار جو پلکوں سے ٹوٹے‘ تو پھر گالوں پر پھیلتے ہی چلے گئے۔ اسفند شیرازی اب بہت توجہ کے ساتھ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ بے شک ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کوئی آفس میں کام کرنے والی لڑکی‘ اس کے سامنے آکر‘ بنا کوئی دعا سلام کئے‘ یوں بچوں کی طرح بے حال ہو کر روئی ہو۔

ثمرن کو جلد ہی اپنی پوزیشن کا احساس ہو گیا تھا‘ تبھی وہ سرعت سے اپنی آنکھیں رگڑ رگڑ کر بمشکل اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری...... وہ ایکچولی میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی‘ اور پھر...... سوری سر......“

”اوکے‘ میرا خیال ہے ابھی آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہئے۔ اس وقت آپ اپنے کام کے متعلق کچھ بھی سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

فوراً اسے پیشتر اسفند شیرازی نے اس کا ایکسکیوز قبول کر کے‘ اسے گھر واپسی کا عندیہ دے دیا تھا جواب میں وہ فٹ سے اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”جی...... تھینک یو سر......“

وہ خود بھی یہاں سے جلد از جلد فرار چاہتی تھی۔ لہٰذا فوراً اسے پیشتر اس کے کیبن سے نکل کر وہ تیز تیز چلتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ آئی اور پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گھر کے راستوں کی جانب گامزن ہو گئی۔

♦ ♦ ♦

ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
جسم کی ٹھنڈی سیاہ تاریک قبر کے اندر
نہ کسی سانس کی آواز نہ سسکی کوئی
نہ کوئی آہ نہ جنبش' نہ ہی آہٹ کوئی
ایسے چپ چاپ ہی مر جاتے ہیں کچھ لوگ یہاں
ان کو دفنانے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑی

شام کی گہری ہوتی ہوئی تاریکی اس کے اندر اداسی کے احساس کو بڑھاوا دے رہی تھی۔

حمدان بھیا کی شادی کے سلسلے میں آئے مہمانوں کی وجہ سے' پوری حویلی میں ایک عجیب سی رو لگ گئی تھی۔ گہری ہوتی شام کے دھندلکوں کے ساتھ' جگمگ کرتی روشنیوں اور قمقموں نے' حویلی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

ابھی تک اس نے خود کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ شادی کی تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہوئے اس نے کتنے ہی کام اپنے ذمے لے لیئے تھے۔ دادی ماں کا ہر کام یوں بھاگ بھاگ کر رہی تھی' جیسے سب سے اہم فریضہ یہی ہو' وہ بھی اس سے بے حد خوش دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنے تما جاننے والوں میں انہوں نے سبرینہ کو اپنی پوتی کی حیثیت سے ہی متعارف کروایا تھا چھوٹے چھو کاموں کے لیئے' جب وہ از حد اپنائیت سے اسے آواز دیتیں تو سبرینہ کا سیروں خون بڑھ جاتا۔

حائقہ پھپھو بھی اس تمام صورتحال پر بے حد مسرور دکھائی دے رہی تھیں۔ حمدان بھیا کی خو بھی اس موقع پر دیکھنے لائق تھی کیونکہ انہیں کڑے مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر اپنا من پسند ہم سفر رہا تھا۔

لڑکی بالیوں نے کئی روز پہلے ہی ڈھولک سنبھال کر خوشی کے گیت گانے شروع کر دیئے تھے سبرینہ کو اس موقع پر ایک مرتبہ پھر اپنے بابا بہت بری طرح سے یاد آ رہے تھے' لہٰذا وہ اداس ہوتے ہو وسیع لاؤنج سے نکل کر باہر سرسبز لان کی طرف چلی آئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے معطر جھونکے' اس اعصاب پر خاصا اچھا اثر ڈال رہے تھے۔ تبھی اس نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔

''ایکسکیوزمی پلیز۔''

سبرینہ نے نا آشنا پکار پر پلٹ کر فوراً پیچھے کی طرف دیکھا تھا' جہاں آف وائیٹ پینٹ کوٹ ملبوس کھڑا' ایک وجیہہ سا شخص خاصے انہماک سے اسی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''اتنے خوبصورت چہرے پر' اس درجہ اداسی......؟ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں مس......؟''

''سبرینہ......سبرینہ احسان احمد نام ہے میرا۔''

لمحے کے ہزارویں حصے سے قبل' قدرے ناگواری سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے' سبرینہ

اپنا تعارف کروایا تھا' جب وہ از حد خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''تھینکس' بہت خوبصورت نام ہے آپ کا' بہر حال میں کافی دیر سے آپ کو اداس دیکھ رہا ہوں' کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔''

''نہیں......کیونکہ میں ہر اجنبی سے فری ہو کر بات کرنا پسند نہیں کرتی۔''

قدرے ترشی کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے وہ آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی' جب اس نوجوان نے سرعت سے اس کی کلائی تھام لی۔

♦ ♦ ♦

اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی' وہ ڈوبتے ہوئے سورج کا اداس منظر' خاصی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی' جب اچانک مسز غیاث دندناتے ہوئے اس کے قریب چلی آئیں۔

''سنو لڑکی! کل ہمدانی صاحب کے گھر ان کے بیٹے کی سالگرہ کا فنکشن ہے۔ ہمدانی صاحب کی بیگم تمہاری مرحوم ماں کی بہت گہری دوست رہ چکی ہیں' لہٰذا انہوں نے بطور خاص تمہیں اس فنکشن میں انوائیٹ کیا ہے' مناسب سی تیاری کر لو' کیونکہ تمہارے پاپا تمہیں ساتھ لانے کی حامی بھر چکے ہیں۔''

سات آٹھ سال میں یہ پہلا موقع تھا' جب سنعیہ کو اپنے گھر والوں کے ساتھ کسی فنکشن میں شرکت کرنے کا چانس مل رہا تھا' وگرنہ تو اس کی دنیا بس گھر اور کالج تک ہی محدود تھی۔ مسز غیاث اپنی بات مکمل کرنے کے بعد' واپس پلٹتے ہوئے اچانک کچھ یاد آنے پر ایک مرتبہ پھر اس کی طرف مڑی تھیں۔

''اور ہاں......کان کھول کر سن لو' وہاں جا کر کسی کے ساتھ زیادہ گھلنے ملنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اپنے مظالم کی داستان بیان کرنے بیٹھ جانا' یاد رکھو کہ میں تمہیں کسی بھی ایسے فنکشن میں لے جانے کی حامی نہیں ہوں۔''

وہ یہ بات نہ بھی کہتیں' تب بھی سنعیہ کو معلوم تھا کہ وہ اس سے کس درجہ نفرت کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کے حکم پر سر جھکا کر آہستہ سے ''جی اچھا'' کہتے ہوئے' اس نے اپنا رخ اپنی بے نام سی وارڈروب کی طرف پھیر لیا تھا۔ جس میں گنتی کے چند پرانے جوڑے پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ تب مجبوراً اسے اپنا یہ مسئلہ مسز غیاث کے حضور پیش کرنا پڑا۔ تو انہوں نے بجائے اسے نئے سوٹ کے لئے پیسے دینے کی' پنکی کا ہی ایک نسبتاً بہتر جوڑا اس کے حوالے کر دیا۔

''یہ لو اسی سے کام چلا لو' ابھی کل ہی پنکی کو دو ہزار دیئے ہیں شاپنگ کے لئے' میرے پاس کوئی پیسوں کی مشین نہیں لگی جو سب کی فرمائش پوری کرتی رہوں' ویسے بھی تمہیں وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا' چل جا اب یہاں سے۔''

جانے کیوں سنعیہ کے لئے غصہ ہر وقت ان کی ناک پر ہی دھرا رہتا تھا' لہٰذا پنکی کا پہنا ہوا سوٹ بہ شکریہ اٹھا کر' وہ دوبارہ اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ ایک تو آج کل آنکھیں بات بے بات بھر

ـنے کو بے تاب رہتی تھیں۔ گزرے ہوئے وقت کے لمحے ہر پل زخم تازہ کرنے پر تل رہتے تھے
گئے اسے نت نئی فراکیں، ٹراوزر شرٹس اور جانے کیا کیا سی کر پہناتی رہتی تھیں، لیکن اب اسے
اترن بھی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی تھی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی کیوں نہیں،
سے کم زندگی کے یہ عذاب تو نہ دیکھنے پڑتے۔

اس رات ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے بہت سے انمول آنسو اپنی مما کی یاد میں بہائے تھے،
تھی کہ اگلی صبح وہ اٹھی تو اس کی خوبصورت آنکھوں میں سرخ ڈورے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ شاید
بخار بھی تھا، مگر اس نے کسی پر اپنا حال ظاہر نہیں کیا۔ طبیعت کی خرابی کے باعث وہ کالج نہیں گئی تھی
گھر کے تمام کام اس نے اپنے معمول کے مانند ہی سرانجام دیئے تھے۔ صبح اٹھ کر فریش ہوتے
نے سب کی پسند کا ناشتہ بنایا، پھر برتن دھو کر صفائی میں جت گئی، پنکی نے تب تک اپنے اور اپنی ماں
کپڑے پریس کر لئے تھے، فنکشن چونکہ شام کا تھا، لہٰذا اپنی ضرورت کی تمام اشیاء ترتیب سے رکھ
اپنے کمرے میں پھر سے مقید ہو گئی، جب کہ سنعیہ ہفتہ بھر سے جمع میلے کپڑوں کو مشین میں ڈال کر
لگی۔

گھر کے کاموں میں محو ہو کر پورا دن کیسے گزر گیا، اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ ہوش تو اس وقت آیا
پنکی نے فل تیار ہو کر، اسے بھی ساتھ چلنے کے لئے فٹافٹ تیار ہونے کا حکم سنایا۔ ایک تو طبیعت کی
اوپر سے جلدی جلدی کی گردان نے اس کے ہاتھ پیر ہی پھلا دیتے تھے۔ فنکشن کے لئے پنکی سے اد
ہوا، وہ اپنا سوٹ بھی ٹھیک سے پریس نہیں کر پائی تھی۔ بہت معمولی سے میک اپ کے ساتھ نارمل سی
کر وہ اپنی سوتیلی ماں اور بہن کے ساتھ مسز ہمدانی کے گھر پہنچیں تو وہاں ایک نئی ہی دنیا آباد دیکھ کر
نروس ہو گئی۔

تاہم مسز ہمدانی نے اسے اپنے سامنے پا کر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ حقیقت میں ایک
کے بعد سنعیہ کو کسی سے اس درجہ اپنائیت و محبت ملی تھی۔ بہت سالوں کے بعد اس نے کسی کے وجود میں
مما کے پیار جیسی خوشبو کو محسوس کیا تھا، لہٰذا وہ انہیں سے چپک کر کھڑی رہی۔ جب کہ دوسری طرف
پارٹی میں مدعو جاوید کی نگاہ جونہی اس کے معصوم سے دلکش چہرے پر پڑی۔ وہ اپنے ساتھ کھڑے
مخاطب کیئے بغیر نہ رہ سکا۔

''ارے یار عمر!...... وہ دیکھ خدائی معجزہ، وہ تیری لیلیٰ بھی آج اسی پارٹی میں جلوہ گر ہے۔''

عمر کسی کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا، جاوید کی سرگوشی پر فوراً چونک کر اس سمت دیکھنے لگا،
واقعی اس کی محبت سنعیہ غیاث کے روپ میں مجسم کھڑی، اس محفل کی رونق کو دوبالا کر رہی تھی۔

● ● ●

نازی نے جونہی اپنی اماں کے کمرے میں قدم رکھا، وہ دونوں اسے دیکھتے ہی فوراً

ہو گئے۔ تب وہ دونوں کو مشترکہ سلام کر کے وہیں ان کے قریب علیحدہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''آپ نے مجھے بلایا اماں......؟''

''ہاں...... تیرے ابا تجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

اماں کا لہجہ ہمیشہ کی طرح لیا دیا ہی تھا۔ نازیہ اب خاموشی سے اپنے باپ کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''خیریت تو تھی ابا، کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے......؟''

''کچھ زیادہ خاص بات نہیں ہے، کل آمنہ آئی تھی میرے پاس، آمنہ کو تو جانتی ہے ناں تو تیری پھپھو لگتی ہے رشتے میں۔''

اپنا مدعا بیان کرنے سے قبل انہوں نے غالباً تمہید باندھی تھی، جب وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

''جی معلوم ہے مجھے، کیا ہوا ہے ان کو......؟''

''ان کو کیا ہونا ہے...... آج کل اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کے سلسلے میں بہت پریشان رہتی ہے بیچاری۔''

''لیکن...... جہاں تک میں جانتی ہوں ان کا بیٹا تو آل ریڈی شادی شدہ ہے۔''

ابا کو شاید یوں اپنی بات کا کاٹنا سخت ناگوار گزرا تھا، تبھی ان کی پیشانی پر کئی سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

''ہاں، لیکن اب اس کی بیوی حیات نہیں ہے۔''

''اوہ...... لیکن یہ سب آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں......؟ میرا تو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔''

سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود اس نے اس معاملے سے انجان رہنے کی کوشش کی تھی، تبھی شاید ابا کو اس پر شدید غصہ آیا تھا۔

''پوری بات سنے گی تو تیرا تعلق بنے گا ناں۔''

اگلے چند لمحوں کے لئے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی، جسے پھر ابا کی نحیف آواز نے ہی توڑا تھا۔

''دیکھ نازی پتر...... ہم تیرے ماں باپ ہیں، کبھی تیرا برا نہیں سوچیں گے، سات سال ہو گئے سلمان کو گئے ہوئے، اتنا عرصہ بہت زیادہ ہوتا ہے بیٹی، اسے اگر واپس لوٹ کر یہاں آنا ہوتا، تو وہ کب کا آچکا ہوتا، پھر جب وہ تیری پروا نہیں کرتا، تو تو کیوں اس کا جوگ لے کر بیٹھ گئی ہے؟''

''میں نے کسی کا جوگ نہیں لیا ابا! یہ باتیں آپ پہلے بھی بہت بار مجھ سے کر چکے ہیں، کوئی نئی بات کریں پلیز۔''

سلمان کا ذکر ہمیشہ ہی اس کے اندر ایک عجیب سے آتش فشاں کو ابھار دیتا تھا، تبھی سخت بے کلی سے ان کی بات کاٹتے ہوئے، اس نے اپنی انگلیوں پر دوپٹے کو لپیٹنا اور اتارنا شروع کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے...... تو نئی بات سن، نئی بات یہ ہے کہ میں نے اور تیری اماں نے آپس کے صلاح

مشورے کے بعد تیری آمنہ پھپھو کے بیٹے طلال کے ساتھ تیرے رشتے کی بات پکی کر دی ہے خود
طور پر اس کے لئے تیار کر لے۔"

"وحاث...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا......؟"

اس کے دل پر جیسے کسی نے فائر کر دیا تھا' فوراً سے پیشتر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے گھٹی گھ
آواز میں چلائی تھی۔

"میں جو بھی کہہ رہا ہوں' تیرے بھلے کی کہہ رہا ہوں' ان ناتواں کاندھوں میں اب مزید اتنی طا
نہیں رہی ہے' کہ دو دو جوان بیٹیوں کا بوجھ اٹھائے پھروں' بیٹیاں ہمیشہ ماں باپ کی عزت کا سوچتی
ان کی خوشی کے لئے خود کو قربان کر دیتی ہیں' لیکن ہم تجھ سے کوئی قربانی نہیں مانگ رہے' بلکہ اپنے جیتے
تجھے محفوظ ہاتھوں میں سونپ کر' تیرا مستقبل روشن کرنا چاہتے ہیں طلال کو بہت اچھی طرح سے جانتا
میں' نہایت شریف اور سلجھا ہوا بچہ ہے۔ اللہ نے چاہا تو تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی' پھر آمنہ بہن
تمہیں بہت چاہ سے مانگ رہی ہیں' اس عمر میں اتنی چاہ سے ایسا رشتہ ملنا بہت مشکل ہے اور پھر تو محض
ضد کے لئے اپنی بہن کا مستقبل کیوں تباہ کر رہی ہے؟"

"وہ اب جوان ہو گئی ہے' اس کے بھی کچھ خواب ہیں' کچھ تمنائیں ہیں' ہم تیرے فرض
سبکدوش ہوں گے تو اس کے متعلق سوچیں گے ناں۔"

آج ابا نے جیسے قسم کھالی تھی کہ اسے کسی بھی طرح سے اس رشتے کے لئے راضی کر کے رہیں
تبھی بھرپور دلائل دیتے ہوئے بولے تو نازیہ کو اپنی سانس سینے سے باہر نکالنا مشکل ہو گئی۔

"ایسا مت کریں ابا' پلیز' دیکھئے میں اپنا حق آپ کو معاف کرتی ہوں' آپ ضائی کی شادی
دیجئے' میں ساری عمر بیٹا بن کر آپ کی خدمت کروں گی' پلیز ابا!"

بہت مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر' ایک مرتبہ پھر وہ گڑگڑائی تھی' مگر اس مرتبہ وہ اپنی با
منوانے میں قطعی ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

"بس...... میں نے جو کہنا تھا' کہہ دیا' اب اگر تو نے کوئی اعتراض کیا' یا ہمیشہ کی طرح ہمارے فی
کی نافرمانی کرنے کا سوچا تو یاد رکھو اس بار تم اپنے باپ کا مرا منہ دیکھو گی۔"

ابا اپنے فیصلے میں قطعی اٹل دکھائی دے رہے تھے۔

تبھی اس نے اماں کی طرف' ڈبڈبائی ہوئی امید بھری نگاہوں سے دیکھا تھا' لیکن ان کے چہر
پر بھی اسے ماسوائے سختی کے اور کچھ دکھائی نہیں دے سکا تھا۔ تبھی آخری کوشش کے طور پر روتے ہوئے
پھر بڑبڑائی تھی۔

"میں نے خود سے یہ عہد کیا تھا ابا! کہ میں سلمان کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کروں گی۔"

"پاگلوں جیسی باتیں مت کر نازی' جب عہد نبھانے والا ہی نہیں رہا تو کیسا عہد اور کہاں کا ع

جا پرانی باتوں کو' سلمان اگر زندہ ہوتا' تو یقیناً اسے اپنا داماد بنا کر ہمیں بے پناہ خوشی ہوتی' لیکن اب
بات سالوں سے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ہے' لہٰذا تو اسے بھلا کر اپنے آگے کی زندگی کا سوچ کیونکہ
یں تیری اور تیرے ماں باپ کی بھلائی ہے۔"

ابا نے ایک مرتبہ پھر اسے خاصا ڈپٹ کر رکھ دیا تھا۔ لہٰذا اس بار وہ خاموشی سے سر جھکا کر ان کے
ے سے باہر نکل آئی تھی۔ دل درد کے بوجھ سے جیسے کٹ رہا تھا۔ اعصاب الگ بھاری ہو رہے تھے۔
پنے کمرے میں آتے ہی اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لئے نیند کی گولیاں ہتھیلی پر رکھیں' پھر انہیں
ہی لمحے پھانک کر پانی کا بھرا ہوا گلاس غٹاغٹ حلق میں انڈیل گئی۔

اگلی صبح ضائی اسے جگانے کے لئے اس کے کمرے میں آئی' تو اس کا حال دیکھ کر اسے اپنے ہوش
تے ہوئے محسوس ہوئے۔ تبھی وہ گالوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر زور زور سے چلا اٹھی تھی۔

"ابا' اماں...... جلدی آیئے پلیز' آپا کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے......؟"

♦ ♦ ♦

اسفند شیرازی کے آفس سے آتے ہی وہ اپنے کمرے میں مقید ہو گئی تھی۔ جسم غیر محسوس طریقے
ے ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ زندگی یوں اسے دوبارہ اسفند
رازی کے مقابل لے آئے گی۔

دوسری طرف اسفند آفس سے فارغ ہو کر' گھر آیا تو دادو لان میں ہی بیٹھی اس کا راستہ دیکھ رہیں
یں' لہٰذا وہ اپنی کار سے نکل کر سیدھا انہی کی طرف چلا آیا اور ان کی گود میں آہستہ سے سر رکھ کر' پلکیں موند
یا۔

"میں کب سے تیرا راستہ دیکھ رہی تھی اسفی' آج گھر لوٹنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے؟"

اس کے گھنے سلکی بالوں میں' محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا' جب وہ اسی
زیشن میں زمین پر بیٹھے بیٹھے بولا۔

"آج کچھ کام زیادہ تھا دادو' پھر ایک فارنر ڈیلیگیشن کے ساتھ بہت اہم میٹنگ بھی تھی۔"

"بس...... اسی بزنس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنا' کبھی اپنے متعلق کچھ نہ سوچنا۔"

"مجھے اپنے متعلق کچھ بھی سوچنے کی کیا ضرورت ہے پیاری دادو' میرے متعلق سوچنے کے لئے
ھی آپ ہیں ناں۔"

ان کے ڈپٹنے والے انداز پر اسفند نے سر اٹھا کر نہایت محبت سے ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا
تھا۔ جب وہ قدرے افسردگی سے اس کی کشادہ پیشانی چومتے ہوئے بولیں۔

"اس لئے تو کہتی ہوں اسفی' میری بات مان لے پتر۔ اپنے باپ کو تو' تو جانتا ہے' اس کے پاس
تیرے لئے بالکل فرصت نہیں' پھر اس بوڑھی دادو کا سایہ کب تک تیرے سر پر رہے گا بیٹے......؟ میں چاہتی

ہوں' میں اپنی زندگی میں تجھے تیرے گھربار میں مگن دیکھ لوں پتہ نہیں کب یہ زندگی داغ مفارقت دے جائے گی پتر' دادو کی بات مان لے' دنیا ایک اسی لڑکی پر ختم نہیں ہے' تو نظر اٹھا کر دیکھے گا تو بہت سی ہوئی اچھی لڑکیاں بھی دیکھنے کو مل جائیں گی۔"

دادو حسب معمول اپنا پسندیدہ موضوع لے کر بیٹھ گئی تھیں' مگر اسفند نے ہمیشہ کی طرح انہیں ٹال دیا تھا۔

"مجھے آپ کی بات سے انکار نہیں ہے دادو' بے شک اس دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں لیکن...... میں اپنے دل کا کیا کروں دادو' یہ دل محض اسی لڑکی کا مقروض ہے' جو انجانے میں میرے نشانہ بن گئی۔ مجھے اب بھی اپنے کمرے میں اس کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں دادو' اب بھی مجھے وہ یاد آتی ہے تو میری سانس' میرے سینے میں گھٹنے لگتی ہے۔ میں اسے بھلانے پر قادر نہیں ہوں دادو' کیا کروں میں"

دادو اس کی بے بسی جانتی تھیں' مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر' ہر بار اس کے زخموں کو کریدتی تھیں۔ اس وقت بھی اسے ڈسٹرب دیکھ کر وہ خاصی نادم دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم اسفند شیراز نے فوراً خود کو سنبھال کر' مسکراتے ہوئے' ان کے پچھتاوے کو کسی حد تک کم کر دیا۔

"آپ سے اک سوال پوچھوں دادو......؟"

"پوچھو...... کیا پوچھنا چاہتے ہو۔" اسے سر اٹھا کر مسکراتا دیکھتے ہوئے یقیناً انہیں خاصی تقویت ملی تھی۔

"دادو' آج سے پینتیس' چالیس برس قبل آپ مجھے کیوں نہیں ملیں؟"

مجھے پر خصوصی زور دیتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

"تجھے کیسے ملتی' اس وقت تک تو' تو پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔"

"یہی تو...... یہی تو میں کہہ رہا ہوں دادو' میں آج سے پینتیس چالیس سال قبل آپ سے کیوں

اس کا موڈ خاصا فریش ہو چکا تھا۔ گداز لبوں کے کناروں میں دبی شریر مسکراہٹ کا راز سمجھنے سے قاصر تھیں' تبھی مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"مل جاتے تو کیا ہو جاتا......؟"

"آپ سے شادی کر لیتا ناں دادو' شادی نہیں تو کم از کم کوئی لو سٹوری ہی چلا لیتا۔"

اب کے وہ کھل کر مسکرا دیا تھا۔ تبھی دادو ایک زوردار دھپ اس کے مضبوط کندھے پر رسید کرتے ہوئے بولیں۔

"چل بدمعاش' دادو سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے شرم تو نہیں آتی۔"

"شرم کی اس میں کیا بات ہے دادو' آخر دادا نے بھی تو آپ پر لائین ماری تھی ناں' اور پھر بقول آپ بھی انہیں پسند کرتی تھیں' تو اگر دادا کی جگہ اللہ میاں مجھے آپ کی زندگی میں بھیج دیتے' تو ذرا سوچیے' ہم دونوں کی زندگی کتنے مزے میں گزرتی' سچ کہتا ہوں دادو' لوگ ہمیں چاند سورج سے تشبیہ دیتے۔"

وہ مسلسل بول رہا تھا اور دادو ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھیں۔

"اللہ اسفی' بہت شرارتی ہو تم' تمہیں تو واقعی خدا پوچھے گا۔"

ان سے اپنی ہنسی پر کنٹرول کرنا خاصا مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی وہ ان کے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئی لو یو سو مچ دادو' ریئلی آئی لو یو۔"

اس بار اس کے چہرے پر قطعی سنجیدگی تھی۔ لہٰذا دادو بھی اپنی ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے آہستہ سے کھڑی ہوئیں پھر ایک ممتا بھرا بوسہ اس کے صبیح گال پر ثبت ہوئے' چپ چاپ اندر لاؤنج کی طرف آ گئیں۔

◆ ◆ ◆

"کمال ہے میں آپ سے مخاطب ہوں اور آپ ہیں کہ سن ہی نہیں رہیں۔"

وہ جو کوئی بھی تھا یقیناً بلا کا خود اعتماد تھا۔ مگر سبرینہ کو اس کی یہ حرکت قطعی پسند نہیں آئی تھی' تبھی وہ جھٹکے سے اپنی کلائی اس کی گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے بولی۔

"میں فضول بکواس پر کان دھرنے کی عادی نہیں ہوں۔"

"میں آپ کی تعریف کر رہا ہوں محترمہ بہر حال حسن والوں کو مغرور تو بہت دیکھا ہے' مگر ایسی بھی کیا مغروری' کہ نظر اٹھا کر دیکھنا تک گوارہ نہ کریں۔"

ادھر جیسے سبرینہ کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں تھا' تبھی وہ پھر غرائی تھی۔

"آپ حد سے بڑھ رہے ہیں مسٹر۔"

تفسیر...... تفسیر عباس نام ہے میرا۔"

اسی کا انداز اپناتے ہوئے اس نے فوراً اپنا تعارف بھی اس کے حضور پیش کر دیا تھا۔ جواب میں وہ بپھرتے ہوئے بولی۔

"تفسیر ہو یا تقدیر' مجھے آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"نا سہی...... مگر مجھے تو آپ میں دلچسپی ہے۔"

خوبصورت گداز ہونٹوں کے کناروں میں دبی مسکراہٹ اس کا خون کھولا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے یوں تن کر کھڑا تھا' جیسے اسے اپنی مرضی سے روکے رکھنے کا مجاز ہو۔

"دیکھیے مسٹر' میں آپ کو بالکل نہیں جانتی کہ آپ کون ہیں' پھر کیوں یہ [illegible]

"میں آپ کو جاننا چاہتا ہوں مس سبرینہ۔"

دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے اس بار وہ قطعی سنجیدگی سے بولا تھا' جواب میں وہ جیسے تھ
قریبی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا جاننا چاہتے ہیں آپ میرے بارے میں۔"

عجیب تھکے تھکے سے انداز میں اس نے پوچھا تھا' جب وہ اس کے سامنے والی کرسی سنبھ
ہوئے بولا۔

"کچھ بھی' جو آپ بتانا چاہیں۔"

"میرے پاس' خود میرے ہی بارے میں بتانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے تفسیر صاحب۔"

"کیوں...... اپنا آپ کہیں بھول بیٹھی ہیں کیا......؟" ایک مرتبہ پھر اس کے لبوں پر بڑی دلک
مسکراہٹ بکھری تھی۔

"ہاں...... کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"یہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا' آپ کو' میرا مطلب ہے میں یہاں آتا جاتا رہتا ہوں' ازہان
قریبی دوست ہے میرا' کچھ فیملی ٹرمز بھی ہیں۔"

ان دونوں کے بیچ ابتدائی سرد مہری اور اجنبیت کا تاثر زائل ہو گیا تھا۔ بے شک تفسیر عبا
جادوئی شخصیت کسی کو بھی اپنی طرف آسانی سے مائل کر سکتی تھی۔

"آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں' اصل میں مجھے ابھی یہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں' اس
پہلے میں پاکستان میں نہیں تھی۔"

سبرینہ اس پر یوں اتنی جلدی اعتبار کیوں کر بیٹھی تھی۔ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن
کیوں اسے تفسیر عباس سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ لہٰذا وہ پرت در پرت اس پر کھلتی جا رہی تھی۔

"آئی سی...... اگر آپ مائینڈ نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس حویلی کے ساتھ آپ کا کیا
ہے......؟"

دوسری طرف سے وہ بھی اپنائیت کی تمام حدود پھلانگتے ہوئے' اس سے گفتگو کو جاری رکھے
تھا۔

"جی بالکل' اسی میں مائینڈ کرنے والی' کوئی بات ہے بھی نہیں' بہر حال میرے پاپا حائقہ پھپھ
جاننے والوں میں سے ہیں اور پھر حویلی والوں کے ساتھ بھی ان کے نجی گہرے مراسم تھے۔"

"آئی سی' کیا اب آپ مستقل یہیں رہیں گی......؟"

اُس نے پھر پوچھا تھا' جب وہ گہری سانس خنک فضاء کے سپرد کرتے ہوئے بولی۔

"پتہ نہیں' آنے والے وقت کے بارے میں کوئی بھی حتمی طور پر کیا کہہ سکتا ہے

تفسیر ابھی اُس سے مزید گفتگو کرنا چاہتا تھا' مگر اسی اثناء میں ازہان کسی کام سے لاؤنج سے باہر آیا
اُسے سبرینہ کے قریب بیٹھے دیکھ کر اُس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔
گیٹ کی طرف بڑھتے قدم خود بخود گھوم کر اُن کی طرف مڑ گئے تھے۔

"تم کب آئے......؟"

سبرینہ پر نگاہ غلط ڈالے بغیر اُس نے تفسیر سے ہاتھ ملایا تو وہ خوشدلی سے مسکراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی آیا ہوں یار' تم نے بتایا ہی نہیں کہ تمہاری کوئی اتنی کیوٹ سی کزن بھی ہے......"

اب کے اُس نے ذرا سی گردن موڑ کر سبرینہ پر نگاہ ڈالی تھی' جو سر جھکائے خاموش کھڑی بے حد
اس لگ رہی تھی۔

"اندر چلو' ذرین کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے......"

اُس کی بات سے قطعی لاتعلقی برتتے ہوئے وہ تفسیر کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر لاؤنج کی طرف گھسیٹنے لگا
سبرینہ اُس کی اِس اداء پر دُکھ سے مسکراتے ہوئے پھر خود بھی وہاں سے اُٹھ کر اندر چلی آئی۔

♦ ♦ ♦

یارب تیرے جہان میں دل ٹوٹتے ہیں کیوں؟
ساتھی وفا کی منزلوں سے چھوٹتے ہیں کیوں؟
گو یہ تیرے حضور مجسم سوال ہے
سادہ دلوں کو پیار سے سب لوٹتے ہیں کیوں

پورے تین دن وہ اس الجھن کا شکار رہی تھی کہ آیا اسے اسفند شیرازی کے آفس میں اس کے ر
رہ کر کام کرنا چاہئے یا نہیں؟

پورے تین دنوں تک وہ اپنا یہ درد اپنا یہ راز اپنے ہی دل میں چھپائے پھرتی رہی تھی۔ ویسے بھی
میں آج کل احتشام بھیا کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں خاصی مصروفیات چل رہی تھیں لہٰذا اس
ڈیپریشن کا کسی نے بھی کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

بلا آخر تین دن تک خوب سوچ وبچار کرنے کے بعد چوتھے روز وہ آفس چلی آئی تھی۔ اس کے
پرآفس کی طرف سے کئی بار فون آ چکا تھا۔ پھر جس جاب کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اتنی مشکل
اپنے بزرگوں کو منایا اب اسی جاب کو بغیر کسی ٹھوس کی وجہ کے یوں اچانک آسانی سے چھوڑ دینا ا

ب نہیں لگ رہا تھا لہٰذا خود کو سمجھا کر بجھا کر بلا آخر اس روز وہ آفس چلی آئی تھی۔

آفس میں ابھی وہ اپنی دوست فری سے اپنی طبیعت کے متعلق بات چیت ہی کر رہی تھی جب ا
زی نے اسے اپنے کیبن میں طلب کر لیا۔ دل کی دھڑکنیں ایک بار پھر منتشر ہوئی تھیں۔

لیکن اب وہ پہلے سا خوف اس کے اندر کہیں نہیں رہا تھا۔ لہٰذا مکمل اعتماد سے چلتی ہوئی وہ اس
ن تک آئی تھی۔ اندر اسفند شیرازی اپنے سیل پر کسی سے خاصے خوشگوار انداز میں گپ شپ لگا رہا
چند سیکنڈز تک اس کے فری ہونے کا انتظار کرنے کے بعد بلا آخر وہ خود ہی کرسی گھسیٹ کر اس
نے براجمان ہو گئی تھی۔ اسفند شیرازی نے اس کی اس حرکت کو قدرے اچھنبے سے دیکھا تھا۔

''مس ثمرن میرا خیال ہے کہ آپ ابھی تک ادب تہذیب کے آداب سے قطعی ناواقف ہیں
ی ہی دیر میں اپنا سیل آف کر کے وہ مکمل سنجیدگی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''سوری سر الحمد للہ مجھے میرے گھر والوں نے تمام آداب بخوبی سکھائے ہیں لیکن آپ چونکہ
یات کا درس بھول گئے تھے لہٰذا مجبوراً مجھے اپنی حیثیت بھول کر بدتہذیبی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔''

اس بار وہ مزید چونکا تھا اتنا بااعتماد اور فرینک انداز بھلا آج سے پہلے کب کسی نے ایسی بہادری
مائی تھی۔

''آپ غالباً بھول رہی ہیں کہ اس وقت آپ کس سے مخاطب ہیں۔''

''میں اتنی ضروری باتوں کو کبھی فراموش نہیں کیا کرتی سر اور آپ سے مخاطب ہو کر اپنی حیثیت کو
نا تو ویسے بھی ممکن نہیں ہے۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ گزرے ہوئے وقت نے آپ کو بدل دیا ہو آپ
ب کس سے کیسے مخاطب ہونا ہے یہ بھلا دیا ہو کیا خیال ہے؟''

اس کے خوبصورت لبوں پر خاصی دلفریب مسکراہٹ تھی وہ شاکڈ انداز میں یک ٹک اسے دیکھتا ر
تھا۔ سامنے بیٹھی یہ لڑکی واقعی فراموش کئے جانے کے قابل نہیں تھی۔

♦ ♦ ♦

تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو
کون سے دکھ کی کریں بات ذرا بتلاؤ
موسموں سرد ہواؤں کی مسیحائی کا دکھ
راہ کی دھول میں بکھری ہوئی سیاہی کا دکھ
سنگ کے شہر میں خود سے شناسائی کا دکھ
یا کسی بھیگتی برسات میں تنہائی کا دکھ
کون سے دکھ کی کریں کہ دل کا دریا
اپنی طغیانی پر ہے کچھ بھی اب تو یاد نہیں

کب ہمیں بھول گیا' کون سے ہرجائی کا دکھ
تم تو بس ایک ہی دکھ پوچھتے ہو

سلیپنگ پلز زیادہ تعداد میں کھانے کی وجہ سے اس کی زندگی کی ناؤ' شدید خطرے کی لپیٹ میں تھی۔ گو ابھی سانس کی ڈوری نہیں ٹوٹی تھی۔ ڈاکٹرز نے اس کا معدہ بھی فوراً واش کر دیا تھا۔ مگر باوجود اس کی زندگی تاحال خطرے میں تھی۔

پچھلے دو تین روز سے چونکہ سلمان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' گزرتے ہر دن کے ساتھ اس کی تیزی سے ڈاؤن ہو رہی تھی۔ لہٰذا آج وہ اپنی تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال کر اسے اپنے قریبی ڈاکٹر سعد کے پاس ہوسپٹل میں لے آیا تھا۔

یہ ایک اتفاق تھا' لیکن اس اتفاق میں۔ اس کا ٹکراؤ نازیہ شیرازی کے والد صاحب سے ہوا اس کے قریب ہی کوریڈور میں' لکڑی کے بینچ پر بیٹھے جانے کن سوچوں میں گم تھے۔

''ارے انکل...... آپ یہاں...... خیریت تو ہے ناں......؟''

تفکر اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا' تبھی انہوں نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف تھا۔

''ہاں...... وہ...... وہ نازیہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔''

ان کی طرح ان کا لہجہ بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ سنوان ہمدانی نے اس لمحے قدرے دلگرفتگی کی تھی۔

''کیا ہوا انہیں ؟ زیادہ سیریس مسئلہ تو نہیں؟''

اس کے اس سوال نے حبیب صاحب کو قدرے الجھا دیا تھا۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دکھ شیئر کرنے کے لئے اس ہمدرد اجنبی شخص پر اعتبار کریں یا نہ کریں کہ جس نے ابھی ان کی بہت کم ہوئی تھی۔

''انکل...... پلیز بتائیے ناں...... آخر نازیہ صاحبہ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''

ان کے قریب ہی بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے اصرار کیا' تو حبیب صاحب مزید اپنا دکھ دبا نہ لہٰذا سر جھکا کر قدرے افسردگی کے عالم میں بولے۔

''میں اور نازیہ کی ماں' دونوں اس کا بیاہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ لیکن...... وہ ایسا چاہتی...... ساری عمر یونہی بے نام رہنا چاہتی ہے وہ اسی لئے کل رات خودکشی کی ناکام کوشش کی اس نے......''

''وہاٹ......'' سنوان ہمدانی کی آنکھیں اس ایک لمحے میں حیرانگی سے پھیل گئی تھیں۔

''بس بیٹے بہت ضدی ہو گئی ہے نازو' کسی کی نہیں سنتی۔''

اب کے حبیب صاحب کی آنکھوں میں' ہلکی سی نمی کا عکس چھلکتا دکھائی دیا تھا۔

''لیکن...... وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟''

سنوان ہمدانی کی حیرانگی کا گراف اب بھی نیچے نہیں آیا تھا۔ حبیب صاحب ابھی جواب میں اسے کچھ بتانے ہی والے تھے کہ صائمہ تیز تیز چلتی ان کے قریب پہنچ گئی۔

''بابا...... آپی کو ہوش آ گیا ہے۔''

''یا اللہ...... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

صائمہ کی زبانی یہ فرحت افزاء خبر سننے کے بعد انہوں نے فوراً شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔ سنوان ہمدانی بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میرا خیال ہے۔ میں بھی ایک نظر دیکھ لوں انہیں۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ حبیب احمد صاحب اور صائمہ شیرازی کے ہمراہ چلتا' نازیہ شیرازی کے کمرے تک چلا آیا۔ جہاں وہ سفید بستر پر' بے سدھ سی پڑی اب رو رہی تھی۔

عائشہ بیگم اس کے سرہانے بیٹھیں' بہت محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھیں۔

''آئی ایم سوری بابا۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔''

اس کی نظر جونہی حبیب صاحب کے ستے ہوئے چہرے پر پڑی' وہ پھر سے سسک اٹھی۔

آنسو لٹا لٹا کر اس کی آنکھیں جیسے اب ایک دم سے ویران ہو رہی تھیں۔ تبھی حبیب صاحب بھی اپنا ضبط کھو بیٹھے تھے۔

''آئندہ ایسا مت کرنا بیٹی' اگر تجھے کچھ ہو گیا تو تیرا یہ بوڑھا باپ تجھ سے پہلے موت کی بانہوں میں جا سوئے گا۔''

اپنی دونوں ہی بیٹیوں سے وہ بہت زیادہ پیار کرتے تھے' مگر نازیہ کے ساتھ ان کا لگاؤ کچھ زیادہ تھا اور یہ بات خود نازیہ شیرازی سے بھی مخفی نہیں رہ سکی تھی۔ لہٰذا وہ کتنی ہی دیر تک ان کا ہاتھ تھامے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی تھی۔

کمرے میں اس وقت صرف اسی کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ تبھی سنوان ہمدانی نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔

''ایکسکیوزمی مس نازیہ' اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔''

اس کی موجودگی سے یکسر غافل نازیہ شیرازی نے قدرے چونک کر اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

''م...... میں ٹھیک ہوں آپ یہاں کیسے؟''

لمحے سے قبل خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ سرسری سی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

''مانی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے چیک کروانے لایا تھا یہاں کہ انکل جی سے ملاقات ہوگئی۔''

''او لیکن مانی کو کیا ہوا ہے؟''

اس ننھے سے معصوم فرشتے کے لئے' یکلخت ہی اس کی محبت پھر سے بیدار ہوئی تھی۔ تبھی پریشانی سے اس کے متعلق دریافت کیا' تو سنوان نے اسے بتایا۔

''کچھ خاص نہیں' پچھلے کچھ دنوں سے ٹمپریچر جان نہیں چھوڑ رہا۔ میں لاتا ہوں اسے آپ کے پاس۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا' اس کے روم سے باہر نکل گیا تو نازیہ شیرازی نے پھر سے پلکیں موند کر سر تکیے پر ٹکا دیا۔

♦ ♦ ♦

کہواب کیا کہوں تم سے' بتاؤ کیا کہوں تم کو
مجھے تمہید دو کوئی' مجھے اُمید دو کوئی
نیا اک لفظ ہو کوئی
جہاں سے بات چل نکلے' میری مشکل کا حل نکلے
بتاؤ لہجہ کیسا ہو کہ تم سے بات کرنی ہے
مجھے تھوڑا اجالا دو' بسر اک رات کرنی ہے
تم اپنی روشن آنکھوں کو اگر کھولو تو میں لکھوں
کہواب کیا ارادہ ہے
مجھے اظہار کرنا ہے کہ بے تابی زیادہ ہے

اپنی خوبصورت نگاہوں میں حد درجہ حیرانگی اور قدرے خوف بھرے و عجیب معصوم سے انداز میں ٹکٹکی باندھے وہ ٹکر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو' جب کہ عمر عباسی کے لب اس کی اس ادا پر بڑے دلچسپ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

''آ...... آپ......؟''

بلآخر وہ اسے پہچاننے میں کامیاب ہوگئی تھی' تبھی عمر اپنے بے ساختہ جاندار قہقہے کا گلا نہ گھونٹ سکا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے عین قریب لے آیا۔

''تھینک گاڈ کہ آپ نے پہچان لیا۔ ویسے خاکسار کو عمر عباسی کہتے ہیں' اپنے والدین کا اکلوتا ہونہار ہوں' یہ اور بات کہ اب وہ حیات نہیں رہے' بہر حال آج آپ کے قدم ہماری دہلیز پر پڑے' یقین کریں یوں لگتا ہے جیسے ساری کائنات رنگین ہوگئی ہے۔''

وہ بولنے پر آیا تو پھر بولتا ہی چلا گیا' جب کہ سنعیہ کی سانسیں تو جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھیں۔

''آپ اتنی گھبرا کیوں رہی ہیں۔''

وہ یقیناً اس کی گھبراہٹ اور عدم توجہ پر شدید کوفت کا شکار ہوا تھا۔ تبھی قدرے ناراضی سے بولا تو سنعیہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''پ...... پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں' مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی' پلیز......''

وہ از حد روہانسی ہوگئی تھی' عمر کے لئے یہی بات از حد حیرانگی کا باعث بنی تھی' تبھی وہ قدرے الجھتے ہوئے بولا۔

''بٹ وائے' دیکھیں آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں' پچھلے تین ماہ سے میں آپ کے لئے خوار ہو رہا ہوں اور آپ ہیں کہ ایک نظر دیکھنا تک گوارہ نہیں کر رہیں' اپنا نام تک نہیں بتایا آپ نے' میں اسے کیا سمجھوں؟ آپ کی بے رخی یا مجبوری۔''

''آپ کو جو سمجھنا ہے' آپ سمجھ لیں' مگر یہاں سے چلے جائیں پلیز۔''

اس بار وہ واقعی رو پڑی تھی' مگر اس سے پہلے کہ عمر اس سے اس کے رونے کی وجہ دریافت کرتا' پنکی اسے ڈھونڈتی ہوئی' کچھ ہی لمحوں میں اس کے سر پر پہنچ گئی۔ جس پر سنعیہ کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ عمر کے لئے یہ سب سچویشن از حد حیرانگی کا باعث تھی۔ چونکہ پنکی کی طرف اس کی پشت تھی' لہٰذا وہ اسے نہیں دیکھ سکا تھا' البتہ اس کی کڑک آواز ضرور سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''او...... تو یہاں محترمہ چھپ چھپ کر گلچھرے اڑانے کی کوشش کر رہی ہیں' میں بھی کہوں یہ آدم بیزار لڑکی' آخر گئی کہاں؟''

لمحے کے ہزارویں حصے سے قبل تمام صورت حال عمر کی سمجھ میں آ گئی تھی' تبھی وہ ہوشیاری سے پلٹ کر پنکی کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''محترمہ شرم کرو کچھ...... یہاں میں اس معصوم مخلوق سے تمہارے متعلق پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا' الٹا تم اسی کے کردار پر شک کر رہی ہو۔''

اس کے الفاظ سے لگتا تھا جیسے پنکی کے ساتھ اس کی گہری شناسائی ہو' تاہم پھر بھی اس نے اپنی پوزیشن کلیئر ہو جانے پر سکون کا سانس لیتے ہوئے' ممنون نگاہوں سے عمر کی طرف دیکھا تھا۔ پنکی کو اندازہ نہیں تھا کہ سنعیہ اس وقت عمر کے پاس بیٹھی ہوگی' یا عمر اس کیلئے اتنے ''پیارے'' الفاظ استعمال کرے گا' تبھی شاید گڑبڑا کر وضاحتی لہجے میں بولی۔

''او سوری...... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں بیٹھے ہو' ویسے میرے بارے میں اس معصوم چڑیل سے کیا پوچھ رہے تھے تم۔''

عمر کو اس کے الفاظ قطعی پسند نہیں آئے تھے' مگر پھر بھی وہ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے [illegible]

[illegible]

"کچھ خاص نہیں، بس یہی پوچھ رہا تھا کہ پنکی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟ پنکی نے پہلے کبھی آ
کا ذکر کیوں نہیں کیا، وغیرہ وغیرہ......"

"تمہاری اس وغیرہ وغیرہ میں میرا تذکرہ کہاں ہے؟ یہ سب سوال تو سنعیہ سے متعلق ہیں۔"

حسب توقع وہ اچھی خاصی چڑ گئی تھی، تبھی وہ لطف لیتے ہوئے بولا۔

"سنعیہ...... یہ سنعیہ کون ہے بھئی؟"

"زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے، اب چلو یہاں سے۔"

اسے بازو سے پکڑ کر زبردستی کھینچتے ہوئے وہ وہاں سے لے گئی۔ تو عمر نے جاتے جاتے یوں م سامنہ بنا کر اس کی طرف دیکھا کہ بے ساختہ سنعیہ غیاث کے لب مسکرا اٹھے۔

جانے کیوں وہ اسے دوسرے عام، سطحی سوچ کے حامل مردوں سے بہت مختلف لگا تھا۔ تم جانے کتنی ہی دیر تک اکیلی بیٹھی، خیالوں ہی خیالوں میں اس کی پرکشش شخصیت کے متعلق سوچتی رہی کچھ ہی دیر کے بعد کیک کٹنے لگا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسز ہمدانی کے بلانے پر ان کی طرف چلی آئی۔

"سنعیہ غیاث...... بیٹی! صبیحہ بتا رہی تھی کہ تم، کہیں آتی جاتی نہیں ہو، لوگوں سے گھلنا ملنا تمہیں نہیں ہے یہ سب اچھا نہیں ہے بیٹے، اس طرح تو تم سب سے کٹ کر رہ جاؤ گی۔"

سنعیہ کو ان کے الفاظ پر ہنسی آ رہی تھی، مگر اس نے اپنی سوتیلی ماں کے جھوٹ کا پول نہیں کھو دھیمے سے مسکراتے ہوئے خاموش رہنے میں عافیت جانی۔ تاہم اس سے پہلے کہ مسز ہمدانی اس س کچھ کہتیں، عمر چپکے سے آنکھ بچا کر ان کے قریب چلا آیا۔ بے شک آج وہ بے حد خوش دکھائی د تھا۔

"آنٹی...... میں کیک کاٹ رہا ہوں، پلیز آیئے ناں۔"

مہمان چونکہ لیٹ ہو رہے تھے لہٰذا مسز ہمدانی فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس ٹیبل کی بڑھ گئیں جہاں بڑا سا کیک، خوب سجا بنا کے کینڈلز کے حصار میں رکھا ہوا تھا۔ مسز ہمدانی کے ساتھ اس نے سنعیہ کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا تھا۔ بلا کا خود اعتماد اور بولڈ لڑکا تھا۔

کیک کٹنے کے بعد جب سبھی مہمانوں کو ڈنر کے لئے مدعو کیا گیا، تو سنعیہ نے بھی وہاں سے کھسک میں ہی عافیت جانی، مگر عمر بے حد چالاک تھا۔ وہ پہلے ہی اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا، لہٰذا جونہی ا رخ پھیرنا چاہا، عمر نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

اس کا لہجہ سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھا، سنعیہ کا پورا وجود جیسے پسینوں میں نہا گیا تھا۔

"پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔"

وہ لمحوں میں روہانسی ہوئی تھی، جب کہ عمر عباس نقوی نے اس کی حالت سے لطف اٹھایا تھا۔

"یہ ہاتھ چھوڑنے کے لئے نہیں تھاما، مس سنعیہ۔"

"پلیز...... کوئی دیکھ لے گا۔"

اس کی جان نکل کر جیسے لبوں پر آ گئی تھی مگر عمر عباس نقوی نے مطلق پروا نہیں کی۔

"سو واٹ؟ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے، آپ کیوں میرا تماشہ بنا دینا چاہتے ہیں۔"

نمی کے ساتھ ساتھ اس بار اس کے لہجے میں غصہ بھی عود آیا تھا، جسے وہ قطعی نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔

"کسی کی مجال ہے جو تمہارا تماشہ بنائے، میں تمہارے لئے ساری دنیا سے ٹکر لے سکتا ہوں۔"

تکلف کی آخری دیوار بھی بلا آخر اس نے گرا دی تھی، تبھی وہ جیسے سسک اٹھی۔

"آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں۔"

"محبت...... صرف اور صرف سچی محبت......"

کہتے ہوئے اس نے بغور سنعیہ کی آنکھوں میں جھانکا تھا، جب وہ نگاہیں چرا کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"سوری...... میں آپ سے محبت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔"

"کہہ سکتی ہو، مگر ہمارے دل نے آپ کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے اور ہم نے آج تک کبھی دل کی کسی فرمائش کی ٹالا نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں سرشاری ہی سرشاری تھی۔ مگر سنعیہ کا خون اب بھی خشک ہو رہا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ مزید اس سے کوئی التجاء کرتی۔ پنکی ایک مرتبہ پھر اس کی طرف چلی آئی۔

"یہ کیا عمر...... تم پھر اس معصوم مخلوق کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو، چلو آؤ، وہاں میری دوستیں تم سے ملنے کے لئے بے قرار کھڑی ہیں۔"

بڑے استحقاق سے اس کا بازو تھامتے ہوئے پنکی نے کہا تو سنعیہ اس نادر موقع کا فوری فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے کھسک آئی۔

اس کی کلائی پر عمر عباس نقوی کی مضبوط گرفت کا لمس، جیسے اب بھی موجود تھا۔ دل کی منتشر دھڑکنیں خوب اچھل اچھل کر اس کے حواس معطل کر رہی تھیں، زندگی میں پہلی بار کسی کی چاہت نے اس کے دل میں چٹکی کاٹی تھی، اور پہلی بار اس کا ذہن مسلسل کسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور پہلی بار کسی کی حسین رفاقت کے خواب اس کی آنکھوں میں آ بسے تھے۔

لیکن ابھی وہ اس مہربان محبت سے جی بھر کر خوش بھی نہ ہو پائی تھی۔ کہ تقریب کے اختتام تک عمر کو پنکی کے سنگ ہنستے کھلکھلاتے دیکھ کر اس کا خون جل گیا۔

بچپن سے لے کر اب تک وہ اس کا حق مارتی آئی تھی، اس کی پسندیدہ چیزوں کو اس سے چھ توڑتی پھوڑتی آئی تھی لیکن...... اس بار عمر عباس نقوی، کوئی چیز نہیں تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اسے ز کا احساس دلایا تھا، لہٰذا وہ کسی قیمت پر اسے پنکی کی جھولی میں پھینکنے کو تیار نہیں تھی۔ تبھی گھر آ کر بھی ا آنکھیں، وقفے وقفے سے برسات لٹاتی رہی تھیں۔

• • •

محبت کا انوکھا قافلہ ہے
کہ اس کا ہر مسافر ہی لٹا ہے
تعلق جوڑنا اچھا ہے کتنا
تعلق توڑنا کتنا برا ہے
جدائی رتجگا، کرب مسلسل
چلو تم نے ہمیں کچھ تو دیا ہے

"سارہ...... اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی موجودگی میں، اتنی رونق کے باوجود، حویلی کے درو میں کس قدر سناٹا ہے۔ ہے ناں؟"

بلیک کریپ کے سوٹ میں ملبوس، سیاہ ریشمی قدرے گھنگھریالے بال پشت پر پھیلائے، وہ قد کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی تو سارہ کے لبوں سے بھی طویل سرد آہ خارج ہو کر رہ گئی۔ دونوں وقت سب سے بے نیازی برتتے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھیں تھیں، جہاں قدرے ملگجا سا اندھیرا تھا۔

حویلی میں مدعو کئے گئے تمام مہمان، اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔ کسی کو کسی کی پروا تھی۔ ذرنشا فل تیاری کئے، ازہان کے ساتھ ساتھ ہی پھر رہی تھی اور یہ بات سبرینہ کا جگر کاٹ رہی تھی وہ سارہ کے ساتھ، سب سے الگ تھلگ ہو کر یہاں تاریک سیڑھیوں پر آ بیٹھی تھی۔

سارہ اب قدرے اداس موڈ کے ساتھ اسے کچھ بتا رہی تھی۔

"پتہ ہے سبی...... برسوں پہلے اس حویلی میں، صرف احسن ماموں اور بیہ آنٹی کے قہقہے گ کرتے تھے۔ مما، احسن ماموں، بیہ آنٹی...... یہ تینوں ہی تو اس وسیع و عریض حویلی کی رونق تھے۔ نانی کسی مہارانی کی طرح، خوش باش، گاؤں کی ڈھیروں عورتوں کے بیچ اپنے خوشحال گھرانے کے قصے سناتیں اور نانا ابو، احسن ماموں کو سنگ سنگ لئے، فخر سے سینہ پھلائے، پورے گاؤں میں گھومتے پھر ست محض خوشی کا راج تھا، مما کی شادی کے بعد اسی حویلی کی انیکسی میں رہنے کی خواہشمند تھیں، مگر خودداری نے یہ قبول نہ کیا اور یوں وہ دل مسوس کر، ان چاہتوں اور خوشیوں سے مجبوراً دور ہو گئیں لیکن کے بعد بھی احسن ماموں کی شرارتوں اور بیہ آنٹی کی الٹی سیدھی بچگانہ حرکتوں نے اس حویلی میں نہیں اترنے دیئے تھے بس...... مما کے بعد بھی اس حویلی کی رونق سلامت رہی تھی لیکن......" کہے

وہ اچانک رک گئی تو سبرینہ بھی چونک اٹھی۔

"لیکن کیا سارہ...... پلیز بتاؤ ناں، پھر کیا ہوا؟"

اس کے لہجے میں گہرا اضطراب تھا، جس پر سارہ توجہ نہیں دے سکی تھی، تبھی اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولی۔

"پھر...... پھر جانے کیوں بیہ آنٹی کو برہان انکل کے پیار میں الجھ گئیں، چپکے ہی چپکے وہ محبت میں اتنی آگے چلی گئیں کہ ان کے لئے پیچھے پلٹنا ہی ناممکن ہو گیا، برہان انکل وقتاً فوقتاً مختلف کاموں کے سلسلے میں حویلی آتے رہتے تھے، لہٰذا بیہ آنٹی نے انہیں چپ چاپ اپنے دل میں بسا لیا، تاہم اس کے بعد پتہ ہے کیا ہوا؟"

اپنی ہی رو میں بولتے ہوئے وہ اسے بے حد اداس دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا ہوا سارہ، بتاؤ ناں پلیز۔"

سبرینہ کے لہجے میں بے قراری اس بار اس سے مخفی نہیں رہ سکی تھی، لہٰذا وہ ایک سرسری سی نگاہ اس کے خوبصورت سے چہرے پر ڈالتے ہوئے وہ پھر سے مدھم لہجے میں بولی۔

"محبت کی اس آگ نے بیہ آنٹی کو اندر ہی اندر سے جلا ڈالا تھا سبی، وہ سسک سسک کر زندگی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے موت کی آغوش میں جا سوئیں۔"

ایک آنسو بہت چپکے سے اس کی آنکھوں سے پھسل کر ہونٹوں پر آ رکا تھا۔

"یہ حویلی میں جو سناٹا تم محسوس کر رہی ہو ناں سبی، یہ سناٹا، بیہ آنٹی کی کربناک موت کی نشانی ہے۔ اس حویلی کے در و دیوار آج بھی ان کی جواں سالہ موت کا ماتم مناتے ہیں، غور سے سنو سبی، تمہیں یہیں کہیں، آس پاس ہی ان کی سسکیوں کی صدا سنائی دے گی۔"

سبرینہ حسن کے لئے یہ روداد بالکل نئی تھی۔

کیسا عجیب سا دکھ رقم تھا سارہ کے حسین چہرے پر، وہ یک ٹک افسردگی سے اس کے لڑھکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ یہ وہ عنوان تھا جسے اس کے پاپا نے کبھی اس کے ساتھ ڈسکس نہیں کیا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"ایسا کیوں ہوا سارہ......؟ کیا بیہ آنٹی برہان انکل کو پا کر بھی خوش نہیں رہ سکیں؟"

"آہ...... ان کی شادی ہی کہاں ہوئی تھی برہان انکل کے ساتھ۔"

اب کے ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے سارہ کے اداس لبوں کا احاطہ کیا تھا، جب کہ وہ بری طرح سے چونک اٹھی تھی۔

"وہاٹ...... برہان انکل سے شادی کیوں نہیں ہوئی ان کی؟" سارہ اب بھی پھیکے سے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''کاتب تقدیر نے ایسا ہی نصیب لکھا تھا ان کا' برہان انکل کے پاپا نے جب بیہ آنٹی کا رشتہ ا ساتھ میں اپنی اکلوتی بیٹی سانیہ کی نسبت احسن ماموں سے طے کردی' سبھی اس فیصلے سے خوش تھے' ہر طر جیسے بہاریں اتر آئی تھیں' نانی اماں اور نانا ابو بڑے جوش وخروش سے اپنے بچوں کی شادی کی تیاریوں م مصروف تھے کہ اچانک جیسے سب کچھ فنا ہو کر رہ گیا' اپنی شادی سے فقط ایک ہفتے قبل احسن ماموں' تمہا مما کا ہاتھ تھام کر یہاں' پاکستان چلے آئے۔ بیہ آنٹی ان دنوں گلاب کے مہکتے تازہ پھول کی مانند' مہکتی' تتلی بن کر حویلی میں گویا اڑتی پھرتی تھیں' مگر...... احسن ماموں نے ان سے ان کی تمام مسکراہٹیں پہلے خواب چھین کر' انہیں آنسوؤں کا سمندر تھما دیا۔ انہوں نے اپنی محبت کو اپنا کر سانیہ آنٹی کے ساتھ شا کرنے سے صاف انکار کردیا میں بتا نہیں سکتی سبی کہ ان دنوں اس حویلی پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی' مما اب ان دنوں کا تذکرہ کرتی ہیں تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی ہیں۔''

سارہ کی آنکھوں میں اب بھی آنسو تھے' جب کہ وہ گویا سانس روکے اس کی روداد سن رہی تھی۔

''احسن ماموں نے محض اپنی محبت کو پانے کے لئے اور بہت سی محبتوں کا گلہ گھونٹ دیا تھا۔ بر انکل ان کے اقدام سے شدید ہرٹ ہو کر ملک سے باہر چلے گئے اور یوں یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔''

یہاں تک پہنچ کر سارہ کی آواز رندھ گئی تھی' تاہم اس نے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

''اس حویلی کو محبت راس نہیں آتی ہے سبی...... بہت اذیت اٹھائی تھی بیہ آنٹی نے' سب نے سمجھایا انہیں' اچھے سے اچھے رشتوں کی لائینیں لگی تھیں' مگر...... انہوں نے برہان انکل کو کھو دینے کے اگر اپنایا' تو صرف موت کو...... اسی لئے یہ حویلی سناٹوں میں ڈوبی رہتی ہے۔''

اب کے سارہ نے اپنی آنکھوں سے پھسلتا آنسو انگلی کی پور پر اتار کر جھٹک دیا تھا۔ جب کہ سبی چپ چاپ بیٹھی سسک رہی تھی۔ اس کا دل یکلخت ہی پھٹ جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ جانے کس ضبط کے میں سارہ کے قریب سے اٹھ کر وہ اوپر اپنے کمرے کی طرف بھاگتی تھی کہ بیچ راہ میں ہی کسی کے فو وجود سے ٹکرا گئی۔

''یا وحشت...... تمہاری آنکھیں سلامت ہیں یا ویسے ہی ہر بار مجھ سے ٹکرانا فرض کرلیا ہے تم ن نگاہوں کے عین سامنے کھڑے خوبرو سے ازہان احمد کی موٹی موٹی غلافی آنکھوں میں ایک ع سی وحشت کا عکس چھلکتا دکھائی دے رہا تھا' سو اس نے اپنے آنسو چھپانے کی غرض سے فوراً نگاہیں لیں۔

''سوری میں اپنے دھیان میں نہیں تھی۔''

بڑے آرام سے اس نے اپنی غلطی تسلیم کرلی تو ازہان بھی ایک سرسری سی نگاہ ڈالنے کے بعد دھپ کرتا۔ آگے بڑھ گیا' جب کہ وہ جیسے وہیں جم کر رہ گئی تھی۔

''سبی...... آر یو آل رائیٹ۔'' سارہ جانے کب اس کے قریب چلی آئی تھی۔

''ہاں۔'' اپنے آنسو پیتے ہوئے اس نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''شکر خدا کا...... اس جنگلی انسان سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ تم پر ہاتھ بھی اٹھا دیتا۔''

سارہ کا لہجہ اپنے ہی سگے بھائی کے لئے حد درجہ درشتگی لئے ہوئے تھا' تبھی وہ حیرانگی سے اس کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

''بہت ان مینرڈ ہیں یہ...... کسی کی تمیز نہیں کرتے' حمدان بھیا جتنے اچھے ہیں' یہ اتنے ہی سڑیل اور ہیں اور ابھی تمہاری جگہ میں ہوتی' تو ایسا تھپڑ لگاتے کہ ساری عمر یاد رہتا۔''

سارہ اس سنگدل کے بارے میں اور بھی نجانے کیا کچھ بتاتی رہی تھی اسے مگر اس کی سماعتیں تو جیسے ہان سی ہو رہی تھیں' آنکھوں کے ساتھ ساتھ پورے بدن میں بھی ایک عجیب سی جلن' دہکنے لگی تھی۔

♦ ♦ ♦

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے بادلوں نے فضا میں خوشگوار سی ٹھنڈک رکھی تھی۔ چھٹی کا دن تھا لہٰذا شہروز اور فائزہ بڑے مزے سے لان میں سکواش کھیل رہے تھے۔ جب اس نے جاب سٹارٹ کی تھی' شہروز اس سے کچھ خفا خفا سا رہنے لگا تھا' لہٰذا آج کل بات بے بات ہی کا دل بھر آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں پڑی پڑی بور ہو رہی تھی' لہٰذا بستر سے نکل کر' فریش ہونے کے وہ سیدھی لان کی طرف چلی آئی' جہاں فائزہ اور شہروز کا زبردست مقابلہ جاری تھا۔ لان سے ملحقہ رے کے ستون سے ٹیک لگائے' دونوں ہاتھ سینے پر باندھے' وہ خاصی دلچسپی سے ان کی گیم دیکھ رہی ا۔ شہروز اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی ا۔

''ہائے ثمرن...... آؤ ناں پلیز' تم بھی کھیلو۔''

فائزہ کی نظر جونہی اس پر پڑی' وہ کھیل روک کر اسے دیکھتے ہوئے چہکی' تاہم ثمرن نے نہایت ولت سے اسے انکار کردیا۔

''تھینکس گڑیا' آپ دونوں کھیلو' مجھے آفس کا تھوڑا سا کام کرنا ہے۔''

شہروز کا اجنبی پن اسے دکھی کر رہا تھا' لہٰذا ضبط سے ہونٹ کاٹتے ہوئے' دھیمے سے مسکرا کر اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف واپس چلی آئی۔ تبھی شہروز نے چور نگاہوں سے اس کے ستے ستے سے رمال چہرے کو دیکھا اور پھر خود بھی ریکٹ پھینک کر اس کے پیچھے اندر لاؤنج میں چلا آیا۔

''کیا بات ہے اتنی اداس کیوں ہو تم؟''

وہ لاؤنج میں ابھی صوفے پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ شہروز کے تیز لہجے میں پوچھے گئے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''مجھ سے کچھ پوچھا ہے آپ نے؟''

آہستہ سے نظریں اٹھا کر ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے اس نے پوچھا تو شہروز اچھا خاصا چڑ گیا

''جی جناب' آپ ہی سے مخاطب ہونے کی جسارت کی ہے' وگرنہ یہاں کوئی جن بھوت جن سے بات کروں گا میں۔''

''سوری...... وہ ایکچولی...... آپ غالباً' ناراضگی میں مجھ سے بات نہ کرنے کی قسم کھائی ہو مزے سے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے وہ لبوں پر مسکراہٹ پھیلا کر' اسے مزید ستا سے بولی تو شہروز اس کے الفاظ پر جیسے کڑھ کر رہ گیا۔

''ہاں' تمہیں تو جیسے بڑی پروا ہے ناں میری ناراضگی کی' میں جیوں یا مروں' تمہاری بلا سخت خفگی کے انداز میں وہ بولا تو ثمرن بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اف...... تم سے کس پاگل نے کہہ دیا کہ تم غصے میں بہت خوبصورت لگتے ہو؟''

''پلیز شاپ اٹ ثمرن۔''

وہ مسلسل ہنس رہی تھی جب شہروز چڑ کر اسے بے ساختہ ٹوک گیا۔

''تم یوں ہنس ہنس کر' مجھے ٹال نہیں سکتیں' بتاؤ کیوں اتنی ڈیپریس ہو تم آج کل؟''

سامنے بیٹھا وہ شخص اس کو جان لینے پر تلا ہوا تھا' تبھی شاید وہ اپنے آنسوؤں کو بکھرنے سے نہیں پائی تھی۔

◆ ◆ ◆

سرد رویہ الجھا لہجہ
کوئی آنکھیں' ٹھنڈے ہاتھ
بے رنگ چہرہ' بداخلاقی
دیکھو تم بن......
کون ہوں میں

آنکھوں پر بازو دھرے وہ اپنے آنسو اندر ہی اندر گرانے میں مشغول تھی' جب ننھا سا سلمان سنوان کے ہمراہ' چلتے ہوئے اس کے قریب آ رکا۔

''مما۔''

معصوم سے لہجے کی معصوم سی پکار پر ن کر اس نے فوراً اپنے بازو کو آنکھوں سے ہٹا دیا تھا۔

''جی مما کی جان...... کیسے ہو آپ؟''

لیٹے لیٹے ہی بازو پھیلا کر' اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے وہ بولی تو سلمان اس کے سینے سے لگ کر رو پڑا۔

''آپ کو کیا ہوا مما؟ آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟''

چھوٹا سا معصوم چہرہ' از حد نڈھال دیکھائی دے رہا تھا' لہٰذا وہ محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔

''آپ کی مما بہت بری ہے بیٹے...... کسی کو خوشی نہیں دے سکتی۔''

''نہیں...... میری مما بری نہیں ہیں' میری مما تو بہت اچھی ہیں' آپ خود بیمار ہیں' اس لئے مجھ سے ملنے نہیں آئیں ناں۔''

معصوم سے لہجے میں اس کے لئے کوئی گلہ نہیں تھا' تبھی اس کی آنکھیں پھر سے بھر آئی تھیں۔

''اپنی مما سے بہت پیار کرتے ہو ناں۔''

''ہاں۔''

''مت اتنا پیار کرو بیٹے' آپ کی مما کو محبت راس نہیں ہے۔''

اس کی آواز نم تھی۔ تاہم اس وقت اس کا فلسفہ' اس ننھے سے معصوم بچے کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا لہٰذا وہ چپ چاپ اس کے سینے سے لگا' اس کی بے لوث محبت کی خوشبو اپنے اندر اتارتا رہا۔ کمرے میں اس وقت' سنوان ہمدانی اور عائشہ بیگم ہی رہ گئیں تھیں۔ حسیب صاحب عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئے تھے۔ جب کہ صائمہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا بنانے کی غرض سے گھر چلی گئی تھی۔

''مما...... آج میں یہیں آپ کے پاس سو جاؤں۔''

نازیہ محبت سے سلمان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی' جب س نے معصومیت سے سوال کیا' جواب میں اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی سنوان بول اٹھا تھا۔

''نہیں بیٹے آپ یہاں سو جاؤ گے تو وہاں گھر میں آپ کے بغیر پاپا کو نیند کیسے آئے گی۔''

''تو آپ بھی یہیں سو جایئے ناں پاپا۔''

نازیہ کے سینے سے سر اٹھا کر سرسری سے انداز میں اس نے سنوان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی معصومانہ رائے پیش کی تھی جس پر وہ خاصا جزبز ہو کر رہ گیا تھا۔ چند لمحوں کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

تبھی نازیہ نے سلمان کے چہرے پر اپنائیت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس خاموشی کا گلہ گھونٹ ڈالا تھا۔

''مانی کو آج میرے پاس چھوڑ دیجئے ناں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ سنوان اسے صاف منع نہیں کر پایا تھا۔

''یہ آپ کو ڈسٹرب کرے گا مس نازیہ۔''

دبے دبے سے لہجے میں وہ محض یہی کہہ پایا تھا جب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں' اتنے پیارے بچے کی خوشی کے لئے' اگر ایک رات ڈسٹرب بھی ہونا پڑا تو ہو لیں گے۔"

"او کے اب مجھے اجازت دیجئے' چند ضروری کام نپٹانے ہیں' انشاء اللہ کل آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔"

جلد ہی وہاں سے اٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا' جواب میں نازیہ شیرازی محض اثبات میں سر ہلا کر گئی تھی۔

"اپنا خیال رکھیئے گا مس نازیہ اور سلمان کا بھی۔"

اس کے بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر' آہستہ سے جھکتے ہوئے' اپنے بیٹے کی پیشانی کو چھوا اور اگلے لمحے تیز تیز چلتا اس کے کمرے کی دہلیز عبور کر گیا' تب وہ اپنی ماں کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"آپ اب آرام کر لیں امی' بلکہ بہتر ہے کہ ابھی ابو آئیں تو آپ ان کے ساتھ گھر چلی جا صائمہ اکیلی ہے گھر پر' میں اب سونے لگی ہوں' پھر میری فرینڈز نرسیز بھی ہیں' آپ کو گھر چلے جانا چاہئے"

عائشہ بیگم واقعی بہت تھک گئی تھیں' لہٰذا کافی دیر تک وہاں بیٹھ کر اس پر کئی طرح کے دم کرنے کے بعد حبیب صاحب کے ہمراہ' بلاآخر گھر واپس چلی گئیں۔

"مما...... آج بہت خوش ہوں۔"

کمرے میں تنہائی میسر آتے ہی' ننھے سلمان نے لب کشائی کی تھی' جب وہ مکمل توجہ سے اس طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا...... لیکن کیوں؟"

"کیونکہ آج آپ میرے ساتھ سو رہی ہیں ناں مما...... روز میرے دوست مجھے اپنی اپنی مما باتیں بتاتے ہیں' انہیں رات میں ڈر لگتا ہے تو ان کی مما' ان سے خوب پیار کرتی ہیں' انہیں اپنے پاس سلا ہیں' مزے مزے کی کہانیاں سناتی ہیں' آج میں بھی آپ سے مزے مزے کی کہانیاں سنوں گا۔"

نازیہ تا حال نہیں سمجھ سکی تھی کہ اس معصوم سے بچے کے احساسات میں اتنی پیاس کیوں ہے؟ آ کیوں اس نے یہ یقین کر لیا تھا کہ وہی اس کی حقیقی ماں ہے؟ کیا وہ واقعی ممتا کے لمس سے ناآشنا تھا؟ ا کتنے ہی سوال یک وقت اس کے ذہن میں اٹھے تھے۔

"کیا ہوا مما...... کیا آپ مجھے کہانی نہیں سنائیں گی؟"

اسے خاموشی سے اپنی جانب دیکھتے پا کر بچے نے خاصی معصومیت سے پوچھا تھا۔ جب وہ ساختہ اپنی محویت کے حصار سے نکلتے ہوئے بولی۔

"کون سی کہانی سنو گے آپ؟"

"شہزادے اور شہزادی والی۔" خوش ہو کر بچے نے جھٹ کر فرمائش کر ڈالی تھی۔

"او کے...... تو پھر سنو...... ایک تھا شہزادہ...... بہت پیارا' بہت ہی خوبصورت۔"

درد کی دلدل میں دھنستے ہوئے' وہ اسے کہانی سنانے کے دوران' جیسے دور کہیں کھو کر رہ گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

رات کا تقریباً ایک بج رہا تھا' لیکن سعیہ غیاث کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ صحن میں پڑی رپائی پر لیٹے لیٹے' وہ جانے کب سے اوپر نیلے آسمان پر جگمگاتے چاند اور ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔

اسے یاد تھا' بچپن میں' ایک بار جب اس کی مما بہت بیمار ہو گئی تھیں' تو وہ بہت روئی تھی۔ تب انہوں نے اسے اپنی آغوش میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے کہا تھا۔

"کیوں روتی ہے ثانی......؟ مت رو' تو' تو میری بڑی بہادر بیٹی ہے' یوں اس طرح سے جذبات کے سامنے ہار نہ مان' کیا ہوا جو میں بیمار ہوں' اللہ کی پاک اور بے نیاز ذات تو تیرا خیال رکھنے والی ہے ناں' اس کے پاس جا ثانی' اس سے لو لگا' اس سے مانگ جو تجھے چاہئے وہ کبھی مایوس نہیں کرے گا تجھے۔"

اس وقت وہ کیا کہنا چاہتی تھیں' سعیہ بالکل نہیں سمجھ سکی تھی۔

"تجھے بہت سارا پڑھنا ہے بیٹے' اپنی شخصیت کو دوسروں کے لئے مثال بنانا ہے' زندگی کی چھوٹی ی کٹھنائیوں میں الجھ کر' اپنی زندگی کا مقصد نہ بھول جانا' تیری ماں مر بھی گئی تو اس روگ کو تا عمر سینے سے لگا نہ رکھنا' کیونکہ اس مجبور ماں سے کہیں زیادہ' تجھ سے پیار کرنے والا ہمیشہ ہر حال میں تیرے ساتھ ہے گا۔"

وہ ہمیشہ اسی طرح نہایت سلیقے کے ساتھ اس کی برین واشنگ کیا کرتی تھی۔

"ایسے مت کہو امی' میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

اس وقت اپنی ماں کے مہربان وجود سے لپٹتے ہوئے' بے ساختہ وہ رو پڑی تھی' تبھی وہ اسے بہلانے کی غرض سے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہے تو...... تجھے پتہ ہے مرنے کے بعد انسان کہاں چلا جاتا ہے۔"

"کہاں؟"

"آسمان پر...... وہ اوپر نیلے آسمان پر کتنے ہزاروں ستارے جگمگا رہے ہیں' پتہ ہے ثانی' جب انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ ستارہ بن کر اوپر نیلے آسمان پر جگمگانے لگتا ہے' تاکہ مرنے کے بعد اپنے پیاروں کا حال دیکھ سکے' تیری مما بھی ستارہ بن کر ہمیشہ تجھے دیکھتی رہے گی بیٹے' خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔"

وہ جو بھی کہہ رہی تھیں اس میں سچائی نہیں تھی۔ یہ بات وہ جانتی اور مانتی تھیں' لیکن اس وقت ننھی سی بیٹی کا دل بہلانا اور اس کی ڈھارس بندھانا تھا' سو اسے فرضی کہانی کے سحر میں جکڑتی گئیں۔

سعیہ' ان کی رحلت کے بعد' جب بھی غمگین یا اکیلی ہوتی' وہ فوراً صحن میں آ کر اوپر نیلے آسمان پر

نظریں ٹکا دیتی۔ پھر دل ہی دل میں صدا لگاتی۔

"امی...... پیاری امی...... آپ کہاں ہیں؟ کیا آپ اپنی ثانی کو دیکھ رہی ہیں؟ کیا اس کی آنکھو سے بہتے آنسو دکھائی دے رہے ہیں آپ کو۔"

اور تب جو ستارہ بھی سب سے زیادہ روشن ہوتا ہے' وہ اسے اپنی مما تصور کر لیتی۔

اس فرضی احساس نے زندگی میں کبھی اسے ٹوٹنے نہیں دیا تھا۔ ہر دکھ ہر شکست کے بعد وہ اپنے د کا حال بڑے آرام سے اپنی "ستارہ ممی" سے شیئر کر کے ہلکی پھلکی ہو جایا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نظریں آسمان پر ٹکی' اپنی ستارہ ممی کے وجود کو تلاش کر رہی تھیں کہ اچانک برآمدے میں رکھے ٹیلی فون گھنٹی بج اٹھی۔

رات کو اکثر اس کے پاپا کے لئے فون آتے رہتے تھے' جنہیں دیر تک جاگنے کے باعث وہی اٹینڈ کیا کرتی تھی' لہٰذا اس وقت بھی الجھے اعصاب کے ساتھ اٹھ کر وہ ٹیلی فون اسٹینڈ تک چلی آئی تھی۔

"ہیلو السلام علیکم!"

ریسور اٹھاتے ہی اس نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"وعلیکم السلام مس سنعیہ کیسی ہیں آپ؟"

دوسری جانب سے ابھرنے والی قطعی اجنبی مردانہ آواز نے اس کے ہوش اڑا دیئے تھے۔

"ک...... کون ہیں آپ؟"

از حد شاکڈ انداز میں ہکلاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب دوسری جانب سے خاص طویل سرد آ بھری گئی۔

گھمبیر لہجے کا ردھم اس کے اندر' دل کی تمام دھڑکنوں کو منتشر کر گیا تھا۔

"کون ہیں آپ؟"

ایک مرتبہ پھر اس نے بدحواس لہجے میں پوچھا تھا جب دوسری طرف سے کوئی دھیمے سے مسکرات ہوئے بولا۔

"جناب آپ کا عمر عباس نقوی بات کر رہا ہوں' اتنی گھبرا کیوں رہی ہیں آپ۔"

وہ مزے سے پوچھ رہا تھا' جب کہ سنعیہ غیاث کو لگ رہا تھا جیسے اس کی روح اس ایک پل میں فنا ہو کر رہ گئی ہو۔

• • •

دل کرتا ہے دیکھتے سر کو
دونوں ہاتھوں میں لے کر میں
اتنے زور سے بھینچوں جاناں

توڑ دوں ساری سوچیں اپنی
جن میں تیرا نام لکھا ہے
جن میں تیری سوچ گڑی ہے
جن میں تیرا روپ سجا ہے

وہ اس کے سامنے بیٹھی رو رہی تھی۔ اس لمحے شہروز علوی کا دل جیسے کٹ کر اس کی مٹھی میں آ گیا تھا۔

"ثمی...... وہاٹ ہپنڈ...... یہ...... آنسو کیوں آئے تمہاری آنکھوں میں؟" قطعی اضطراب کے عالم ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی صوفے پر آ بیٹھا' تو ثمران ازہان اسی کے مضبوط شانے سے سر ٹکاتے مزید پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"آئی ڈونٹ نو شہری۔ جانے کیوں مجھے لگتا ہے' جیسے میں بھری دنیا میں اکیلی ہو گئی ہوں۔" کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔

تبھی وہ اس کے آنسو اپنی انگلی کی پور پر چنتے ہوئے اپنائیت سے بولا۔

"ایسا کیوں سوچا تم نے؟ ہم سب ہیں ناں ثمی' تمہارے اپنے' ہر پل تمہارے ساتھ۔" ثمرن کا ادہ کہے گا۔

"ایسا مت سوچا کرو ثمی' میں ہوں ناں تمہارا اپنا' تمہارا بے حد خیال رکھنے والا' پھر اپنے آپ کو اکیلا ھتی ہو تم' خبردار جو آئندہ ایسا الٹا سیدھا کچھ سوچا تو۔"

لیکن اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے سر اس کے کندھے سے اٹھا کر پھیکی سی ٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں درست کہہ رہے ہو تم' یہاں سب لوگ ہی تو ہیں' مجھ سے بے پناہ پیار کرنے والے' اور میرا خیال رکھنے والے' پتہ نہیں کہ کبھی کبھی مجھے بھی کیا ہو جاتا ہے؟"

اس کے تبصرے پر شہروز خاصی دیر تک خاموش بیٹھا اسے بغور دیکھتا رہا تھا۔

"میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا ثمی اور یہ بات کبھی تم سے پوشیدہ نہیں رہی ہے۔"

اب کے وہ از حد سنجیدہ تھا' تبھی وہ آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں معلوم ہے مجھے' لیکن آپ بھول رہے ہیں جناب کہ ہماری اتنی پروا کے باوجود' آپ پچھلے لے سیدھے منہ ہم سے بات تک نہیں کر رہے۔"

ل کا حال معمول پر آیا تو اس نے دانستہ "محبت" کی جگہ "پروا" کا لفظ استعمال کر کے' اسے اس کی مئں شرمندہ کرنا چاہتا' جب وہ مسرور ہو کر لب پھیلاتے ہوئے بولا۔

"او تو اس کا مطلب ہے کہ آپ ہمارے خفا رہنے پر یوں بے دردی سے اپنے قیمتی موتی لٹا رہی ہاؤ امیزنگ دس بھلا آپ کہ ہماری ناراضگی کی اتنی پروا کب سے ہونے لگی۔"

وہ ابھی شاید اندر سے جلا بیٹھا تھا' تبھی اس کا انداز اپنایا تو ثمرن نے خفگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ہلکا سا مکا اسے مضبوط بازو پر رسید کر دیا۔

''شرم کرو کچھ' میرے خلوص پر شک کر رہے ہو تم؟''

''ناں بابا ناں ہماری ایسی مجال کہاں' خود ہی چوٹ پہنچا کر پھر خود ہی مظلوم بننا کوئی تم سے سیکھے۔'' ثمرن کا انداز دیکھ کر وہ بھی قدرے شوخ ہوا تھا۔ جب وہ تیز نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''وہاٹ میں نے کون سی چوٹ پہنچائی ہے تمہیں۔''

''آہ کوئی ایک ہو تو بتاؤں' یہاں تو سارا دل فگار ہو چکا ہے آپ کے ہاتھوں۔'' سرد آہ بھر کر اس نے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکایا تھا۔

''یہ محض بکواس اور الزام تراشی کے سوا اور کچھ نہیں۔''

اپنے دل کی اودھم مچاتی دھڑکنوں پر بمشکل کنٹرول پا کر اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا تو وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں آپ تو ایسے ہی کہیں گی۔ اچھی بھلی شادی کی ڈیٹ فکس ہو رہی تھی' فضول میں ملتوی کروا دی۔ بیٹھے بیٹھے پرائی ملازمت کا بھوت بھی سوار ہو گیا سر پر اوپر سے ناراض ہونے میں نہیں دیتیں۔''

''او تو یوں کہو ناں کہ اصل آگ میری ملازمت سے لگی ہے جناب کو۔''

وقتاً ہی سہی مگر وہ واقعی بہل گئی تھی۔

''ہاں لگی ہے پھر کیوں خوامخواہ مجھے چڑا کر لطف سمیٹتی ہو تم؟'' وہ حقیقتاً سلگ اٹھا تھا۔ تبھی وہ غصے سے لطف سمیٹتے ہوئے بولی۔

''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میرے جاب کرنے سے تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''ہے ناں تکلیف...... تمہارا فضول میں گھر سے باہر نکلنا' فضول لوگوں سے میل ملاپ رکھنا' مصروف رہ کر مجھے اگنور کرنا میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

اندر کا غبار نکل رہا تھا اور ادھر ثمرن ازہان کا دل جیسے ایک بار پھر سے پگھلنا شروع ہو گیا تھا۔

''میں تمہیں چاہ کر بھی اگنور نہیں کر سکتی شہری۔''

اس کے ان الفاظ سے شہروز آفندی کے عنابی لبوں پر جو فاتحانہ سی مسکراہٹ بکھری تھی اس نے ازہان کو پھر سے گہرے درد کے پاتال میں اتار دیا تھا۔

''کیوں؟''

اپنی روشن مقناطیسی نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے اس نے پوچھا تھا' جب وہ بے ساختہ نگاہیں پھیرتے ہوئے بولی۔

''کیوں کہ...... کیونکہ تم میرے...... بے حد اچھے دوست اور کزن ہو۔''

شہروز اس سے کچھ اور توقع کر رہا تھا' تبھی اس کے الفاظ قدرے مایوس ہوتے ہوئے' لب بھینچ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''انس او کے اپنا خیال رکھا کرو ثمی۔ میں تمہیں آئندہ کبھی اداس نہ دیکھوں۔''

کہنے کے ساتھ ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا وسیع لاؤنج سے باہر نکل گیا تو ثمرن ازہان نے درد کی شدت کو دباتے ہوئے آنکھ سے لڑھکتا آنسو انگلی کی پور پر اتار کر دور جھٹک دیا۔

محل دو محل کی نعمت کو اضافی سمجھا
ہم نے احساس کی دولت کو ہی کافی سمجھا
اس نے شرطیں بڑی آسان رکھی تھیں لیکن
ہم نے ''سمجھوتا'' محبت کے منافی سمجھا

♦ ♦ ♦

کمرے میں ملگجا سا اندھیرا کئے۔ وہ قطعی دل گرفتگی کے انداز میں ملول سی بیٹھی اپنے پاپا کی ڈائری کے تحریر شدہ اوراق الٹ پلٹ کر رہی تھی۔

قدرے نم سی نگاہوں کے سامنے ان کے موتیوں کے الفاظ گویا ڈگمگا رہے تھے۔

کس قدر نفاست کے ساتھ اُنہوں نے اپنی ڈائری کے آخری اوراق پر انہوں نے لکھا ہوا تھا۔

''پیارے بابا جان میں جانتا ہوں آپ مجھ سے آج بھی بہت ناراض ہیں' بے شک بیٹے والدین کا مان ہوتے ہیں اور آپ کے اس نالائق بیٹے نے محض اپنی خوشیوں کے لئے آپ کا مان کرچی کرچی کر ڈالا۔ آج آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہوں تو گزرے ہوئے وقت کی دھول میرے چہرے پر جمی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہے۔ کتنا بدنصیب اور برا ہوں میں؟ مجھ میں نہیں آتا آپ سب سے معافی کیسے مانگوں یقیناً میرے بعد آپ کے کندھے جھک گئے ہوں گے اور ماں جی آپ' آپ کیسی ہیں؟ یہاں پردیس میں آپ کی یاد بہت آتی ہے' جب بھی تیز بخار ہو سر درد ہو زکام ہو آپ کی آغوش کی گرمی کو یاد کر کے بہت روتا ہوں یقیناً میرے بعد آپ کی مسکراتی آنکھوں کے دیپ بھی بجھ گئے ہوں گے۔ شاید آپ مجھے یاد کر کے اب بھی اپنی کوکھ کو کوستی ہوں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ میں پیدا ہی نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ میرا یقین کریں میں یہاں ہرگز زندہ نہیں ہوں رینگ رینگ کر گزرتا وقت میرے زخموں کے لئے مرہم ثابت نہیں ہو رہا ہے دیار غیر میں جس محبت کو پانے کے لئے میں آپ سب کی محبتوں کے حصار میں بے دخل ہو گیا وہ محبت بھی میرا سائبان نہ رہ سکی۔ ماں جی دیکھئے ناں یہاں آ کر میں آپ سب کے بغیر کتنا اکیلا کتنا ادھورا ہوں۔ حائقہ آپا' آپ کی یاد بھی بہت آتی ہے آپ کو یاد ہے میرے اسٹیٹس جانے کے فیصلے پر آپ نے کیسا واویلا مچایا تھا۔ کاش میں آپ کی بات مان لیتا کاش' میں یہاں آیا ہی نہیں ہوتا۔ اتنے برس ہو گئے ہیں میں اب بھی آپ سب کو بھلا کر جینا نہیں سیکھ پایا ہوں اپنے ایک دوست کی معرفت بیہ کی موت کی اطلاع ملی تھی

بس اسی دن سے لے کر آج تک مسلسل مسمار ہو رہا ہوں کسی ایک گھڑی کا قرار بھی میرے نصیب میں نہیں رہا موت تیزی سے اپنی بانہیں پھیلائے میری جانب بڑھ رہی ہے۔ اسی لئے اپنی سبو کو آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں اس کا بہت خیال رکھیئے گا' بہت حساس بیٹی ہے میری خدارہ میری گستاخی میرا قصو بھلا کر میری بیٹی کو اپنی محبتوں کی چھاؤں میں لے لیجئے کیونکہ میرے بعد اس بدنصیب کا آپ لوگوں کے اور کوئی بھی نہیں ہے اسے میرے جرم کی سزا اسے نہ دیجئے گا' میری بیٹی معصوم ہے محبتوں کی ترسی ہوئی ہے خدارہ اسے اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ لیجئے شاید اسی طرح میری روح کو تھوڑا اقرار نصیب ہو جائے زندگی بھر میں اپنی خودساختہ آگ میں جلتا رہا ہوں اپنے کیئے کی بہت کڑی سزا پالی ہے میں نے' کم سے کم مرنے کے بعد تو تھوڑا اقرار نصیب ہو جائے مجھے۔ میں بیہ کے پاس جا رہا ہوں اس سے اپنے قصور کی معافی ضرور مانگوں گا لیکن اس سے پہلے آپ سب لوگ اس بدنصیب کو معاف کر دیں۔ جو اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی زندگی بھر اکیلا آبلہ پائی سے سفر طے کرتا رہا ہے میری سبو کا خیال رکھنا اب آپ سب کی ذمہ داری ہے۔"

والسلام

آپ کا بدنصیب بیٹا

"احسان احمد"

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر ڈائری پر گر رہے تھے اور وہ سسک رہی تھی۔

"آئی مس یو پاپا۔ آئی مس یو ویری مچ۔"

درد کی شدت حد سے سوا ہو رہی تھی۔ عین اسی لمحے اسے اپنے کمرے میں کسی نفوس کی موجودگی کا احساس ہوا اور وہ بے ساختہ چونک اٹھی۔ کوئی اس کے قریب ہی اس کے بیڈ پر لیٹا پہلو بدل رہا تھا۔

• • •

یہ کچھ دن ہیں کہ اس کو یاد ہر اک شام کرنا ہے
پھر اپنی دل کی بستی میں اسے گمنام کرنا ہے
یہ کچھ دن ہیں کہ اس کی یاد جسم و جاں تھکائے گی
پھر اس کے بعد ہم کو دیر تک آرام کرنا ہے!

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے اور وہ مدہوش سی ننھے سلمان کے ریشمی بالوں لیاں چلاتے ہوئے اسے کہانی سنا رہی تھی۔

"ایک تھا شہزادہ...... بہت حسین...... بے حد خوبصورت۔"

"لیکن جانے کیوں وہ ساری دنیا سے بے نیاز رہتا تھا' ہر وقت غصہ کرتا رہتا تھا' شہزادے کے ماں ماکے بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے' لہٰذا اس کے بڑے بھائی نے اس کے پرورش کا ذمہ اٹھا رکھا ادے کا بڑا بھائی بہت سخت تھا اور اس کی بیوی اسے تو شہزادے کے وجود سے دلی پرخاش تھی' بچپن ہزادے کی معمولی معمولی غلطیوں پر اس کے بڑے بھائی کو شکایت لگا کر اسے خوب مار پڑواتی تھی' ب شہزادہ بڑا ہو گیا تو اس کے شہزادے کو ذہنی اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ زندگی شہزادے کے لئے

کسی عذاب سے کم نہ رہی تھی کہ اچانک اس کی زندگی میں ایک پری آ گئی۔"

"خوبصورت پری۔"

"شہزادے کو دیکھتے ہی وہ اس پر فدا ہو گئی تھی۔"

"شہزادے کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کا درد اسے اپنے دل میں اترتا محسوس ہوتا تھا۔"

بچے کی دلچسپی وغیر دلچسپی سے قطعی بے نیاز وہ اپنی ہی رو میں بہتے ہوئے ایک مدت کے بعد اپنے دل کا درد ہلکا کر رہی تھی۔

"پھر کیا ہوا مما؟"

اسے چند لمحوں کے لئے خاموش پا کر محویت سے کہانی سنتا ننھا سلمان فوراً بے قراری سے بولا تھا۔ تبھی وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی تھی۔

"پھر، پھر شہزادے کو بھی اس پری سے محبت ہو گئی دونوں بہت خوش تھے دونوں معصوم بچوں کی اپنی اپنی خوشیاں اور دکھ ایک دوسرے کے سپرد کر کے خوش ہو جایا کرتے تھے، انہیں دنوں شہزادہ تعلیم سے فارغ ہو کر ایئر فورس میں چلا گیا۔ ایئر فورس کے متعلق معلوم ہے ناں آپ کو؟"

ٹوٹتے بکھرتے لمحوں کی گرفت میں ابھی وہ از حد بے کل دکھائی دے رہی تھی۔

"جی۔"

ننھے سلمان نے اس کے سوال پر بہت آہستگی سے اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

"پاپا کے ایک دوست ایئر فورس میں ہیں مما، وہ جہاز اڑاتے ہیں، کیا شہزادہ بھی جہاز اڑاتا تھا"

بچے کی معصوم سی معلومات اور سوال پر وہ نثار ہو کر رہ گئی تھی۔

تبھی ایک محبت بھرا بوسہ اس کی روشن پیشانی پر ثبت کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں، شہزادہ بھی جہاز اڑاتا تھا، پتہ ہے مانی، جب شہزادے کو یہ پتہ چلا تو وہ بے حد خوش تھا لگتا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگا ہو، لیکن جب اس سے بے پناہ محبت کرنے والی پری کو اس بات کے متعلق معلوم ہوا تو وہ بے حد اداس ہو گئی؟"

"لیکن کیوں مما؟"

"کیا پری، شہزادے کی خوشی سے جلتی تھی؟"

پے در پے نازیہ کی بات اچکتے ہوئے اس نے فوراً سوال کر ڈالے تھے، جب وہ ایک زخمی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں پری، شہزادے کی خوشی سے جلتی نہیں تھی۔"

"تو پھر وہ اس کی خوشی پر اداس کیوں ہوئی؟"

بچے کے معصوم سوالوں سے لگ رہا تھا۔ کہ کہانی میں اس کی دلچسپی بڑھ رہی ہے۔

نازیہ اس بار اس کے سوال پر چند لمحوں کے لئے کچھ بھی نہیں بول سکی تھی۔

"بتایئے ناں مما پری، شہزادے کی خوشی پر اداس کیوں ہو گئی تھی؟"

اسے خاموش پا کر وہ پھر مچلا تھا، تب وہ کھوئی کھوئی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ ڈرتی تھی بیٹے۔"

"کس سے ڈرتی تھی مما؟"

"وہ، وہ جدائی سے ڈرتی تھی مانی، شہزادے کی دوری کا خیال اس کی جان نکالتا تھا۔ بہت پیار جو کرتی تھی شہزادے سے اسی لئے اسے خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی، لیکن شہزادے نے اس کی ایک نہیں سنی اور انجان وطنوں کی طرف اُڑ گیا۔"

یہاں پہنچ کر اس کا لہجہ بری طرح سے رندھ گیا تھا۔ حلق میں جیسے غم کا پھندا سا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں لبالب پانیوں سے بھر آئی تھیں، تبھی سلمان اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"مما...... آپ کیوں رو رہی ہیں، کیا آپ کو زیادہ بولنے سے درد ہو رہا ہے؟"

"ہاں۔"

رندھے ہوئے لہجے میں کہتی وہ اسے اپنے ساتھ لپٹا گئی تھی۔

"سوری مما! اب آپ سو جائیں، میں باقی کہانی پھر سن لوں گا آپ سے۔"

از حد بے قراری کے باوجود وہ پلکیں موند کر سوتا بن گیا تھا، لیکن نازیہ شیرازی پھر رات بھر نہیں سو سکی تھی۔

• • •

"ک...... کون؟"

گہری رات کی تاریکی میں کسی دوسرے نفوس کی موجودگی کا احساس اسے خاصا چونکا گیا تھا۔ تبھی اس نے حیرانگی سے پیچھے پلٹتے ہوئے پوچھا تو نگاہوں کے سامنے ازہان کو اپنے بستر پر لیٹے دیکھ کر گویا ششدر رہ گئی۔

"آ...... آپ...... یہاں؟"

"میرے کمرے میں؟"

وہ واقعی از حد حیران ہوئی تھی۔

"ہاں...... وہ...... ایکچوئلی میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا، تو یونہی خیال کئے بغیر لیٹ گیا۔"

اپنی خفت مٹانے کی غرض سے وہ فوراً ہی اس کے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تو سبرینہ اپنی سیٹ پیچھے چھوڑ کر فوراً اس کے قریب چلی آئی۔

''اٹس او کے...... سر میں زیادہ درد ہو رہا ہے تو میں دبا دوں۔''

''نہیں...... فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

سبرینہ نے دیکھا اس کی آنکھیں شدید سرخ ہو رہی تھیں۔

''چائے...... چائے لاؤں آپ کے لئے۔''

دل کی دھڑکنیں اپنے معمول پر نہیں رہی تھیں' سانس بھی الجھ رہی تھی' مگر پھر بھی وہ اس کے ہوئے نقوش پر پیاسی نگاہیں جمائے اس سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس یونہی' دل نہیں چاہ رہا۔''

سبرینہ کو اس وقت وہ خاصا الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

از حد ڈیپریس' تبھی وہ اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تو ازہان نے چپ چاپ نگاہیں پھیر تب از حد جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنا سرد ہاتھ' اس کی کشادہ پیشانی پر دھرا تھا۔

''ارے...... آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔''

پیشانی پر ہاتھ دھرتے ہی وہ از حد متفکر ہوئی تھی۔

''ڈونٹ وری...... میں عادی ہوں اس کا۔''

اپنے کسی انداز اس میں بھی وہ اس پہلے والا ازہان نہیں لگ رہا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس وقت اسے کسی مسیحا' کسی غمگسار کی از حد ضرورت ہو' مگر وہ خود پر کسی کا ا لینا نہ چاہتا اور کھلنا نہ چاہتا ہو۔

ٹوٹتے بکھرتے لمحوں کا شکار وہ شخص اس وقت اسے دل کے بے حد قریب محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ یہیں ٹھہریں' میں سارہ یا حائقہ پھپھو کو بلا کر لاتی ہوں۔''

شانے سے ڈھلکتا ڈوپٹہ' دوبارہ سیٹ کرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا' تو ازہان نے اسے روکتے ہوئے منع کر دیا۔

''نہیں...... میں اپنی وجہ سے کسی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا۔''

سرعت سے کہنے کے ساتھ ہی وہ اس کے بستر سے اٹھ کر تیز تیز چلتا' کمرے سے باہر نکل گیا تو برینہ کا دل اس لمحے اپنی پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت اس کی تیمارداری کیسے کرے؟

کیسے اس کا درد بٹائے؟

دل کسی طور پر قابو میں نہیں آ رہا تھا' تبھی وہ شدید بے قراری کے عالم میں' وہ سارہ کے کمر

طرف بڑھی تھی۔

''سارہ...... پلیز اٹھو۔''

اسے جھنجوڑ کر جگاتے ہوئے وہ قدرے اضطراب کے عالم میں بولی تھی۔ جب گہری نیند کے خمار میں ڈوبی سارہ نے شدید گرفت ذرہ ہوتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا ہے بی' پلیز سونے دو ناں' پہلے ہی بارہ ایک بجے کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

''آرام کی بچی' ازہان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' بہت تیز بخار ہے اسے۔''

''تو میں کیا کروں......؟ ہر وقت تپے رہتے ہیں' کونسی نئی بات ہے' ویسے بھی یہ مما کا ہیڈک ہے۔ لہٰذا پلیز تم انہیں ہی ڈسٹرب کرو' مجھے تو سونے دو۔''

قطعی لاپروائی سے کمبل اس کی گرفت سے چھینتے ہوئے وہ دوبارہ سو گئی' تو سبرینہ ایک بہن کے اس درجہ بے نیاز عمل پر شدید حیران رہ گئی۔

سارہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد' وہ حائقہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی تو وہاں دادی ماں اور دیگر کچھ مہمانوں کو ان کے قریب بیٹھے دیکھ کر' انہی قدموں پر واپس پلٹ آئی۔

ازہان کا جلتا وجود اس کے اعصاب پر جیسے کوڑے برسا رہا تھا۔

''حویلی'' میں اپنی آمد کے بعد پہلی بار وہ اس درجہ بے اختیار ہوئی تھی' کہ رات کے بارہ بجے مکمل استغراق کے انداز میں کچن میں گھسی' وہ چائے بنانے کے لئے مختلف کیبنٹ کھنگال رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مشقت کے بعد' وہ چائے بنا کر ساتھ میں بخار کی ٹیبلٹ کے ساتھ ازہان کے کمرے تک آئی' تو وہ تکیے میں منہ دیئے' بیڈ پر اوندھا پڑا ملا تھا۔

سبرینہ کو اس کی حالت تکلیف پہنچا رہی تھی۔

ہاتھ میں تھامی ٹرے کو بہت آہستگی سے قریبی ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف آئی تھی۔

''ازہان...... کیا سر میں زیادہ درد ہو رہا ہے؟''

''نہیں...... جاؤ تم یہاں سے۔''

اوندھے منہ پڑے پڑے ہی اس نے خاصی سرد مہری سے جواب دیا تھا' جب وہ شدید اہانت محسوس کرتے ہوئے ہونٹ دبا کر بولی۔

''او کے...... میں چلی جاتی ہوں' لیکن پلیز آپ یہ چائے اور بخار کی ٹیبلٹ لے لیں۔''

اب کے وہ سیدھا ہو کر بیڈ پر اٹھ بیٹھا تھا۔

''تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟''

بگڑتے چتونوں سے اسے گھورتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ نگاہیں جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔

"کچھ نہیں' آپ سے ہمدردی جتانے کا بخار چڑھا ہے۔"

"کیوں چڑھا ہے؟ جب میرے اپنوں کو میری کوئی پروا نہیں' تو تم کیوں خوامخواہ ہلکان ہو رہی ہو؟"

"آئی ڈونٹ نو...... لیکن میں آپ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔"

"کیوں نہیں دیکھ سکتی؟"

حلق کے بل چلاتے ہوئے اس نے برائے راست اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"مجھے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے' لہٰذا تمہارے لئے بھی یہی بہتر ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو اور یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کہاں چلی جاؤں' مجھے تو اب ہمیشہ اسی حویلی میں رہنا ہے۔"

ازہان کو اس بحث برائے بحث سے جیسے اب کوفت سی ہونے لگی تھی' تبھی وہ رخ پھیر کر قدرے ترشی سے بولا تھا۔

"خوامخواہ دماغ خراب مت کرو میرا' کچھ نہیں ہوا ہے مجھے' نہ ہی تمہاری خدمت درکار ہے' جاؤ اب یہاں سے۔"

سبرینہ نے اس بار اس سے کچھ نہیں کہا تھا' بس چپ چاپ' دکھ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل بھی بھر آ رہا تھا۔

دروازہ بند کر کے' اپنے بستر پر گرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ عین اسی پل' کسی نے اس کے روم کا دروازہ' زور سے بجایا تھا' تبھی وہ قدرے چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

"نہیں...... میں تمہارا ایکسکیوز قبول نہیں کروں گی ازہان' بہت سنگدل ہو تم' اچھا ہے کہ پوری رات تمہیں اپنے غلط رویے کا پچھتاوا ہوتا رہے۔"

بے دردی سے آنسو رگڑ کر وہ تکیے میں منہ چھپا کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی تھی جب دروازے پر وقفے وقفے سے ہونے والی دستک بھی بالآخر ختم ہو گئی تھی۔

• • •

رات کافی گہری ہو رہی تھی' جب برآمدے میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی تیز آواز نے اسے چونکا ڈالا۔

"ہیلو!"

منتشر اعصاب کے ساتھ اٹھتے ہوئے اس نے یہ کال ریسیو کی تھی۔ جب دوسری طرف تھوڑی سی خاموشی کے بعد کوئی شوخ لہجے میں بولا تھا۔

"کیسی ہو عزیز از جان؟"

"وھاٹ...... کون ہیں آپ؟"

لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا تھا۔

"عمر بول رہا ہوں۔"

"کون عمر؟"

دل کے دھڑکنے کی رفتار بدستور جاری تھی' جب دوسری طرف سے وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"کمال ہے...... آپ مجھے نہیں جانتیں اور یہاں میں...... ہر لمحہ ہر پل' آپ کے متعلق سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔"

"تو کس نے کہا ہے پاگل ہوں......؟ اور یہاں فون کیوں کیا ہے' آپ کو ضرورت کیا ہے مجھ سے بات کرنے کی؟"

پہچان تو وہ اسے پہلے ہی گئی تھی' اب صرف دل کا غبار نکل رہا تھا۔

"سنی...... ناراض ہو مجھ سے؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے آپ سے ناراض ہونے کی' ویسے بھی میں ہر ایرے غیرے کو اتنی اہمیت نہیں دیتی۔"

"اچھا...... میں ایرا غیرا ہوں؟"

دوسری طرف وہ قدرے ہرٹ ہوا تھا' تبھی وہ بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

"فون کیوں کیا ہے؟"

"بس یونہی' تم سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا' پنکی سے باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اس وقت تمہارے سوا کوئی نہیں جاگتا گھر میں' سو دل کے اکسانے پر فون گھما ڈالا۔"

"سوری' مجھے نیند آ رہی ہے میں پنکی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

اس کے الفاظ پر دل مزید پھیل گیا تھا۔ آنکھیں خوامخواہ نمکین پانیوں سے بھر رہی تھیں۔

"سنی...... میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں' ایک مدت کے بعد' مجھے اتنی خوشی ملی ہے کہ میں خود کو سنبھال نہیں پا رہا ہوں' قدرت کی پاک ذات نے جب میرے جذبوں پر رحم کھاتے ہوئے تمہیں مجھ سے ملا دیا تو تم اتنی کٹھور کیوں بن رہی ہو؟"

"میں ایسی ہی ہوں' ویسے بھی آپ صرف پنکی سے دوستی رکھیں' وہی آپ کو خوش رکھ سکتی ہے میں بہت مغرور' بدمزاج لڑکی ہوں' بھول جائیں مجھے۔"

اب کے دوسری طرف سے جامد خاموشی چھا گئی تھی۔

''سعیہ......کیا آپ پنکی سے جیلس ہو رہی ہیں؟''

قدرے خاموشی کے بعد اس نے نسبتاً دھیمے لہجے میں پوچھا تھا' جب وہ پھر سے تپتے ہوئے بولی۔

''مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے جیلس ہونے کی؟ ویسے بھی میں آپ جیسے تھرڈ کلاس عاشقوں پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔''

عمر عباس نقوی کا متبسم لہجہ بھی اس کے اندر آگ لگا گیا تھا۔ تبھی وہ دوسری طرف پھر سے کھلکھلا اٹھا تھا۔

''اچھا' بڑا تجربہ ہے تمہیں عاشقوں کا۔''

''میں فون رکھنے لگی ہوں۔''

''سنی پلیز' صرف دو منٹ کے لئے میری بات سن لو' پھر جیسے تم کہو گی میں ویسے ہی کروں گا۔'' اس کے خشک لہجے کے جواب میں وہ بھرپور لجاجت سے بولا تھا۔

''او کے فرمایئے۔''

اس کی التجاء پر سعیہ کا دل بھی جیسے نرم پڑ گیا تھا۔

''دیکھو سنی' پلیز غصہ تھوک دو' دیکھو' اگر میں پنکی سے بات نہ کرتا' تو وہ مجھے تمہارے بارے میں کیسے بتاتی؟ تم خود تو اتنا ڈرتی ہو' سب کے سامنے بھی بات تک کرنا گوارہ نہیں کرتی ہو' پھر اگر میں پنکی کو نہ بہلاتا' تو تم تک کیسے پہنچتا' اسی کی مہربانی سے تو تم سے رابطہ کرنا نصیب ہوا ہے۔ آئی ریئلی لو یو سعیہ' میں ہر حال میں تمہیں اپنے نصیب کا حصہ بنانا چاہتا ہوں' کیا تم ایسا نہیں چاہتیں؟''

ایک ہی سانس میں دل کا حال اس پر عیاں کرتے ہوئے' وہ جیسے روہانسا سا ہو گیا تھا۔

سعیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس وقت اس سے کیا کہے؟ سو خاموش رہی تھی۔

''بولو سنی......کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا' کیا تم چاہتی ہو میں تم سے محبت نہ کروں؟''

سعیہ اب بھی خاموش کھڑی' محض لب کاٹتی رہی تھی' تبھی وہ احتجاجاً بولا تھا۔

''پلیز جواب دو سعیہ' تمہاری ہاں اور ناں پر' میری سانسیں اٹکی ہیں۔''

اس بار اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔ لہٰذا سعیہ غیاث بھی مزید سنگدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔

''میں ایسا کچھ نہیں چاہتی' بس آپ پنکی سے زیادہ فری نہ ہوا کریں۔''

''او کے......اینڈ تھینک یو سو مچ سویٹ گرل' یوں لگتا ہے جیسے روح' میرے جسم میں ایک دم واپس آ گئی ہو۔''

وہ ابھی اور بھی کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا' مگر سعیہ نے اس سے قبل ہی گھبراتے ہوئے سرعت سے رابطہ ڈس کنکٹ کر دیا کہ اب دل کی اودھم مچاتی دھڑکنوں کا شور سننا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

♦ ♦ ♦

شل سے اسے ڈسچارج ہوئے آج تیسرا دن تھا۔

وصائمہ اس کا بے حد خیال رکھ رہی تھی' مگر پھر بھی وہ قدرے نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ ذہن جیسے ے سن ہو کر رہ گیا تھا۔

لیں موندے' سر بیڈ کی پشت سے ٹکائے' وہ جانے کن سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب اچانک رے کا دروازہ' ہلکے سے کھلا ہوا اور اگلے ہی لمحے' ننھا سلمان ہنستے مسکراتے ہوئے لپک کر اس آ بیٹھا۔

'ارے......آپ کب آئے؟''

لمان کو اپنے قریب دیکھ کر وہ واقعی خوش ہو گئی تھی' تبھی وہ مسرور لہجے میں بولا تھا۔

'ابھی پاپا کے ساتھ آیا ہوں مما۔''

'پاپا کہاں ہیں؟''

ے گود میں بھرتے ہوئے قدرے حیرانگی سے اس نے پوچھا تھا' جب بچے نے پھر سے مسکراتے یا۔

'باہر......نانی ماں کے پاس بیٹھے ہیں' لیکن آپ کو کیا ہوا ہے مما۔''

'کچھ نہیں۔''

فور اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دھیمے سے مسکرا کر کہا تھا۔

'اچھا......تو پھر آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟ کتنا اندھیرا ہو رہا ہے' پلیز باہر چلیں ناں۔''

'او کے۔''

سلمان کی جگہ اگر کوئی اور اس سے یہ بات کہتا تو وہ کبھی نہ مانتی' مگر......اس ننھے سے معصوم فرشتے دنیا' گویا اس نے خود پر فرض کر لیا تھا' تبھی اس کے گال چوم کر اسے اپنی گود میں اٹھاتے ہوئے وہ اپنا کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

''السلام علیکم!''

صحن میں اماں کے پاس پہنچتے ہی اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا جواب میں سنوان ہمدانی نے طرح اٹھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔

''وعلیکم السلام! آیئے......پلیز بیٹھئے۔''

''شکریہ۔''

اماں کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے سلمان کو اپنی گود میں بٹھا لیا تھا۔

''جی فرمایئے' کیسے آنا ہوا؟''

مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس' سنوان ہمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ

انکساری سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ کی خیریت مطلوب تھی مس نازیہ' اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"شکر ہے اللہ کی پاک ذات کا' آپ سنایئے۔"

"الحمدللہ...... اس ناچیز پر بھی اللہ کا بہت کرم ہے' بس ایک مسئلہ ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟"

اب کے وہ ذرا سی چونکی تھی' تبھی سنوان ایک سرسری سی نگاہ اس کے دلکش سراپے پر ڈالے
بولا۔

"کچھ خاص تو نہیں' لیکن...... آئی ایم سوری مس نازیہ' میں اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں شدید
اور خوار ہو کر رہ گیا ہوں۔"

الفاظ کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے کے ایکسپریشنز نے نازیہ شیرازی کے لبوں پر مسکراہ
دی تھی۔

"خیریت...... اب کیا ہو گیا ہے؟"

"ہونا کیا ہے' اصل بات یہ کہ ایک ہفتہ بعد مانی کے سکول میں چھوٹا سا فنکشن ہے' جس میں
ٹیچر نے اسے بھی حصہ دلوایا ہے' محترم دولہا کا کردار ادا کر رہے ہیں' اسی مقصد کے لئے کچھ شا
پروگرام ہے' مگر یہ ضد کر کے بیٹھ گئے ہیں کہ اس بار جناب کی شاپنگ میری نہیں۔ بلکہ آپ کی پسند
گی' اب بتایئے میں کیا کروں؟"

وہ واقعی قدرے بے بس دکھائی دے رہا تھا تبھی نازیہ شیرازی ایک مدت کے بعد کھل کر
تھی۔ صائمہ شیرازی اور عائشہ بیگم نے قدرے حیرانگی سے چونک کر اس کے مسکراتے ہوئے چہ
طرف دیکھا تھا۔

"انٹرسٹنگ...... کیوں مانی' پاپا کو تنگ کرتے ہو؟"

اپنی گود میں بیٹھے سلمان کا چہرہ اٹھا کر قدرے رعب سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے
تھا' جب وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"نہیں مما۔"

"اس کا مطلب ہے پاپا جھوٹ بول رہے ہیں۔"

"نہیں۔"

"نہیں کے بچے' تو ٹھیک ہو جا' نہیں تو بہت پٹائی کروں گی میں۔"

پیار سے ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگاتے ہوئے اس نے کہا تو سلمان معصوم سی ڈھٹائی
مسکراتے ہوئے اسی کے آنچل میں چھپ کر مزید اس سے لپٹ گیا۔

ب تک صائمہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔

وڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد' وہ اماں سے اجازت لے کر ننھے سلمان اور سنوان
ے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔

لمان اس لمحے اس کا ہاتھ پکڑے' آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اتنا خوش دکھائی دے رہا تھا گویا
خزانہ مل گیا ہو اسے۔

"بہت پیارا بچہ ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قدرت نے اسے ماں کی ممتا سے محروم کیوں کر

رائیونگ کے دوران اچانک اس نے سنوان ہمدانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا' جواب میں وہ
سرسری سی نگاہ اس پر ڈال کر پھر سے رخ پھیر گیا تھا۔

"آپ نے کبھی بتایا نہیں مسٹر سلمان کہ مانی کی مما کے ساتھ کیا ہوا؟ کب رحلت ہوئی ان کی؟"

س کی خاموشی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اس نے پھر پوچھا تھا' جب وہ لب بھینچ کر نگاہ سامنے
وز رکھتے ہوئے بولا۔

"اس کی رحلت نہیں ہوئی' زندہ ہے وہ۔"

"وہاٹ؟"

شاید شاک کی کیفیت میں تقریباً اچھلتے ہوئے اس نے سنوان ہمدانی کی طرف دیکھا تھا۔

"یہی سچ ہے مس نازیہ' سلمان کی مما اب بھی زندہ ہے' مگر اس ننھے سے فرشتے سے بے نیاز

"بٹ وائے' اتنے پیارے معصوم بچے سے ایک ماں کیسے دور رہ سکتی ہے؟"

وہ اب بھی شاک کی کیفیت میں تھی' جواب میں سنوان ہمدانی کے لبوں پر پھیکی سی مسکان بکھر گئی۔

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے مس نازیہ' خیر چھوڑیں اس فضول ٹاپک کو' آپ سنائیں انکل کی
اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے الحمدللہ۔"

اس کے چہرے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع کے چھیڑنے سے بچنا چاہ رہا ہے۔ تبھی
نے اسے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

تقریباً بیس پچیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ دونوں سلمان کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی سے باہر نکلتے
ہوئے مطلوبہ شاپ کی طرف بڑھ آئے تھے۔

♦ ♦ ♦

موسم بے حد حسین ہو رہا تھا۔

سبک روی سے چلتی ٹھنڈی ہواؤں نے فضا میں خاصی خنکی پھیلا رکھی تھی۔
کے برعکس ثمرن ازہان کا دل قدرے مکدر ہو رہا تھا۔

ٹوٹنے بکھرنے کے حصار میں مقیدہ لڑکی جیسے خود کو سنبھال نہیں پا رہی تھی۔

شیر دل صاحب گاہے بگاہے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے' کے مکین بھی اس کا بہت خیال کرتے تھے' مگر اس کے باوجود اس کا دل پاکستان میں نہیں لگ ر

اس روز چونکہ سنڈے تھا' لہٰذا شہروز کے گھر سے باہر نکلنے کے بعد وہ اس کے کمرے میں سارا کمرہ خاصا بے ترتیب ہو رہا تھا۔

اسی لئے وہ فوراً صفائی میں جت گئی۔ کمرے کی سیٹنگ اپنی پسند سے کرنے کے بعد ا کی کتابیں سمیٹ کر سلیقے سے رکھیں' پھر اس کے جوتے' رومال اور موزے سنبھال کر وار مخصوص خانے میں رکھے' اس کے بعد ابھی اس کے کپڑے نکال کر سمیٹ ہی رہی تھی کہ اچ کے نیچے رکھی شہروز کی پرسنل ڈائری اس کے ہاتھ لگ گئی۔

''او...... تو موصوف ڈائری لکھنے کے بھی شوقین ہیں۔''

اشتیاق سے ڈائری ہاتھ میں لے کر وہ اسی کے بستر پر آ بیٹھی تھی۔

ڈائری درمیان سے کھولتے ہی جس پہلے صفحے پر اس کی نگاہ پڑی تھی' اس صفحے پر شہرو شوق سے لکھا تھا۔

کہو اب کیا کہوں تم سے
بتاؤ کیا لکھوں تم کو
مجھے تمہید دو کوئی' مجھے امید دو کوئی
نیا اک لفظ ہو کوئی
جہاں سے بات چل نکلے' میری مشکل کا حل نکلے
بتاؤ لہجہ کیسا ہو کہ تم سے بات کرنی ہے
مجھے تھوڑا اجالا دو' بس اک رات کرنی ہے
تم اپنی روشن آنکھوں کو' اگر کھولو تو میں لکھوں
کہو اب کیا ارادہ ہے
مجھے اظہار کرنا ہے کہ بے تابی زیادہ ہے

وہ ابھی یہ نظم ہی پڑھ پائی تھی کہ کمرے کے باہر سے شہروز کی تیز آواز اس کی سماعتوں میں

''ثمرن' یار جلدی آؤ' دیکھو میں تمہارے لئے کیا لے کر آیا ہوں۔''

اس کی پاٹ دار آواز پر عجیب سے احساسات کے ساتھ' ڈائری واپس وارڈ روب میں رکھ

اس کے کمرے سے نکل ہی رہی تھی کہ شہروز اسے پکارتے ہوئے وہیں چلا آیا۔

''کہاں گم ہو یار...... میں کب سے حلق پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہوں۔''

دہلیز پر اس سے مڈبھیڑ ہوتے ہی اس نے احتجاج کیا تھا' جواب میں وہ خود کو نارمل کرتے ہوئے دھیمے سے مسکرا کر بولی۔

''کیوں چلا رہے تھے' خیریت تو ہے ناں؟''

''ہاں خیریت ہی ہے' تمہیں کچھ دکھانا تھا۔''

کمرے کی صورت حال پر ابھی تک اس کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔

''او کے' دکھاؤ کیا چیز ہے' جس کے لئے اتنے بے تاب ہو رہے ہو تم؟''

''دکھاتا ہوں یار...... پہلے' یہ بتاؤ' تم میرے کمرے میں کیا رہی تھیں؟''

ثمرن کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ مسکرا کر اپنا بھرم رکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ خاص نہیں' یونہی تمہاری جاسوسی کرنے آئی تھی۔''

''ویل...... پھر کہاں تک کامیاب ہو سکیں۔''

دوسری طرف شہروز نے یقیناً اس کے الفاظ کو انجوائے کیا تھا۔

''کامیاب کیسے ہوتی' تم نے مہلت ہی نہیں دی' فوراً چھاپہ مار لیا۔''

اب کے شہروز بے ساختہ کھلکھلا اٹھا تھا۔

''گڈ...... ویسے کس چیز کی تلاش ہے آپ کو' مجھ سے شیئر کر لو' شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''جی نہیں' مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں' تم بتاؤ کیا دکھانا چاہ رہے تھے مجھے؟''

فوراً سے بیشتر اس نے اس موضوع سے اس کی توجہ ہٹائی تھی۔

''او ہاں...... یہ رنگ دیکھو...... کیسی ہے؟ اچھی ہے ناں۔''

ڈائمنڈ کی ایک نفیس سی رنگ کوٹ کی جیب سے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ ستائشی نگاہوں سے رنگ کو دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پہن کر بولی۔

''بہت زبردست' واقعی بے مثال چوائس ہے تمہاری' تھینک یو سو مچ' پر مجھے یہ رنگ کس خوشی میں دے رہے ہو تم؟''

اس کے دل میں' ابھی ہلچل مچی تھی' پھر سے شہروز کی محبت نے اودھم مچانا شروع کر دیا تھا' مگر دل خوش فہم کی ساری خوشی اس وقت کافور ہو گئی' جب وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ رنگ تمہارے لئے نہیں ہے میم' میری عزیز دوست کی کل برتھ ڈے ہے' اسی کے لئے خریدی

ہے۔ تمہیں میں پسند کروا رہا ہوں' آفٹر آل میری بہت اچھی دوست ہو تم۔"

وہ متبسم لہجے میں کہہ رہا تھا جب کہ ثمرن ازہان شاکڈ انداز میں خالی خالی سی نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

• • •

سورج کی روشن کرنوں کا اجالا' کھڑکی سے باہر اچھا خاصا پھیل گیا تھا۔ وہ ابھی کمرے سے نکلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ سارہ' اس کے روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دینے کے بعد خاصے دھڑلے سے آ کر بیڈ پر اس کے برابر میں بیٹھ گئی۔

"السلام وعلیکم اینڈ صبح بخیر۔"

"وعلیکم السلام۔"

اپنی سرخ آنکھیں آہستگی سے مسل کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ہاں اب بول' کیا بات تھی' کیوں اتنی بے چین تھی تو رات کو۔"

سارہ کا قطعی فرینک لہجہ' اسے گہری اداسی سے دوچار کر گیا تھا۔ کیونکہ اس کے سوال پر رات ازہان کے ہاتھوں ہونے والی اپنی تذلیل پر وہ پھر سے لہولہو ہو کر رہ گئی تھی۔ تبھی نگاہ پھیر کر لب کاٹتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ کیسے نہیں؟ کچھ تو تھا جو تم رات کے تین بجے بھی' بے قراری سے اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔"

وہ چونکہ رات گہری نیند کے خمار میں تھی' لہٰذا بات کا پتہ نہیں چلا تھا' تبھی وہ نظریں جھکا کر خاصے مدہم لہجے میں بولی تھی۔

"ازہان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی سارہ' بہت تیز بخار تھا اسے۔"

"سو واٹ...... یہ کون سی نئی بات ہے؟ انہیں اکثر ٹمپریچر ہو جاتا ہے' پھر کیا ہوا؟"

دوسری طرف سارہ کا جواب رات سے قطعی مختلف نہیں تھا۔

"شٹ اپ سارہ' مجھے تمہارے الفاظ پر بے حد حیرانگی ہو رہی ہے۔ تمہارا بھائی ہے وہ پھر بھی تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں' کیوں؟"

وہ واقعی شدید ہرٹ ہوئی تھی۔ تاہم سارہ کے لہجے کی بے نیازی ہنوز قائم تھی۔ تبھی اس نے کہا تھا۔

"کیوں کہ وہ بھی ہم سب کے معاملے میں ایسی ہی بے نیازی دکھاتے ہیں' بلکہ اس سے بھی زیادہ۔"

"واٹ۔" اب کے وہ شدید چونکی تھی۔

"ہاں سارہ...... بہت سنگدل ہیں وہ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ کوئی ہمدردی کرے بھی تو کاٹ نے کو دوڑتے ہیں' لہٰذا بہتر ہے کہ تم بھی ان معاملات میں دلچسپی نہ رکھو اور ہاں اب جلدی سے فریش باہر آ جاؤ۔ نانی اماں انتظار کر رہی ہیں۔"

فاسٹ لہجے میں تیز تیز کہتے ہوئے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تھی' جب کہ سبرینہ کے اب جیسے اپنے ٹھکانے پر ہی نہیں رہے تھے۔ اس روز بہت دیر تک' وہ مختلف حوالوں سے ازہان کے ن سوچتی رہی تھی۔

• • •

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔

دور نیلے آسمان پر اڑتے پرندے اور رنگ برنگ سراتی پتنگیں' ماحول کی خوبصورتی میں ایک سا سحر پھونک رہی تھیں۔

پارک میں موجود سبھی لوگ' اپنی اپنی مصروفیات میں مست تھے۔ تبھی اس نے بہت اداس۔ میں سنوان ہمدانی سے پوچھا تھا۔

''مجھے آپ کی ناکام میرج لائف کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا ہے' مگر پھر بھی میں جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کی وائف' آپ سے علیحدہ کیوں ہوئی؟ ماں کا خیال کیوں نہیں کیا اس نے۔''

وہ سنوان ہمدانی کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی' اس کی تمام تر توجہ پارک میں کھیلتے چھوٹے معصوم بچوں پر مرکوز تھی جن میں سلمان بھی شامل تھا اور کھیل کے دوران بھی وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس سے غافل نہیں ہونا چاہتا تھا کہ کہیں وہ پھر سے اسے چھوڑ کر کہیں غائب نہ ہو جائے۔

تاہم اس کے سوال پر اس کے مقابل بیٹھے' سنوانی ہمدانی نے ایک بھرپور نگاہ گہرے نیلے آسمان پر ڈالتے ہوئے سرد آہ بھری تھی۔

''یہ بہت لمبی کہانی ہے مس نازیہ! آپ کیا کریں گی سن کر۔''

عجیب شکستہ سا انداز تھا اس کا' نازیہ شیرازی اس لمحے بے ساختہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''کہہ لینے سے دل کا درد ہلکا ہو جاتا ہے مسٹر سنوان۔''

''اچھا!''

اس کے الفاظ پر بہت بے جان سی مسکراہٹ سنوان ہمدانی کے لبوں پر پھیلی تھی۔

''او کے..... اگر آپ کہتی ہیں تو مان لیتے ہیں' کیا جاننا چاہتی ہیں آپ میری زندگی کے متعلق؟''

اب وہ بھی برائے راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

ستاروں کی مانند جگمگاتی' مقناطیسی نگاہوں میں ایک عجیب سی چمک ہلکورے لے رہی تھی۔

نازیہ شیرازی نے اس لمحے بے ساختہ اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی تھی۔

''میں آپ کی آنکھوں میں تیرتے درد کی کہانی جاننا چاہتی ہوں مسٹر سنوان۔''

پھر سے نگاہوں کا محور بدل کر قطعی سپاٹ لہجے میں اس نے کہا تھا۔

''کیوں؟''

سنوانی ہمدانی کے مختصر سوال پر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

سوال ہی اتنا عجیب تھا کہ وہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتی تھی' کیا کہتی اس سے کہ کیوں وہ اس کا درد بانٹنا چاہتی ہے؟

اس لئے کہ یہ درد' خود اس کی اپنی بھی جاگیر ہے' یا پھر اس لئے کہ وہ ایک معصوم سے بچے کو ماں کی ممتا سے محروم دیکھ کر بے چین ہو گئی تھی اور اب اپنی اسی بے چینی کو ختم کرنا چاہتی تھی۔

احساس انسانیت کا تھا یا ہمدردی کا' وہ اس سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس خاموش بیٹھی رہی تھی۔

سنوان ہمدانی نے کچھ لمحوں تک اس کے بولنے کا انتظار کیا تھا' پھر اسے خاموش پا کر خود ہی درد کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

''وہ مجھ سے پیار کرتی تھی مس نازیہ' بے تحاشا پیار۔''

ایک مرتبہ پھر اسے ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ شاید سنوان ہمدانی نے بات ہی اتنی غیر متوقع کہہ دی تھی۔

''یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''سچ کہہ رہا ہوں' کیوں.....؟ کیا میں کسی کے چاہے جانے کے قابل نہیں ہوں۔''

سنوان ہمدانی نے اس کی حیرانگی سے غالباً لطف لیا تھا' تبھی وہ قدرے پشیمان ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں ...... ایسی بات نہیں ہے' اصل میں مجھے یہ سن کر بہت عجیب لگا ہے کہ آپ سے بے تحاشا پیار کرنے کے باوجود وہ آپ کو چھوڑ کر چلی گئی' کیوں؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے مس نازیہ' اس دنیا میں کچھ بھی غیر ممکن نہیں ہے۔''

سنوان ہمدانی کا لہجہ ہنوز شکستہ تھا' جب کہ نازیہ اس لمحے شدید دل گرفتگی محسوس کر رہی تھی۔

''کوئی ریزن تو ہوگا ناں' چاہتوں کا گنوا کر جینا آسان نہیں ہوتا مسٹر سنوان' محبت دل کی نگری کو اجاڑ کر چلی جائے تو ایک ایک پل کانٹوں پر بسر ہوتا ہے' یہ اذیت' وہ لوگ بخوبی جانتے ہیں' جن سے محبت روٹھ کر دور چلی جاتی ہے۔''

اس کی نگاہیں اب بھی پارک میں کھیلتے بچوں پر ہی مرکوز تھیں' مگر لہجہ کھویا ہوا تھا' سنوان ہمدانی اس لمحے اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا' مگر پھر جانے کیا سوچ کر خاموش رہا تھا۔

اگلے کچھ پل یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے تھے جب وہ ایک مرتبہ پھر دل گرفتہ لہجے میں بولی تھی۔

''میرا خیال ہے میں نے آپ کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا ہے' شاید مجھے آپ کے پرسنل معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہئے تھی۔''

''نہیں ...... ایسی بات نہیں ہے مس نازیہ!''

فوراً سے پیشتر اس نے اسے شرمندگی کے حصار سے باہر نکالا تھا۔

''دل کا بوجھ واقعی بہت بڑھ گیا ہے' میرا خیال ہے مجھے اپنے دکھ' آپ سے شیئر کر لینے چاہئیں۔''

ہلکی سی مسکراہٹ گداز لبوں پر سجا کر اس نے کہا تھا کہ عین اسی پل سلمان بھاگ کر نازیہ کی گود میں آ بیٹھا۔

''یہ بہت تنگ کرتا ہے آپ کو' آپ تو مائینڈ تو نہیں کرتیں مس نازیہ!''

یہ سوال وہ کافی دنوں سے پوچھنا چاہ رہا تھا' مگر موقع ہی نہ مل سکا تھا۔

تاہم اس لمحے اس کے سوال پر نازیہ شیرازی نے بہت پیار سے ننھے سلمان کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں ...... کیونکہ دنیا میں شاید ہی کوئی بدنصیب شخص ایسا ہوگا جسے محبت بری لگتی ہوگی' آپ یقین کریں مسٹر سنوان' اس بچے کی اپنے لئے محبت دیکھ کر جانے کیوں مجھے ایسا لگنے لگا ہے جیسے یہ میرا ہی بچہ ہے' میں نے ہی جنم دیا ہے اسے' میرے ہی وجود کا ایک حصہ ہے یہ۔''

سلمان اس سے پیار کروا کر' پھر اپنے دوستوں کے پاس بھاگ گیا تھا' جب اس نے کہا تھا۔

جواب میں سنوان ہمدانی کے لبوں پر ایک مرتبہ پھر جیسے خاموشی کا قفل پڑ گیا تھا۔

''بہت پیارا بچہ ہے' سچ کہتی ہوں مسٹر سنوان آپ کی وائف بہت بدنصیب عورت ہے جو اتنے پیارے بچے کے پیار سے محروم ہے' شاید آپ نہیں دیکھ سکتے کہ اس بچے کے ایک ایک عمل میں کتنی پیاس

ہے' اندر سے کس قدر سہما ہوا ہے یہ بچہ۔''

سنوان خود بھی اس پہلو سے واقف تھا۔ تاہم اس وقت لب بھینچتے ہوئے' وہ ایک سرسری سی نگاہ اس کے سادہ سراپے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مس نازیہ! بہرحال میرا خیال ہے اب ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ کسی بھی وقت موسم خراب ہو سکتا ہے۔''

''ہاں ...... آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' سنجیدگی سے کہنے کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ اسے پہلی بار وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔

♦ ♦ ♦

ثمرن ازہان اس لمحے اسفند شیرازی کے کیبن میں اس کے مقابل بیٹھی تھی اور وہ عجیب افسوس خیز سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آئی ڈونٹ نو مس ثمرن! کہ میں جب بھی آپ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں' تو مجھے کوئی اور کیوں یاد آتا ہے؟''

''کوئی اور ...... سے کیا مراد ہے آپ کی؟''

وہ اس کی کیفیت سے باخبر تھی' مگر جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی۔ اس لمحے حقیقتاً اسے اسفند شیرازی کی بے بسی پر مزہ آ رہا تھا۔ ذہن میں ایک ایک کر کے وہ سارے مناظر گھومنے لگے تھے' جب اسفند شیرازی نے اسے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔

بے قصور ہوتے ہوئے بھی اس کی روح کو داغدار کر دیا تھا۔

وہ اب بے چین سا' اپنی سیٹ سے اٹھ کر گلاس وال کی جانب چلا آیا تھا۔

''کیا بتاؤں اس کے بارے میں' پتہ نہیں کب زندگی میں آئی اور چلی گئی۔''

عجیب الجھا ہوا سا انداز تھا اس کا' ثمرن ازہان بے ساختہ چونک اٹھی تھی۔

''آپ ...... کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں سر؟''

''پتہ نہیں۔''

قطعی بے بسی کے عالم میں ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑا تھا۔ پھر واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''میں آپ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں مس ثمرن! کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گی؟''

''کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟''

اس کا انداز اب بھی وہی تھا۔ جانے کیوں اسفند شیرازی کو اس سے کچھ بھی کہنا مشکل لگ رہا تھا۔

''کچھ خاص نہیں' بس یہی کہ آپ کے گھر میں' آپ کے علاوہ اور کون کون ہے اور آپ نے یہ جاب کیوں جوائن کی؟''

کچھ لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا تھا' تبھی ثمرن جانچتی نگاہوں سے اس کے مضطرب چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں' حال ہی میں پاکستان آنا ہوا ہے' یہاں میرا ددھیال ہے انگلینڈ میں تنہائی کی زندگی سے تنگ آ کر یہاں پاکستان آئی ہوں' گھر میں سبھی کزنز مصروف ہوتے ہیں' گھر کا کام کاج مجھے آتا نہیں ہے' لہٰذا بوریت سے اکتا کر یہ جاب سٹارٹ کر لی۔''

اس کی کسی بھی بات میں نہ تو جھوٹ تھا' نہ جھول۔

ایک دم سے جیسے بہت زیادہ اعتماد آ گیا تھا اس میں۔

اسفند شیرازی بہت توجہ سے اسے بولتے ہوئے سن رہا تھا۔

''او کے' میں بھی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں' ویسے مما کی وفات کے بعد ڈیڈ نے دوسری شادی کر لی' سکینڈ وائف سے دو مزید بچے ہیں ان کے' مگر میں سمجھیں اکلوتا ہی ہوں' بہر حال کیا آپ آج کا لنچ میرے ساتھ کرنا پسند کریں گے۔''

وہ فطرتاً سخت مزاج نہیں تھا اور یہ بات اس سے ملنے والا ہر شخص جانتا تھا' ماسوائے ثمرن ازہان کے جو اتنی جلدی اس کے خود پر مہربان ہو جانے پر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔

''وائے ناٹ سر! میرے لئے اعزاز کی بات ہے یہ۔''

''تھینکس مس ثمرن!''

اسفند شیرازی کے لہجے میں ایک مدت کے بعد بشاشت دیکھنے میں ملی تھی۔

اس روز ثمرن' اسفند کے کیبن سے نکل کر اپنی سیٹ پر واپس آئی تو از حد مسرور تھی۔

گزرتے ہر پل کے ساتھ اسے اپنی منزل قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اسفند شیرازی کی بربادی' اس کی زندگی کا واحد دلچسپ مقصد تھا' لہٰذا اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے۔ وہ ہر قسم کے پل صراط سے گزر سکتی تھی۔

♦ ♦ ♦

ازہان یزدانی سے بڑے حمدان یزدانی کی شادی کی تقریب نے پوری حویلی کے گوشے گوشے میں رنگ و نور کے انمول موتی بکھیر کر رکھ دیئے تھے۔

سبھی اپنے اپنے زخم چھپائے' مطمئن و مسرور دیکھائی دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

تاہم خوشی کے اس موقع پر بھی اس نے داداجی کو اپنے مخصوص کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا تھا۔

یں اس کی آمد کو دو تین ماہ ہو گئے تھے' مگر اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی اپنے داداجی کی جھلک بھی تھی۔

وہ نہ تو کمرے سے باہر آتے تھے' نہ ہی ازہان کے علاوہ اور کسی کو بھی ان کے کمرے میں جانے کی تھی۔

آج مہندی کا فنکشن تھا' لہٰذا حویلی کے اندر رنگ و نور کا گویا اک سیلاب امڈا ہوا تھا۔ کچھ رشتہ دار اور لڑکے' جن سے سبرینہ ابھی واقف نہیں تھی' وہ حمدان بھیا کو گھیرے میں لئے آج کے فنکشن کے ے تنگ کر رہے تھے' خوب ہنس بول رہے تھے' بڑی بوڑھیاں اپنی اپنی مصروفیات میں الجھی ہوئی ب کہ سبرینہ ادھر سے اُدھر چھوٹے چھوٹے مختلف کام سرانجام دیتے ہوئے خود کو مصروف ظاہر کر

وہ کچن سے ایک بچے کے لئے دودھ کا فیڈر بنا کر نکلی ہی تھی۔ کہ ازہان کو سامنے سیڑھیوں سے ہوئے دیکھ کر وہیں رُک گئی۔ جب کہ وہ قطعی بے نیازی سے اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے فاصلے پر کھڑی ذرنشاء کی طرف بڑھ گیا۔

''میرے کپڑے کہاں ہیں؟ پریس کئے کہ نہیں؟''

قدرے روڈ سا انداز اپناتے ہوئے اس نے اپنے مقابل کھڑی ذرنشاء سے پوچھا تھا' جسے اس کی ونے کا قابل فخر اعزاز حاصل تھا۔

''سوری' مجھے یاد نہیں رہا' ویسے بھی ابھی تو میں مہندی لگوانے جا رہی ہوں' آپ کسی اور سے کہہ ''

''کیوں کسی اور سے کہوں میں؟ تم میری بیوی ہو' میری ہر ضرورت کا خیال رکھنا تمہارا فرض ہے۔''

خصوصی زور دیتے ہوئے اس نے اپنے اندر کا غبار نکالا تھا۔ جب اس نے ذرنشاء کو لاپرواہی سے ئے سنا۔

''میری ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے ازہان' کیوں بار بار یہ بات یاد دلانی پڑتی ہے تمہیں اور ویسے بھی ڑ بیویوں والے طور طریقے نہیں آتے' سوری۔''

زاکت سے کہنے کے ساتھ ہی' وہ اٹھلاتی ہوئی اس کی سائیڈ سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی' جب کہ ں کی اس درجہ بدتمیزی پر غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے واپس اپنے کمرے کی طرف اوپر چلا گیا اسی لمحے ازہان کے ساتھ ساتھ سبرینہ کو بھی قدرے مغرور سی ذرنشاء پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔

تاہم اس کے باوجود' اس نے اسے مخاطب کر کے ازہان کے کپڑوں کے متعلق پوچھا' پھر دادی ماں ے اس کا کرتے تھری پیس سوٹ اٹھا کر پریس کرنے کے بعد وہ اپنی تمام تر ہمت اکٹھی کرتے ئے کمرے میں چلی آئی۔

ازہان اس وقت اپنے بیڈ پر اوندھا لیٹا جانے کن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

سبرینہ دروازہ ہلکے سے ناک کر کے کمرے کے اندر داخل ہوئی تو اس نے فوراً پلٹ کر ا
اجنبی نگاہ ڈالی تھی۔

"یہ...... یہ آپ کے کپڑے پریس ہوگئے ہیں لیجئے۔"

اس کے گھورنے پر وہ نا چاہتے ہوئے بھی پزل ہو کر رہ گئی تھی۔

"کس نے پریس کیئے ہیں؟"

وہی اس کا کھا جانے والا غصیلا انداز' سبرینہ کو اس لمحے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"میں نے کیئے ہیں۔"

سر جھکا کر عجیب مجرمانہ سے انداز میں اس نے کہا تھا' جب وہ شدید برہم ہو کر اسے مقابل
ہوا۔

"کیوں کیئے ہیں' بہت شوق ہے تمہیں مجھ سے ہمدردی جتانے کا' بولو...... کیا چاہتی ہو تم؟"

خوبصورت نگاہوں سے چھلکتی سرخی اور ماتھے پر پڑی شکنوں نے ایک لمحے میں سبرینہ کی آ
آنسوؤں میں بھر دیا تھا۔

"نہیں چاہیئے مجھے کسی کی ہمدردی' نہیں ہوں میں اس قابل کہ کوئی اپنی نوازشیں لٹائے!
پلیز۔"

ایک لمحے میں ہی اس کا لہجہ بدلا تھا۔ شدید برہمی کی جگہ' اب قدرے بے بسی نے لے
سبرینہ کے لئے دل کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید وہ کب کی اس پر دو حروف بھیج کر وہاں سے رخصت
تاہم اس وقت اس نے تیزی سے اپنے آنسو پونچھ کر پھر سے حوصلہ افزاء نگاہوں سے اس کی طر
تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں' ہے ناں؟"

ازہان اس بار قطعی خاموش رہا تھا۔ شاید اس وقت اس ڈھیٹ لڑکی سے مغز کھپانا' اسے دشو
تھا۔ تبھی وہ رُخ پھیرے اس سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم اس کی اس خاموشی
کی ہمت مزید بڑھی تھی۔

اس کے کمرے میں صوفے کے قریب وہ کچھ دیر کھڑی' سوچوں میں گم رہی تھی' پھر جانے
کر نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے مقابل آ بیٹھی۔

• • •

مرے میں اس وقت نائٹ بلب روشن تھا' جب کہ وہ پلکیں موندے بیٹھی' بے آواز رو
اس وقت تن... کی ساعتیں' اپنے فیورٹ گیت کے اداس بولوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ گانے وا

کمال کا درد سمیٹ کر اس کے دل کو چھوتے ہوئے الفاظ منہ سے نکالے تھے۔

یاد پیا کی آئے...... آئے' یاد پیا کی آئے
بیری کوئلیا راگ سنائے
مجھ برہن کو راس نہ آئے
من میں جوت جگائے' یاد پیا کی آئے
بالی عمریا سن رے سجنوا
جوبن بیتا جائے' ہائے
یاد پیا کی آئے

کمرے کی کھڑکی سے باہر برستی بارش کی "تباہ کاریاں" وہ بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ زمین پر گرتی بارش کا ایک ایک بوند میں اسے اپنے دل کا درد بکھرتا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

اندر سینے میں ایک عجیب سی گھٹن گزرتے ہر پل کے ساتھ جیسے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رخصت ہوتے دسمبر کا ایک ایک اداس لمحہ اس کے اندر ایک عجیب سی آگ لگا رہا تھا۔

سلمان علوی کی یاد کے جھونکوں نے پھر سے بے قرار کر کے رکھ دیا تھا اسے' پورے بدن میں تپش سی پھیل گئی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ جتنا وہ اسے بھلانے کی کوشش کرتی تھی' اتنا ہی وہ اس کی روح میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

پورے سات سال گزارنے کے بعد بھی وہ اس کی یادوں میں روزِ اول کی طرح مکمل استحقاق لئے براجمان تھا۔

وہ یاد نہ بھی کرنا چاہتی تھی تب بھی اسے سلمان علوی سے ہونے والی پہلی ملاقات نہیں بھولتی تھی۔ وہ بھی اوائل دسمبر کے ہی دن تھے۔

فضا میں ہر وقت ایک عجیب سی سوگواریت اور اداسی کا احساس بسا رہتا تھا۔

ان دنوں وہ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ زندگی کے سبھی رنگ دلکش اور خوشگوار تھے۔ دل کے کسی کونے میں کہیں اداسی یا دکھ کا پڑاؤ نہیں تھا۔

اس سے چھوٹی صائمہ شیرازی' ان دنوں ابھی کالج میں انٹر ہوئی تھی۔ دونوں کی درسگاہوں کے راستے الگ الگ تھے' سو دونوں ہی مختلف اوقات میں ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھر سے نکلتی تھیں۔ محلہ کافی اچھا تھا اور کچھ اس کی اماں نے اوس پڑوس والوں سے کافی بنائی ہوئی تھی۔ لہٰذا ان کی غیر موجودگی اور موجودگی میں بھی محلے کی کوئی نہ کوئی عورت اس کی ماں کے پاس بیٹھی ہی رہتی تھی۔

ان دنوں نازیہ شیرازی کا مزاج قدرے شوخ اور چلبلا ہوا کرتا تھا۔ بات بات پر ڈانٹ نکالنے

کے ساتھ وہ چھوٹی چھوٹی غیر اہم سی باتوں کو دل پر لے کر پل میں مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتی تھی
کچھ ابا نے اس کا لاڈ بہت رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے بیٹی کی بجائے اپنا بیٹا کہہ کر ہی پکارتے تھے اور بیٹے کی
سے ہی دیکھتے تھے۔ کچھ اس چیز نے بھی اس کے مزاج کو آسمان پر پہنچایا ہوا تھا۔ اوائل سردیوں کے
دنوں میں ایک روز وہ یونیورسٹی آف ہونے کے بعد اپنی ایک فرینڈ کو ساتھ لے کر مارکیٹ چلی آئی تھی
جہاں سے اسے ضرورت کی چند کتابوں کے ساتھ ساتھ کچھ گھریلو اشیاء کی خریداری بھی مطلوب تھی۔

وہ دونوں ابھی ایک شاپ سے کچھ چیزیں خرید کر دکان سے باہر ہی نکل رہی تھیں کہ اچانک تیز
سے اندر داخل ہوتے ایک شخص کے ساتھ نازیہ شیرازی کا بری طرح ٹکراؤ ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں اس
شخص کے ہاتھوں میں تھما' بھاری کتابوں کا بنڈل ایک دم سے چھوٹ کر' اس کے نازک سے پاؤں پر آ گرا
اور وہ وہیں پاؤں پکڑ کر کراہ اٹھی۔

"اف ماں میرا پاؤں گیا۔"

اس کے الفاظ پر اس کی فرینڈ علینہ کے ساتھ ساتھ اس کے مقابل کھڑا وہ خوبرو سا شخص گھبرا کر رہ گیا
تھا جس کی قطعی نادانستہ ٹکراؤ ہوا تھا اس کے ساتھ۔

"آئی ایم سوری میم' میں ذرا جلدی میں تھا۔"

"آپ جلدی میں تھے' لیکن میرا پاؤں تو توڑ کر رکھ دیا ناں آپ نے' غضب خدا کا جان بوجھ کر آ
ٹکرائے' خوب سمجھتی ہوں میں آج کل کے لڑکوں کو' انہیں تو خدا موقع دے کسی خوبصورت دوشیزہ سے
ٹکرانے کا۔"

دو بدو لہجے میں کہتے ہوئے وہ تمیز کی تمام حدود کو پل میں پھلانگ گئی تھی۔ جب کہ اس کے مقابل
کھڑا وہ شخص' قدرے حیرانگی سے اس کی سمت دیکھتے ہوئے مزید سنجیدہ ہوا تھا۔

"ایکسکیوز می میم' آپ ضرورت سے زیادہ خوش فہم ہو رہی ہیں۔"

ارے واہ' ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری' میں خوش فہم واقع ہو رہی ہوں اور آپ' آپ تو اچھے
خاصے صحت مند ہوتے ہوئے بھی نابینا بننے کا ڈھونگ رچا رہے ہیں اوپر سے معصومیت تو دیکھیں' جان
بوجھ کر ٹکرا گئے اور اب مکر رہے ہیں۔"

"نازی پلیز یار! کیوں سر راہ اپنا تماشہ بنا رہی ہو۔"

اسے غصے سے سرخ ہوتے دیکھ کر' علینہ نے دبے دبے سے لہجے میں کہا تھا۔ جواب میں وہ مزید
بھڑکتے ہوئے بولی۔

"واہ یہ بھی خوب کہی تمہیں بھی میں ہی قصور وار نظر آتی ہوں اور انہوں نے جو دو من کا وزن میرے
نازک سے پاؤں پر گرا کر ظلم کی انتہا کی ہے' اس کا کیا؟"

علینہ اس وقت اسے کچھ بھی سمجھانے کی پوزیشن میں نہیں تھی' لہٰذا خاموش کھڑی رہی' جب کہ اس

ڑا وہ خوبصورت سا شخص۔ اس بار مبہم سا مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وری میڈم! پہلی خطاء سرزد ہوئی ہے مجھ سے' اس کی معافی دے دیں۔ آئندہ کے لئے میں
ہوں کہ ہر لڑکی سے دس گز دور رہ کر چلا کروں گا۔"

کے۔"

ی نگاہوں سے پل دو پل کے لئے اسے گھورنے کے بعد' وہ فخریہ انداز میں گردن اکڑاتے
ے باہر نکل آئی تھی۔

روز علینہ نے اسے اس کی بے باکی پر خوب ڈانٹا تھا' مگر وہ ہمیشہ کی طرح سنی ان سنی کرتے
ائی سے مسکراتی رہی تھی۔

واقعے کے تقریباً دو تین ماہ کے بعد سلمان علوی سے اس کی دوسری غیر متوقع ملاقات ہوئی تھی
ان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا' دسمبر کے خنک دنوں کی نسبت فضاء میں قدرے خوشگواریت تھی۔
نیورسٹی سے چھٹی کے بعد علینہ کے ساتھ بس کے تھرو گھر واپس آ رہی تھی جب اچانک ایک
ی بس الٹ گئی۔ ڈرائیور تو حادثہ ہوتے ہی اپنی سیٹ چھوڑ کر کہیں فرار ہو گیا تھا' جب کہ بس میں
' اس اچانک ناگہانی پر واویلا مچانے لگے تھے۔ علینہ اور وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھی تھیں۔
الٹنے کے بعد دونوں کو ہی اپنا کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔ زخموں کی شدت کے باعث دونوں ہی فوراً
ہواس سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ اردگرد موجود مسافر بھی اپنی اپنی حالت پر کراہ رہے تھے۔
نے کتنا وقت دبے پاؤں گزر گیا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو ایک کشادہ سے صاف ستھرے
بستر پر پا کر حیران رہ گئی تھی۔ سر بازو اور پشت پر لگنے والے زخموں کی تکلیف نے اسے
ہوڑا تھا۔

بھی اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی۔ کہ کسی کی نہایت اپنائیت
آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

سلام علیکم! اب آپ کیسی ہیں مس نازیہ!"

یہ شیرازی نے فوراً سے پیشتر گردن گھما کر اپنے بائیں طرف دیکھا تھا' جہاں اس کے بیڈ کے
بری کرسی پر ایک شناسا سا شخص متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ھے سلمان کہتے ہیں' ابھی دو تین ماہ قبل مارکیٹ میں ٹکراؤ ہوا تھا آپ سے' کچھ یاد آیا؟"

وچتی نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر' وہ خاصی سرعت سے بولا تھا۔ جب وہ سر پر ہاتھ
ہوں کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

ں مجھے یاد ہے مگر میں...... میں یہاں کیسے؟ آپ کیوں لائے ہیں مجھے یہاں؟"

اس کے سوال پر سلمان علوی چند لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کی تھی۔ پھر اس کی ڈرپ چیک

کرتے ہوئے قدرے لاپرواسے لہجے میں بولا۔

"آپ کی حالت بہت سیریس تھی مس نازیہ! میں اپنے اک دوست سے مل کر گھر وا
جب اتفاقیہ اسی روڈ سے گزرتے ہوئے آپ پر نگاہ پڑ گئی' سب لوگ اپنے اپنے جانے وال
رہے تھے' بس ایک آپ ہی قدرے فاصلے پر بے یارومددگار پڑی دکھائی دے رہی تھیں۔
دوست کے ساتھ' آپ کو لے کر ہوسپٹل چلا گیا' جہاں پورے سات گھنٹے ڈاکٹرز کی نگہداشت
کے بعد آپ یہاں پرائیویٹ روم میں شفٹ ہوئی ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی دیر میں صبح ہونے وال
میں آپ کے گھر والوں کو کال کر کے یہاں بلالوں گا۔"

اس نے اپنی گندمی رنگت پر کھڑے تیکھے نقوش' چوڑی پیشانی' ستاروں کی مانند جگمگاتی
نگاہیں' پیشانی پر بے ترتیبی سے بکھرے گھنگھریالے بال' بھرے بھرے گداز ہونٹوں پر جھکی سیاہ
واقعی اس قابل تھا۔ کہ اسے وہ جی بھر کے دیکھا اور سراہا جاتا۔

اس وقت وہ ڈارک گرے شلوار سوٹ میں ملبوس' بے حد جاذب نظر دکھائی دے رہا
شیرازی کو اس لمحے نا چاہنے کے باوجود بھی اس کے دلکش سراپے سے نگاہ ہٹانی پڑی تھی۔

"شکریہ سلمان صاحب' میں اپنی پہلی ملاقات والی بدتمیزی پر حد درجہ شرمندہ ہوں۔"

"آں ہاں' آپ کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اسی ملاقات کی وجہ سے
آپ کو بھلانے میں ناکام رہا ہوں۔"

اس لمحے سلمان علوی کے گداز لبوں پر عجیب سحر انگیز سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ بے شک
مسکراہٹ کو دنیا کی سب سے زیادہ حسین مسکراہٹ قرار دے سکتی تھی۔

"آپ رات بھر سے جاگ رہے ہیں؟"

خوبصورت غلافی آنکھوں سے بڑے سرخ ڈوروں کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔
چپکے سے نگاہ چراتے ہوئے بولا۔

"ہاں اصل میں آپ کی کنڈیشن تسلی بخش نہیں تھی' پھر نیند بھی نہیں آرہی تھی۔"

اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے وہ اسے مزید اچھا لگا تھا۔

Love at first sight کی قائل نہیں تھی۔ نہ ہی اس کا دل اور کردار کمزور تھا۔ مگر
باوجود وہ بس اسی ایک ملاقات میں سلمان علوی کی سحر انگیز شخصیت کی گرویدہ ہو کر رہ گئی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ اس کی ہمراہی میں اسے نے تو اپنی کسی تکلیف کا احساس رہا تھا'
والوں کی کوئی پرواہ ہو رہی تھی۔

اس لمحے اسے اپنا آپ کسی فلم یا کہانی کی ہیروین کی مانند ہی لگ رہا تھا۔

وہ جو بناخہ صفت' نہایت کھری لڑکی تھی۔ بڑے بڑے لوگوں کو اپنی ذہانت اور حاضر جوا

ڑا دیتی تھی۔ اس وقت سلمان علوی کی سحر انگیز شخصیت کے سامنے' نگاہ اٹھا کر بات کرنا بھی
تھا اس سے۔

ت کی پہلی دستک نے اسے خود اپنے آپ سے بے نیاز کر کے رکھ دیا تھا۔

نوں وہ اتنی خوش رہا کرتی تھی' کہ خود اس کے گھر والے بھی اس کے چہرے کی طرف نگاہ بھر کر
ے تھے کہ مبادہ اسے ان کی نظر ہی نہ لگ جائے۔

♠ ♠ ♠

باس نقوی سنعیہ کی زندگی میں کیا آیا۔ اس کے جیون کا ڈھب ہی بدل کر رہ گیا۔

کہتے ہیں محبت انسان کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔"

ے بھی عمر عباس نقوی کی محبت نے خوبصورت بنا دیا تھا۔

ہو پہلے ہمہ وقت گھریلو کاموں میں الجھ کر خود سے لاتعلق رہتی تھی۔ اب اس کے اندر یہ احساس
شروع ہو گیا تھا کہ وہ بھی ایک انسان ہے' زندہ انسان' لہٰذا اسے بھی اپنا خیال رکھنا چاہئے۔

ت کے معاملے میں' یہ تصور ہی کتنا خوش کن ہوتا ہے کہ آپ "کسی" کے لئے "اہم" ہیں۔

یا میں کوئی جب آپ کو سوچتا ہے' آپ کی طلب کرتا ہے' پروا کرتا ہے۔ وہ بھی جب جب عمر عباس
تعلق سوچتی تھی' اس کا انگ انگ مہک اٹھتا تھا۔ مسکراہٹ آپ ہی آپ خوبصورت لبوں پر بکھر
تی۔

روز رات میں فون کر کے تمام دن کے احوال کی خبر لینا' اب عمر عباس نقوی نے اپنا معمول بنا لیا
کتنا ہی مصروف ہوتا' ملک میں ہوتا یا ملک سے باہر اسے کال کر کے اس کا حال احوال پوچھتا بھی
ا۔

ول عمر کے اسے سنعیہ کی آواز سے بغیر نیند ہی نہیں آتی تھی۔

اسے ذرا سا بھی فلو یا ٹمپریچر ہوتا اور یہ بات عمر کو اس کی آواز سے پتہ چل جاتی' تو وہ اسے خوب
نے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔

ل روز سنڈے تھا۔ لہٰذا کالج سے چھٹی کے باعث گھر کے سارے کام کاج کا بوجھ اس کی اکیلی
پڑا تھا۔ اوپر سے اس کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ پھر عمر کے آسٹریلیا میں ہونے کی وجہ سے تین چار
اس سے بات بھی نہیں ہو پائی تھی' کیونکہ اس کے پاپا کسی ضروری کام کے سلسلے میں فون اپنے
مار کھنے لگے تھے۔

ل عمر کی ایک دو بار ان سے بات ہوئی تو مایوس ہو کر اگلے دو دن تک اس نے فون ہی نہیں کیا۔

ہر سے وہ حد درجہ بے قرار تھی۔

اگر اس کی مما زندہ ہوتیں تو شاید حالات اس کے اپنے اختیار میں ہوتے۔ یہی بات سوچ

سوچ کر وہ پل پل کڑھتی رہی تھی۔

پہلی بار گھر کے کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

مسز غیاث اور پنکی اس گھریلو کاموں میں الجھا کر خود مزے سے شاپنگ کرنے کے
تھیں۔ سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا' جب کہ آنکھیں بے تاب بھر آنے کو تیار ہو رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے اس نے صبح کا کام سمیٹا اور اپنے لئے چائے بنانے کی غرض سے کچن
تاہم ابھی اس نے پتیلی میں دودھ پتی ڈال کر اسے چولہے پر رکھا تھا کہ کسی نے دبے پاؤں پیچھے
اس کی آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

سعیہ کو پلٹ کر پیچھے اک نگاہ ڈالنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔

گھر میں اس کی اکیلی ذات کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا' لہٰذا وہ بے حد گھبرا کر رہ گئی تھی۔

تاہم اس کے پہلے کہ وہ اپنی آنکھوں پر رکھے ہاتھ جھٹک کر پیچھے پلٹتی کسی کی گرم گرم
ساتھ ابھرتی مدھر سرگوشی اس کے دل کی دھڑکنوں میں اودھم مچا گئی۔

''کیسی ہو عزیز از جان؟''

یہ آواز یہ لہجہ تو وہ ہزاروں میں پہچان سکتی تھی' تبھی سرعت سے اپنی آنکھوں پر رکھے ہا
فوراً پیچھے پلٹی تھی۔

''آ......آپ؟''

نگاہوں میں حد درجہ حیرانگی' وقدرے خوف سمیٹے وہ اپنے سامنے کھڑے خوبرو سے عمر عبا
دیکھ رہی تھی۔ جو اسے اپنے سامنے کھڑی دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا نی' اتنی بھیانک شکل تو نہیں ہے میری کہ تم یوں سہم کر رہ گئی ہو۔''

وہی اس کا کھلنڈرا شوخ انداز سعیہ کا دل اس وقت کسی خشک پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔

''آپ......آپ یہاں کیوں آ گئے؟ مما میری جان نکال دیں گی عمر!''

اس کی خوبصورت نگاہوں سے چھلکتا خوف' عمر عباس نقوی کے حوصلے مزید بڑھا گیا تھا۔

کچھ پل خاموش دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھنے کے بعد اس نے کمال جرأت کا شا
کرتے ہوئے اس کا معصوم سا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیا تھا۔

''اتنی خوف زدہ کیوں ہو نی' میں ہوں نا' کوئی میرے ہوتے ہوئے بھی پھولوں کی چھڑ
چھوئے' میں برداشت نہیں کروں گا' یہ سارے خوف' یہ ڈر دل سے نکال کیوں نہیں پھینکتی تم۔''

اس لمحے اس کا گھمبیر لہجہ امرت بن کر سعیہ غیاث کی سماعتوں میں اترا تھا۔ ہزار ضبط ک
کے باوجود بھی آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر پھسل آئے تھے' جنہیں عمر عباس نقوی نے نہایت
ساتھ اپنی انگلیوں کی پوروں پر سمیٹ لیا تھا۔

''میں آپ کی اس درجہ محبت کے قابل نہیں ہوں۔''

نگاہیں جھکا کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں اس نے کہا تھا' جب وہ اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے
بولا۔

''تم کس قابل ہو' یہ تم نہیں جانتیں سعیہ' ویسے بھی تمہیں میری محبت کو لے کر کچھ بھی الٹا سیدھا
سوچنے کا حق نہیں ہے' چلو شاباش اب ایک اچھی اسٹرونگ سی چائے پلا دو' پھر حال احوال پوچھتے ہیں ایک
دوسرے کا۔''

وہ اس درجہ مطمئن تھا گویا اسے کسی کے آنے کا کوئی خوف ہی نہ ہو' جب کہ سعیہ غیاث اپنے خوشی
سے برقرار ہوتے دل کو ڈپٹ کر' کسی بھی لمحے' کسی کے آ جانے کے خوف سے زرد پڑ رہی تھی۔

♦♦♦

لوگ کہتے ہیں کہ ہم تجھ سے کنارہ کر لیں
تم جو کہہ دو تو ستم یہ گوارہ کر لیں
تم نے جس حال پریشاں سے نکالا تھا ہمیں
آسرا دے کے محبت کا سنبھالا تھا ہمیں
سوچتے ہیں کہ وہی حال دوبارہ کر لیں
یوں اب تجھ سے ملاقات نہیں ہو سکتی
مل جاؤ تو کوئی بات نہیں ہو سکتی
آخری بار خیالوں میں بلا لیں تم کو
آخری بار کلیجے سے لگا لیں تم کو
آخری بار ذرا ذکر تمہارا کر لیں
اور پھر اپنے تڑپنے کا نظارہ کر لیں

وہ ملول سی اکیلی سرسبز لان میں بیٹھی' اپنے شفاف ہاتھوں کی لکیروں پر خالی خالی سی نگاہ ڈال کر ان
میں شہروز علوی کا نام تلاش کر رہی تھی۔ جب وہ نک سک سا فل تیار ہو کر دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر کی
چین گھماتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر لان میں سیدھا اس کی طرف چلا آیا۔

''ہیلو ثمرن...... خیریت تو ہے' یہاں اس طرح سے اکیلی کیوں بیٹھی ہو تم۔''

اس کی خوبصورت آنکھوں میں ثمرن ازہان کی محبت کا جو عکس چھلکنے کو بیقرار رہتا تھا۔ وہ عکس اس
سے کبھی مخفی نہیں رہ سکا تھا۔ تاہم شہروز علوی کی زبان اس کی آنکھوں کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔

تبھی وہ ایک بجھی سی نگاہ اس کے فریش چہرے پر ڈالنے کے بعد پھر سے نظر جھکاتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں' یونہی دل مکدر ہو رہا تھا تو ان پھول پودوں کے بیچ آ بیٹھی۔ تم سناؤ کہیں جا رہے ہو

کیا؟''

''ہاں یار! وہ تابی ہے ناں' میری نیو فرینڈ' اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی ایک لنچ بی ڈیو ہے اس کا مجھ پر بس اسی لئے اس کی طرف جا رہا تھا' تم چلوگی ساتھ؟''

''نہیں۔'' مختصراً اداس لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی وہ وہاں سے اٹھ کر اندر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ تو شہروز بے ساختہ گہری سانس لے کر وہیں کین کی چیئر پر ٹک گیا۔

''کیوں جھوٹ پر جھوٹ بول کر اسے خود سے بدگمان کر رہے ہو شہری۔''

احتشام جو ساری کاروائی دیکھ چکا تھا' اچانک اس کے مقابل آ کر بولا۔ تو شہروز نے آہستہ سے اپنی پلکیں موند لیں۔

''عورت محبت کے معاملے میں بہت حساس ہوتی ہے شامی' کسی عورت مرد کی بٹی ہوئی توجہ برداشت نہیں کرسکتی۔ ثمرن بھی ایسا ہی کرے گی' میری ان فرضی کہانیوں سے جیلسی ہو کر وہ اپنے دل حال کھول کر رکھ دے گی' دیکھنا تم' اسے مجھ سے خود اپنے پیار کا اظہار کرنا ہی پڑے گا۔''

اتنے بہت سارے دن گزر جانے کے باوجود بھی شہروز علوی کی سوچ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس لمحے احتشام نے ایک افسوس بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بے ساختہ اس کے سدھرنے کی دعا کی تھی۔

• • •

اِک شخص کو کھو دینے کا ڈر کیوں نہیں جاتا
یہ بوجھ میرے دل سے اتر کیوں نہیں جاتا
منزل پہ پہنچ کر مجھے اسے کھونا پڑے گا
یہ طے ہے تو پھر شوق سفر کیوں نہیں جاتا

ازہان اپنے بیڈ کے کنارے پر اس سے رخ موڑے بیٹھا تھا' جب کہ وہ اس کے مقابل کے قدموں میں بیٹھی۔ عجیب پیاسی نگاہوں سے اس کے غضیلے چہرے کو دیکھتی جا رہی تھی۔

''تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ کیوں میرا ضبط آزمانے پر تل گئی ہو تم؟''

اسے چپ چاپ خاموشی سے اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ پھر برہم ہوتے ہوئے غصے سے دھاڑا تھا۔ جب وہ قطعی پرسکون لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ یہ سب ری ایکٹ کر کے' کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں' کہ دنیا میں آپ سے زیادہ برا کوئی نہیں' کیوں خود کو وہ منوانے پر تلے ہوئے ہیں جو آپ نہیں ہیں۔''

ازہان کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ سب کہے گی' تبھی وہ چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

''پلیز ازہان' میں جانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے ہیں' مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ذرنش کو بہت ہیں' اس کا رویہ آپ کو ہرٹ کرتا ہے' لیکن ازہان انسان جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی نظر میں نہیں رکھتا' آپ چاہیں تو اسے اپنی محبت سے بدل سکتے ہیں۔''

''شٹ اپ جاؤ یہاں سے' مجھے تمہارے نادر مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔''

اس کے پرسکون لہجے کے جواب میں وہ پھر درشتگی سے دھاڑا تھا۔ جواب میں سبرینہ کا چہرہ ایک رخ پڑ گیا۔ اس لمحے اسے سارہ کی کہی گئی ہر بات سچ معلوم ہو رہی تھی۔

ایک پل کے لئے تو اس کا دل چاہا کہ وہ اسے خوب کھری کھری سنا کر وہاں سے رخصت ہو جائے' دوسرے ہی پل وہ ضبط کے پل صراط سے گزرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''سوری' میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔''

ازہان جتنا اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اتنا ہی ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ تنگ آ کر ہار مان گیا تھا۔

''بہت ڈھیٹ لڑکی ہو تم' جاؤ پلیز' میں تیار ہو کر نیچے آ رہا ہوں۔''

''تھینکس۔''

سبرینہ کو لگا اس کے ان چند الفاظ سے اسے اپنی ساری محنت کا صلہ موصول ہو گیا ہو۔

ازہان کے کمرے سے نکلنے کے بعد' وہ خود اپنی تیاری میں مصروف ہوئی تھی۔

کریپ کے باریک سوٹ پر ستاروں اور دودھیا نگینوں سے کئے گئے ہلکے پھلکے کام نے اس کی ت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ کپڑوں کی مناسبت سے اس نے میک اپ بھی ہلکا پھلکا ہی کر رکھا تھا' کے باوجود وہ جیسے پوری محفل پر چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

تقریباً آدھ پون گھنٹے کے بعد مکمل تیار ہو کر وہ نیچے وسیع ہال میں آئی' تو ازہان کو کچھ ہی فاصلے پر لباس کے ساتھ' محو گفتگو دیکھ کر وہ ایک اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کچن کی طرف چلی آئی جہاں یڈی' حائقہ بیگم موجود تھیں۔

''ماشاءاللہ خدا نظر بد سے محفوظ رکھے' میری بیٹی تو سچ مچ چودھویں کا چاند دکھائی دے رہی ہے''

ان کی نگاہ جیسے ہی سبرینہ کے خوبصورت چہرے پر پڑی وہ دل سے انہیں سراہے بغیر نہ رہ سکیں اور بڑھ کر اس کی صبیح پیشانی پر ایک محبت بھرا بوسہ ثبت کر دیا۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں پھپھو؟''

وہ انہیں کام میں مصروف دیکھ کر پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی' جواب میں وہ اپنے پانی سے گیلے ہاتھ پٹے کے پلو سے خشک کرتے ہوئے بولیں۔

"ازہان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' کل رات سے بہت تیز بخار ہے اسے' اوپر سے دوا نہیں کر
اس زرنشاء کی بچی کو تو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے نہیں' اب میں اکیلی جان بھلا کیا کیا کروں؟ شادی
گھر ہے۔ مہمانوں کو سنبھالنا' دیکھ بھال کرنا' سب دیکھنا پڑتا ہے۔"

سبرینہ کو اس لمحے وہ اس سے دکھ شیئر کرتیں بہت اچھی لگی تھیں' تبھی وہ محبت سے ان کے تھامتے ہوئے بولی۔

"آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں پھپھو' میں ہوں ناں جو بھی کام ہے آپ مجھے کہیں بے شک نے یورپی معاشرے میں پرورش پائی ہے' مگر میری طبیعت میں عیش پسندی نہیں ہے پھپھو وہاں دیار میں رہ کر میں نے ہر کام کو سلیقے سے سرانجام دینے کی تربیت پائی ہے۔ آپ بلا جھجک مجھے ہر کام کہ ہیں۔"

"خدا تمہیں سدا خوش رکھے میری بچی' تو میرے احسن کی نشانی ہے' بس نگاہوں کے سامنے پھرتی رہ یہی خوشی بہت ہے میرے لئے۔"

حائقہ بیگم واقعی اس کے خلوص پر نثار ہو کر رہ گئی تھیں۔

"پھر بھی پھپھو آپ پلیز وہاں حمدان بھیا کے پاس جا کر مہمانوں کو دیکھیں' میں ازہان کے لئے بناتی ہوں۔" بعد اصرار انہیں شانوں سے تھام کر وہاں سے ہٹاتے ہوئے اس نے کہا تو حائقہ بیگم ا منہ چوم کر اسے دعا دیتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

ہال میں مہندی کے فنکشن کو خوب انجوائے کرتے ہوئے' سبھی خوب ہلا گلہ کر رہے تھے' درمیان بار سب سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے' حمدان کو تھوڑا سا زچ کر کے آئی تھی۔ اس وقت ازہان قریب ہی ہو' اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

تفسیر عباس سے بھی ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی تھی اس کی' وہ اس سے اس کی بے نیازی کا گلہ کر رہا جب کہ زرنشاء اس کے پہلو میں چپکی اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھی۔

دادی ماں اس کی تعریف کرتی نہ تھک رہی تھیں' کیونکہ اس نے ہر کام یوں سنبھال لیا تھا گویا ا کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے یہ اسی کا فرض ہو' ہر کام بھاگ بھاگ کر سرانجام دیتی وہ انہیں اپنے دل بے حد قریب محسوس ہو رہی تھی۔

سارہ سے بھی اس کی اچھی خاصی فرینڈ شپ ہو چکی تھی۔ اعلیٰ اخلاق کے ساتھ' ساتھ سبھی اس کی انگیز خوبصورتی سے بھی متاثر تھے۔

سبرینہ ازہان کے لئے سوپ بنا کر کچن سے باہر نکلی' تو وہ اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں سے نکل چکا تھا۔

سبرینہ کو چونکہ اور بھی کام تھے لہٰذا وہ اس کی طرف سے لاتعلق ہو کر' سارہ کے ساتھ اسی کے اصرار

پھر سے ہال میں چلی آئی تھی۔

پچھلے کچھ ہی دنوں میں حمدانی بھیا کے ساتھ اس کی کافی فرینکنس قائم ہو چکی تھی۔

اس وقت بھی وہ فری ہو کر ان کے قریب آ کر بیٹھی' تو وہ ہنستے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر بولے۔

"بی' پلیز یار! تم ہی ان کو بلاؤں سے میرا پیچھا چھڑاؤ' الٹی سیدھی باتیں کر کر کے انہوں نے تو میرے دماغ کی چولیں ہلا دی ہیں۔"

"اچھا' تمہارے پاس دماغ بھی ہے؟"

اس کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تفسیر عباس نے سبرینہ کو موقع دیئے بغیر پھر اسے چھیڑا تو وہ شرارت سے چہرے پر ہاتھ پھیر کر اسے بدلے کی دھمکی دیتے ہوئے بولا۔

"کر لے تو بھی جگتیں' تیری قربانی کا ٹائم آئے گا تو میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔"

"ہاں معلوم ہے مجھے' اس معاملے میں تو پکے مسلمان ہو تم۔"

تفسیر فوراً ہی چڑتے ہوئے بولا تو وہاں موجود سبھی لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے' جانے ان لوگوں کے بیچ کس موضوع کو لے کر بحث و تکرار ہو رہی تھی۔

"حمدان بھیا' صاف صاف سن لیں' کوئی کچھ بھی کہتا اور کرتا رہے مگر دروازہ رکوائی تو آپ سے میں نے ہی لینی ہے' کم از کم دس ہزار روپے۔"

سب کو ہنستے کھلکھلاتے دیکھ کر اس نے بھی اپنا مدعا بیان کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی جواب میں حمدانی نے دھیمے سے مسکراتے ہوئے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"واہ یعنی تم بھی کسی سے پیچھے نہیں ہو ارے بابا! اگر میں دس ہزار تمہیں دروازے پر دے دوں گا' تو اندر جا کر اپنی بیوی کو کیا دوں گا۔ ٹھینگا......؟"

اس کے کہتے ہی سب ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

"یار یہ ازہان دکھائی نہیں دے رہا' طبیعت تو ٹھیک ہے اس کی؟"

اگلے ہی لمحے حمدان نے تفسیر سے پوچھا تھا' جواب میں وہ قدرے لاپرواہ انداز اپناتے ہوئے بولا۔

"زری کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اسے گھر چھوڑنے گیا ہے۔"

"چلو...... اب یہ بیٹھے بٹھائے زرنشاء کو کیا ہو گیا؟ مجھے تو ان دونوں کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔" حمدان کا موڈ قدرے آف ہوا تھا' جب سارہ بولی۔

"اسے کچھ بھی نہیں ہوا ہے بھیا' اصل بات یہ ہے کہ زرین صاحب کو آج پہلے جیسی لفٹ نہیں ملی تو جل کر یہاں سے غائب ہو گئیں محترمہ تاکہ کل سب پھر ان کی منت کر کے' انہیں یہاں لائیں اور خوب اہمیت دیں' روز روز اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے ڈرامے کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ انہیں اور یہ ازہان

بھیا' مجھے بالکل سمجھ نہیں آتی۔ کہ سب کے ساتھ نہایت روڈ انداز اپنائے رکھنے کے بعد ان کے آگے پیچھے کیوں پھیرتے رہتے ہیں؟''

سارہ کو بھی شاید دل کا غبار نکالنے کا سنہری موقع میسر آیا تھا' سو اس نے قطعی بخل سے کام نہیں لیا۔

اس رات بہت دیر تلک وہ سب جاگ کر ہلا گلا کرتے رہے تھے۔ ازہان کی واپسی البتہ بہت دیر سے ہوئی تھی۔ سبرینہ اس وقت کچن میں لائیٹ آف کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اسے اوپر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر ارادہ بدل گئی۔

اگلے پندرہ بیس منٹ تک وہ دادی ماں کے پاس بیٹھی' ان کی ٹانگیں دباتی رہی اور حویلی سے مطلق مختلف امور پر دلچسپ باتیں سنتی رہی' پھر انہیں بھی نیند آنے لگی تو وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر اندر اپنے کمرے کی طرف آ گئی' جہاں سارہ دونوں ہاتھوں پر مہندی کے پھول بوٹے بنائے اب سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

سبرینہ نے سب کے اصرار پر ذرا سی مہندی لگائی تھی' جو اب سوکھ کر ہتھیلی سے اتر چکی تھی۔ سارہ نے اپنے ہاتھوں پر مہندی لگانے کے بعد' مہندی والا باؤل اس کے ہاتھ میں تھما کر کچن میں رکھ آنے کو کہا۔ تو اچانک ایک شرارت نے آہستہ سے سبرینہ کے دل میں چٹکی کاٹی اور وہ مہندی والا باؤل کچن میں رکھنے کی بجائے اپنے ساتھ لے کر اوپر ازہان کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ جو حسب عادت دروازہ لاک کئے بغیر بے ترتیب سا اپنے بستر پر پڑا۔ غالباً گہری نیند میں کھو چکا تھا۔

• • •

وہ کیسا شخص ہے ہر روز سزا دیتا ہے
پھر ہنساتا ہے وہ اتنا کہ رولا دیتا ہے
اس سے پوچھوں کہ بتا کس سے محبت ہے تمہیں
نام سرگوشی میں میرا ہی بتا دیتا ہے
خود ہی کہتا ہے نہ دہراؤ پرانی باتیں
میں نہ دہراؤں تو پھر خود ہی دہرا دیتا ہے
خود ہی کہتا ہے کہ جذبات میں ہلچل نہ کرو
اور پھر خود ہی نئی آگ لگا دیتا ہے

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔

وسیع حویلی کے در و دیوار میں ایک مرتبہ پھر گہری خاموشی کا راج ہو گیا تھا۔

سبرینہ مہندی والا باؤل ہاتھ میں لئے' تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر ازہان کے کمرے کی طرف چلی آئی' جہاں وہ بے سدھ سا' بستر پر اوندھا پڑا' غالباً گہری نیند میں تھا۔

''اب جناب کو پتہ چلے گا کہ دوسروں کو پل میں ہرٹ کرنے کی سزا کیا ہوتی ہے۔''

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شرمیلی سی مسکان چہرے پر پھیلاتے ہوئے وہ اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی۔ ریشمی آنچل بار بار پھسل کر زمین کو چھونے کو بے قرار ہو رہا تھا۔

دھڑ دھڑ کرتے دل کے ساتھ بائیں ہاتھ سے آنچل سنبھال کر دائیں ہاتھ میں ذرا سی مہندی اٹھاتے ہوئے وہ ابھی اس پر جھکی ہی تھی' کہ اس کی چوڑیوں کے جلترنگ سے بیدار ہو کر وہ فوراً سیدھا ہو گیا۔ نیند میں کھلی سرخ آنکھیں' خاصے حیران کن انداز میں اس کے فق چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جب کہ وہ اپنی جگہ گویا ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔

عین ٹائم پر یوں چوری پکڑی جائے گی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

''اینی پرابلم؟''

لمحوں میں بیدار ہوا اس کے ساتھ' سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے خاصے سرد انداز میں پوچھا تھا' جواب میں سبرینہ کا سر آپ ہی آپ قدرے ندامت سے جھک گیا۔

''میں آپ سے کچھ پوچھ رہا ہوں سبرینہ' آدھی رات کو یوں چوروں کی طرح' میرے کمرے میں آنے کا مقصد بیان فرمائیں گی۔''

وہ اسے کتنا غلط سمجھ رہا تھا' مگر سبرینہ کی زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ خوبصورت جھیل سی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔

''اب منہ میں گڑھ ڈال کر کیوں کھڑی ہو گئی ہیں؟ شدید کراہیت محسوس ہوتی ہے مجھے تم جیسی توجہ کی طالب' لوز کریکٹر لڑکیوں سے' خوامخواہ خود تو ڈوبتی ہیں' اگلے کو بھی ساتھ ہی لے کر مرتی ہیں۔'' اس کا ایک ایک لفظ' سبرینہ کو زندہ درگور کر دینے کے لئے کافی تھا۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے' کتنی نیچ سوچ تھی اس شخص کی' حالانکہ ابھی کچھ ہی روز پہلے وہ بھی تو اس کے کمرے میں آدھی رات کو چلا آیا تھا' مگر سبرینہ نے اسے ذلیل کرنے کی بجائے' اس کی فکر کی تھی' خود بے آرام ہو کر اس کے آرام کے لئے بے چین تھی۔

یہی تضاد تو ہوتا ہے عورت اور مرد کے عوامل میں' مرد محض اپنی غرض کی پروا کرتا ہے' جب کہ عورت اپنے بارے میں کبھی نہیں سوچتی' خود کو مٹا کر بھی اسے ہمیشہ صرف اپنے مرد کی خوشی مطلوب ہوتی ہے۔

''اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو' جاؤ یہاں سے۔''

وہی آگ اگلتا لہجہ' سبرینہ سے مزید ایک لمحے کے لئے بھی وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس کمرے سے باہر نکلتی۔ کسی نے زور سے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا ڈالا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس نے حقیقی معنوں میں' اذہان اور اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

''واش روم میں جاؤ تم' ہری اپ۔''

ماتھے پر سلوٹیں ڈالے' وہ اسے اٹیچ باتھ کی طرف دھکیل کر' خود دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

سبرینہ کی اپنی معصوم سی شرارت اتنی مہنگی پڑے گی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ دروازے پہ بیگم تھیں' لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گیا تھا۔

''فرمائیے' آدھی رات کو میری یاد کیسے آ گئی آپ کو؟''

''بکواس بند کرو' ابا جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' انہیں ہوسپٹل لے کر جانا ہے' جلدی نیچے آؤ۔''

تیز لہجے میں اسے ہدایت کرنے کے بعد وہ فوراً واپس چلی گئیں' تو اذہان چپل پہننے کے لئے واپس بیڈ کے قریب چلا آیا۔

''اس گھر میں سکون نام کی چیز میسر نہیں ہے۔ ہونہہ مصیبتیں ہی مصیبتیں اکٹھی ہوئی ہیں ساری۔'' بلند آواز میں اس کی بڑبڑاہٹ پر سبرینہ واش روم سے باہر نکل آئی تھی۔

''آپ بھی اب تشریف لے جائیے یہاں سے اور خبردار جو آئندہ اتنی رات گئے تک میرے کمرے میں آئیں تو......'' اسے خود بھی اپنے لہجے کی کرختگی کا احساس نہیں تھا۔

سبرینہ اذہان کے لئے وہ رات کسی عذاب سے کم ثابت نہیں ہوئی تھی۔

اپنے جس کردار پر اسے فخر تھا' اسی کردار کو وہ شخص لمحوں میں دو کوڑی کا کر چکا تھا کہ جس سے وہ بے وابستگی محسوس کرنے لگی تھی۔

• • •

سعیہ غیاث کچن میں کھڑی لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے لئے چائے بنا رہی تھی' جب عمر نے آ کر نہایت اپنائیت سے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا۔

''کاش...... تم اس وقت میرے گھر کے کچن میں کھڑی ہو کر چائے بنا رہی ہوتیں سعی۔''

یقیناً اس کی قربت میں مدہوش ہو رہا تھا' مگر سعیہ غیاث اس کی اس درجہ قربت سے بوکھلا کر ہاتھوں پر گرم گرم چائے چھلکا بیٹھی تھی۔

تکلیف کی شدت سے جونہی اس کے ہونٹوں سے ہلکی سی سسکاری نکلی' عمر عباس نقوی' فوراً چونک ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' حد درجہ متفکر ہوتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جواب میں سعیہ غیاث نے اپنا جلا ہوا ہاتھ معصومیت سے اس کے سامنے کر دیا۔

''اوہ مائی گاڈ...... یہ کیسے جلا لیا تم نے؟''

وہ قدرے حیرانگی سے پوچھ رہا تھا' مگر سعیہ بالکل خاموش رہی تھی۔

''ایک دم پاگل ہو تم' اپنا خیال رکھنا تو آتا ہی نہیں تمہیں۔''

اپنے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھام کر' بائیں ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے کہا' تو

سنعیہ کو مزید رونا آ گیا۔

''عمر......مم......میں اس درجہ محبت کے قابل نہیں ہوں۔''

''خبردار جو تم نے ایسا مزید کوئی جملہ منہ سے نکالا تو' تم کسی قابل ہو یا نہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا دل کا کام ہے تمہارا نہیں انڈرسٹینڈ۔'' اس کی ڈانٹ میں بھی پیار چھلک رہا تھا۔

کہاں عادی تھی وہ بھلا اس درجہ محبتوں کی' اتنی توجہ کی' لہٰذا اس لمحے اس کا ہواؤں میں اڑنا جا... پھر بھی ایک انجانے سے خوف کا شکار ہو کر اس نے کہا تھا۔

''پنکی آپ کو پسند کرتی ہے عمر' وہ کبھی یہ پسند نہیں کرے گی کہ آپ مجھ سے محبت کریں۔''

''میں پنکی کے باپ کے خریدا ہوا ملازم نہیں ہوں' جو اس کی پسند' ناپسند کی متعلق سوچوں' یہ زندگی ہے' میں جیسے چاہوں' جس کے ساتھ چاہوں بسر کروں' کسی کو کیا۔''

اس کا لرزتا کانپتا ہاتھ' اب بھی عمر عباس نقوی کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔

''چلو شاباش' ہاتھ دھو' اپنا' پھر میں برنال لگاتا ہوں۔''

''میں خود لگالوں گی عمر' پلیز......اب آپ چلے جائیں۔''

''ہرگز نہیں' آج ہی تو موقع ملا ہے تنہائی میں محبوب سے حال دل کہنے کا اور میں اتنا ڈفر ہوں کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے گنوادوں' بتاؤ شاباش' برنال کہاں رکھی ہے۔''

''عمر پلیز......مما نے تمہیں' میرے ساتھ اکیلے دیکھ لیا' تو میری جان نکال دیں گی۔''

''تو دے دینا نہ جان' ویسے بھی عشق میں جان دینا۔ کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔''

خود ہی آگے بڑھ کر' مختلف جگہوں پر برنال تلاش کرتے ہوئے وہ بولا' تو سنعیہ روہانسی ہو کر

''عمر پلیز......تمہیں خدا کا واسطہ' میرے حال پر رحم کرو۔''

اس کے لہجے نے آپ سے ''تم'' کا فاصلہ کیسے اور کب طے کیا' خود اسے بھی خبر نہیں ہو سکی تھی

''فادگاڈسیک سنی' اتنا ڈرتی کیوں ہو تم' میں ہوں ناں' میں دیکھتا ہوں کوئی میری وجہ سے انگلی اٹھاتا ہے۔''

اپنائیت سے اس کا بازو تھام کر وہ اسے کچن سے لاؤنج میں لے آیا تھا۔

''پتا نہیں کس دور کی لڑکی ہو تم؟ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو' دور کیوں جائے' اپنی بہن پنکی کو کتنی چلاک اور بولڈ لڑکی ہے اور ایک تم ہو' ستر سالہ پرانی روح' مجال ہے زبان سے' دل کو خوش کرنے والا کوئی ایک بھی جملہ نکل جائے' جب سے آیا ہوں' رو رو کر دکھا رہی ہو حال تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔''

اب کے وہ ذرا سا خفا ہوا تھا' جس پر نہ چاہتے ہوئے بھی سنعیہ مسکرا اٹھی تھی۔

''تم غصہ کرتے ہوئے بہت پیارے لگتے ہو عمر!'' وہ اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر برنال لگ

اس کے اس فقرے پر شرارتی سی مسکراتی نگاہ' سرسری سے انداز سے اس کے چہرے کی طرف ڈالتے ہوئے مسرور لہجے میں بولا۔

''تھینکس' دل کو خوش کرنے کے لئے' دو چار ایسے جملے بول دیا کرو' کچھ نہیں جائے گا تمہارا......''

''آئی لو یو سنی' لو یو سو مچ۔''

ذرا ہی پٹڑی سے اترتے ہوئے اس نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کئے' تو سنعیہ پھر سے کراہ کر

''سوری......اب کیا ہوا؟'' وہ چونکا تھا' مگر اس بار سنعیہ خاموش رہی تھی۔

''یہاں بازو پر کوئی چوٹ لگی ہے کیا؟''

ذرا ہی اس کی آستین الٹ کر بازو پر لگا گہری نیل کا نشان دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا' تو سنعیہ کے باوجود خاموش نہ رہ سکی۔

''یہاں مما نے پلاسٹک کا پائپ مارا تھا عمر۔''

''وہاٹ......بٹ وائے؟''

عمر عباس نقوی کے سر پر جیسے پہاڑ آ گرا تھا۔

''مم......مجھ سے سالن جل گیا تھا اور ان کو بھوک لگی ہوئی تھی اس لئے۔''

سر جھکا کر اس نے یوں ندامت سے کہا تھا' گویا یہ کوئی بہت بڑا جرم ہو۔

''یہ تو حیوانیت ہے' تم نے انکل کو کیوں نہیں بتایا یہ سب؟''

اس لمحے اس سے اپنا غصہ کنٹرول کرنا' بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''انہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے عمر' وہ ہمیشہ مما رائیٹ مانتے ہیں' جو وہ کہتی ہیں اور انہیں دکھاتی ہیں سچ اور صحیح لگتا ہے انہیں' میرے کسی دکھ کی کبھی پروا نہیں کی انہوں نے۔''

''اٹس ویری امیزنگ سنی! مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ ایک سگا باپ اپنی اولاد سے اس درجہ غافل بھی ہے۔''

''سوری عمر......شاید مجھے یہ سب تمہیں نہیں بتانا چاہئے تھا۔'' وہ قدرے شرمندہ ہوئی تھی۔

''اوشٹ اپ سنی! یہ بیگانوں جیسی باتیں نہ کیا کرو' میرے ساتھ تم دیکھنا میں تمہارے وجود پر لگنے والے ایک ایک زخم کا حساب لوں گا ان سے مگر......آج کے بعد تم یہ ظلم نہیں سہو گی' چپ چاپ ان کا ہر حکم مانو گی تم؟''

''یہ بہت مشکل ہے عمر......وہ میری تعلیم چھڑوا دیں گی' ہمیشہ کے لئے گھر بٹھا لیں گی مجھے۔''

سنعیہ نے فوراً مچل کر دہائی تھی' جب وہ پیار سے اس کے گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''ایسا نہیں ہو گا سنی' اپنے عمر کے پیار پر بھروسہ رکھنا' یہ تمہارے ساتھ اب کبھی کوئی زیادتی نہیں

ہونے دے گا......او کے......ٹیک کیئر......"

کہنے کے ساتھ ہی' وہ اس کے پہلو سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہاری آج کی چائے ادھار رہی سنی' انشاء اللہ بہت جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی ہماری" اپنائیت سے کہنے کے ساتھ ہی' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وسیع لاؤنج سے باہر نکل گیا' تو... کی لمبی سانس بھرتے ہوئے وہیں پلکیں موند کر بیٹھی' اس کی رفاقت میں گزرے' سحر انگیز لمحوں ذہن کی تازہ کرنے لگی۔

♦ ♦ ♦

ساحل سمندر کے کنارے بیٹھے' وہ بکھری ہوئی موجوں کے رقص کو بہت انہماک سے دیکھ اور جب اچانک ثمرن اذہان نے اسے اپنی طرف ہی متوجہ کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

"کیا بات ہے سر! آج کل آپ بہت ڈسٹرب دکھائی دینے لگے ہیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

پھیکی سی اداس مسکراہٹ' گداز لبوں پر بکھیرتے ہوئے جیسے اس نے اپنا جرم رکھا تھا۔

"او کے......اگر آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں' لیکن نجانے کیوں' کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا آپ مجھے اپنے سامنے پا کر مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں' مگر کہہ نہیں پا رہے۔"

ثمرن اپنے لفظوں سے اسے گھیرنا چاہ رہی تھی اور شاید وہ اس میں کامیاب بھی رہی تھی' کے مقابل بیٹھے اسفند شیرازی کی آنکھوں میں اس لمحے اضطراب چھلکا تھا۔

سختی سے ہونٹوں کو ایک دوسرے میں پیوست کرتے ہوئے وہ جیسے خود کو سنبھالنے کی کوشش تھا' جب اس نے لوہا گرم دیکھ کر اس پر مزید چھوٹ لگا دی۔

"لگتا ہے آپ کسی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ایم آئی رائیٹ۔"

"نہیں۔" خود پر ہزار ضبط کے باوجود بھی خاموش نہیں رہ سکا تھا۔

کسی نہ کسی سے تو دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہی تھا' تو پھر ثمرن اذہان ہی سہی۔

اس لمحے حقیقی معنوں میں وہ خود پر کنٹرول نہیں رکھ پایا تھا۔ تبھی شکستہ لہجے میں بولا۔

"میں اس سے پیار نہیں کرتا ثمرن' مگر اس کے باوجود اس کا خیال' میرا پیچھا نہیں چھوڑ بھلانے کی کوشش میں بھی' ہر لمحہ یاد آتی ہے وہ مجھے' سمجھ میں نہیں آتا' کیا کروں؟"

ثمرن اس سے ایسے ہی الفاظ کی توقع کر رہی تھی۔

ایک غلط فہمی کا شکار ہو کر جو کچھ وہ اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ وہ اتنی آسانی سے بھلائے جا قابل بھی نہیں تھا' لہٰذا ایک تلخ سی مسکراہٹ لبوں پر پھیلاتے ہوئے وہ پھر لطف لینے والے اند بولی۔

"کون تھی وہ......لگتا ہے بہت زیادہ عزیز تھی آپ کو؟"

"نہیں ثمرن' اس وقت میرے دل میں اس کے لئے ایسا کچھ بھی نہیں تھا' اس وقت تو میں اسے جانتا تک نہیں تھا' پتہ نہیں وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔"

روشن نگاہوں میں ماضی کے لمحات تازہ کئے وہ جیسے خود اپنی ہی ذات میں گم ہو رہا تھا۔

"بہت پیاری لڑکی تھی' ان دنوں میں ابھی یونیورسٹی سے فارغ ہی ہوا تھا' یونیورسٹی میں کچھ لڑکوں کے ساتھ ہمارا جھگڑا چل رہا تھا۔ جو یونیورسٹی سے فری ہو جانے کے بعد بھی جاری رہا تھا' اس روز بھی روڈ پر میں اور میرے دوست کھڑے ان لڑکوں سے جھگڑ رہے تھے کہ اچانک اس لڑکی کا باپ وہاں آ گیا۔ میری اس کے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی' مگر اس شخص نے فضول میں مجھے اور میرے دوستوں کو اپنی ذاتی دشمنی کا شکار بناتے ہوئے اریسٹ کیوں کروا دیا تھا' اس وقت میں یہ نہیں جان سکا تھا' بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ہمارے دشمن گروپ میں جو لڑکے تھے' ان لڑکوں میں اس کا بھتیجا بھی شامل تھا' لہٰذا اپنی اعلیٰ اپروچ سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس شخص نے مجھ پر کئی مقدمات درج کروا دیئے۔ جن میں سے ایک اس کی بیٹی کو سرراہ روک کر چھیڑ چھاڑ کرنے کا بھی تھا۔ اس کی طرف سے عائد ان الزامات نے مجھے کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا تھا' باہر والوں کے ساتھ ساتھ' گھر والوں نے بھی بہت ذلیل کیا تھا مجھے' جس لڑکی کے ساتھ میری شادی کی ڈیٹ فائنل ہو رہی تھی' اس لڑکی نے بھی مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ غم و غصے سے جیسے پاگل ہو کر رہ گیا تھا میں' تبھی ضمانت پر حوالات سے رہا ہونے کے بعد پہلا کام میں نے اس کی بیٹی کو کڈنیپ کرنے کا ہی کیا' اس کی وجہ سے جو ذلت میری ہوئی تھی' میں اس ذلت کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور اس بدلے میں ایک بے گناہ لڑکی میرے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی ثمرن! اس شخص کی بیٹی کے دھوکے میں' دوسری لڑکی جو اس کی بیٹی کی دوست تھی' غلط فہمی میں میرے ہاتھ لگ گئی اور میں نے اس کے آنسوؤں اور التجاؤں کی پروا کئے بغیر' اسے بے دردی سے کچل کر رکھ دیا' نہ صرف اس کی ذات کو مسخ کر دیا بلکہ اپنے سلگتے اعصاب کو راحت پہنچانے کے لئے شدید اشتعال میں آ کر اس کے خوبصورت چہرے پر تیزاب بھی پھینک دیا' درندگی میں جانوروں کو بھی مات دے گیا تھا میں۔"

ثمرن دیکھ سکتی تھی کہ اس لمحے وہ بہت اذیت کے عالم سے گزر رہا تھا' تاہم اس کی اس داستان سے اس کے اپنے زخم رسنے لگے تھے' لہٰذا وہ چاہ کر بھی اس سے کچھ نہیں کہہ پائی تھی۔

"یقین کرو ثمرن! جس روز مجھے اپنی اس حماقت کا پتہ چلا اسی روز میں سکون میری زندگی سے رخصت ہو گیا ہے ہر پل یہی خیال ستاتا ہے کہ اپنا زخم زخم وجود لئے وہ بھلا کہاں گئی ہوگی' بے قصور لٹنے کے بعد کہاں اماں ملی ہوگی اسے پتہ نہیں کتنی بددعائیں دی ہوں گی اس نے مجھے۔"

بہکے بہکے سے انداز میں کہتا' وہ اسے اپنے حواس میں نہیں لگ رہا تھا۔

"اندھیرا بڑھ رہا ہے سر!"

بہت مشکل سے خود کو کمپوز کر کے وہ اس سے کہہ پائی تھی' جواب میں اسفند شیرازی بھی خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں' تمہارے کیئے کی سزا ضرور ملے گی اسفند' ثمرن اذہان آسانی سے معاف کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔"

قدم باقدم اسکے ساتھ چل کر گاڑی تک آتے ہوئے اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

♦♦♦

آسمان سیاہ گھنگھور بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

وقفے وقفے سے برستی' ٹھنڈی پھوار اس کے اعصاب کو عجیب سا سکون بخش رہی تھی۔

پچھلے کئی دنوں سے ننھے سلمان کے ساتھ اس کی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔

لہٰذا اس روز سنڈے کی چھٹی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اماں کو بتا کر سنوان ہمدانی کے خوبصورت بنگلے کی طرف چلی آئی تھی۔

چوکیدار چونکہ اس سے واقف تھا' لہٰذا وہ اپنی مرضی سے کسی بھی وقت یہاں آ جا سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مکمل اعتماد سے چلتی ہوئی وسیع لاؤنج میں آئی تو سامنے ہی کچن میں سنوان ہمدانی دودھ بوائل کرتے ہوئے دکھائی دے گیا۔ بے ترتیب سے بکھرے بکھرے حلیے میں ملبوس وہ خاصا نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔

"السلام علیکم! مسٹر سنوان! کیسے ہیں آپ؟"

قدرے بشاش لہجے میں اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

"فائن...... آج ہمارے غریب خانے کا رستہ کیسے یاد آ گیا آپ کو؟"

اسے سامنے دیکھ کر وہ جیسے لمحے میں کھل اٹھا تھا' بجھی ہوئی سرخ آنکھوں میں خوشگوار سی چمک ابھری تھی۔ تبھی وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"مانی کی بہت یاد آ رہی تھی۔ کئی دنوں سے ملا ہی نہیں' کہاں ہے وہ؟"

"اپنے کمرے میں ہے' اصل میں پچھلے دنوں سے بہت تیز بخار آ رہا ہے اسے' بہت چڑچڑا بھی ہو رہا ہے۔"

سرسری سی اک نگاہ اس پر ڈال کر وہ سلمان کے کمرے کی طرف بڑھ آئی تھی' جہاں وہ اپنے بستر پر نڈھال سا پڑا۔ اس وقت گہری نیند میں سو رہا تھا۔

"بہت پیارا بچہ ہے' پلیز خیال رکھا کریں ناں اس کا۔"

اس کے سرہانے بیٹھ کر' پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنائیت سے کہا تھا' تب وہ دودھ کا گلاس قریبی ٹیبل پر رکھ کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"رکھنے کی کوشش تو کرتا ہوں مس نازیہ! مگر کامیاب نہیں ہو پاتا' بزنس کی مصروفیات بھی الجھائے رکھتی ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

"آپ دوبارہ شادی کیوں نہیں کر لیتے مسٹر سنوان!"

اپنی دانست میں اس نے بڑا نادر مشورہ دیا تھا' تاہم سنوان ہمدانی نے اس کے مشورے پر کان نہیں دھرے۔

"سلمان بہت حساس ہے مس نازیہ' میں اس کی شخصیت کو بکھیرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

کہنے کے ساتھ ہی اس نے سلمان کو بانہوں میں بھر کر اٹھا لیا' تو نازیہ خاموش بیٹھی رہ گئی۔

"مما...... مما آپ آ گئیں؟"

بیدار ہوتے ہی سلمان کی نگاہ اس پر پڑی تھی' جواب میں وہ قدرے خجل سی ہو کر اسے پیار کرنے لگی تھی۔

سنوان کی بانہوں سے وہ اس کی گود میں منتقل ہو گیا تھا۔ تبھی اس کے سینے سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"بچوں کا خیال تو ان کی مائیں رکھتی ہیں مما' مگر...... پاپا کی طرح آپ کے پاس بھی میرے لئے ٹائم نہیں ہے اس سے تو اچھا تھا میں پیدا ہی نہ ہوتا۔"

اس لمحے وہ اسے بہت زیادہ دکھی دکھائی دے رہا تھا' تبھی ایک اچٹتی سی نگاہ سلمان ہمدانی کے شرمندہ چہرے کے طرف ڈالتے ہوئے وہ مزید حلیمی سے بولی۔

"ایسا نہیں سوچتے مانی' دیکھو مما آپ سے ملنے کے لئے آ تو گئی ہے۔"

"لیکن آپ ہر وقت تو میرے پاس نہیں رہتیں مما' مجھے ایسی مما چاہئے' جو ہر وقت میرے پاس رہے' مجھے رات میں' بہت ڈر لگتا ہے' مگر آپ میرے پاس نہیں ہوتیں' کوئی بھی میرے پاس نہیں ہوتا۔"

بات کرتے کرتے وہ رو پڑا تھا' جس سے نازیہ شیرازی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

"روتے نہیں ہیں بیٹا' میں آپ سے پرامس کرتی ہوں کہ اب آپ سے غافل نہیں رہوں گی' بہت پیار کروں گی آپ سے' پلیز چپ ہو جاؤ۔"

اس لمحے اس کے سامنے جیسے اس کا اپنا "سلمان علوی" رو رہا تھا۔

"مجھے رات میں نیند نہیں آتی نازی' مما بہت یاد آتی ہیں' دن تو کسی طور گزر ہی جاتا ہے' مگر رات نہیں کٹتی' مما کے سینے پر سر رکھ کر سونے کا عادی تھا میں' اب ان کے بعد راتیں جیسے عذاب بن گئیں ہیں' میں مر جاؤں گا نازی' بہت جلد مر جاؤں گا میں۔"

برسوں پہلے کہی اس کی بات یاد آئی تو بے ساختہ وہ دکھ سے سسک اٹھی۔

"سوری مما...... میں نے آپ کو رُلا دیا۔"

ننھے سلمان نے جو اس کی آنکھ میں آنسو دیکھے تو فوراً تڑپ اٹھا‘ جب کہ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں جیسے بکھرتی چلی گئی تھی۔

یوں ہی امید دلاتے ہیں زمانے والے
لوٹ کے کب بھلا آ پاتے ہیں جانے والے
تو نے دیکھے ہیں کبھی شہر میں جلتے ہوئے پیڑ
ایسے ہوتے ہیں وفاؤں کو نبھانے والے

• • •

جتنی دیر ملوں میں تم سے
اتنی دیر تو یوں لگتا ہے
سمے سے لے کر انت سمے تک
سارا جیون پاس ہے میرے

کہتے ہیں کہ محبت انسان کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔
سنعیہ غیاث کو بھی عمر عباس نقوی کی محبت نے خوبصورت بنا دیا تھا‘ وہ لڑکی جو پہلے خود سے لاپرواہ رہتی تھی۔ اب اپنا اس درجہ خیال رکھنے لگی تھی‘ گویا ہر لمحہ عمر عباس نقوی کی خوبصورت نگاہوں کے حصار میں مقید ہو۔

عمر اب پنکی سے ملنے کے بہانے گاہے بگاہے ان کے گھر آتا رہتا تھا اور صبیحہ بیگم اس سے بے پناہ خوش تھیں۔ کیونکہ اسے اپنے داماد کے روپ میں دیکھنا ان کی دلی خواہش تھی۔

اپنی بیٹی کے اس کارنامے پر ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ جھوم جھوم کر ساری دنیا کو اپنے ساتھ شریک کر لیں۔ پنکی کو مکمل آزادی تھی کہ اس کا دل جیتنے کے لئے وہ اس کے ساتھ کسی بھی وقت کہیں آ جا سکتی ہے۔

روزانہ دیر تک گھر سے باہر رہنا‘ لنچ اور ڈنر عمر کے ساتھ کرنا اور شاپنگ کے بہانے اس سے بھاری رقم اینٹھنا‘ گویا اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ سنعیہ غیاث سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ عمر کی پنکی کی رفاقت میں سوچنے کا خیال ہی اس کا دل جکڑتا تھا۔

پورے ایک ہفتے ضبط کے کڑے پل صراط سے گزرنے کے بعد اس روز بالآخر وہ ہمت ہار گئی۔

کل شام میں ہی پنکی کے منہ سے عمر کے ساتھ اس کی آوارگیوں کے قصے سن کر اس کے اندر گہرا اضطراب در آیا تھا۔

لہٰذا اگلے روز صبح ہوتے ہی تمام کام کاج سے فارغ ہو کر وہ صبیحہ بیگم کے پاس چلی آئی۔

"... کل میرا آخری پرچہ ہے‘ لیکن میرے پاس ایک کتاب نہیں ہے یہاں قریب ہی اپنی فرینڈ سے وہ کتاب لے آؤں۔"

پنکی ان سے کبھی بھی باہر جانے کی اجازت نہیں لیتی تھی‘ جب کہ اسے ان کی اجازت کے بغیر باہر ے تک جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔

صبیحہ بیگم اس وقت سٹار پلس پر اپنا کوئی پسندیدہ ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھیں‘ لہٰذا چونک کر ایک ہی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالنے کے بعد اثبات میں سر ہلا کر وہ دوبارہ ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہو سنعیہ کو ان سے اتنی جلدی اجازت ملنے کی توقع نہیں تھی‘ لہٰذا وہ اجازت ملتے ہی وہ چادر سنبھالتی دم اٹھا کر فوراً گھر سے باہر نکل آئی۔

پچھلے ایک ہفتے سے عمران کے گھر نہیں آ رہا تھا‘ رات میں فون بھی مختصر کرتا‘ جس کی وجہ سے اس کے ندشات نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ ترس کر تو کسی کی محبت نصیب ہوئی تھی اسے‘ اب اس محبت نے کا حوصلہ نہیں تھا اس میں‘ سو زندگی میں پہلی بار وہ حوصلہ کرتے ہوئے ٹیکسی لے کر اس کے آفس ی جہاں اکثر وہ پنکی کے ساتھ آ کر باہر گاڑی میں ہی بیٹھی رہا کرتی تھی۔

اندر آفس میں عمر کے مقابل جا کر اس سے بات چیت کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا‘ مگر آج وہ ر جرأت کی تمام حدوں کو پھلانگ گئی تھی۔

ل میں آگ لگی ہو تو پھر انسان شاید یونہی بے اختیار ہو کر رہ جایا کرتا ہے۔ لرزتے قدموں کو بظاہر گھسیٹتی وہ ریسیپشن تک آئی تھی۔ جہاں ایک نازک اندام سی ماڈرن لڑکی بیٹھی اپنے کاموں میں روف دکھائی دے رہی تھی۔

"جی فرمائیے؟"

ھوڑی دیر میں توجہ اس کی جانب مبذول کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ خشک ہونٹوں پھیرتے ہوئے قدرے دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"وہ...... مم...... مجھے عمر عباس صاحب سے ملنا تھا۔"

"سوری میڈم! سر تو اس وقت میٹنگ میں مصروف ہیں۔"

"کب تک فارغ ہو جائیں گے؟"

ل کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا‘ اگر صبیحہ بیگم کو اس کے جھوٹ کا پتہ چل جاتا تو شاید وہ اس کی کھال ے بھی گریز نہ کرتیں‘ جب کہ اس کا عمر سے ملنا بھی از حد ضروری تھا۔

"کچھ کہا نہیں جا سکتا‘ آپ چاہیں تو ویٹ کر سکتی ہیں۔"

یریٹری کے مختصر جواب پر اس کا دل مکدر ہو کر رہ گیا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ انتظار کے بعد وہ لڑکی کے مقابل آئی تھی۔

"دیکھئے‘ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے‘ پلیز آپ عمر صاحب کو میسج کر دیجئے‘ اگر وہ ملنا نہیں تو میں واپس چلی جاؤں گی۔"

اس کا دل رو دینے کو چاہ رہا تھا' تبھی شاید سیکریٹری کو اس پر ترس آ گیا تھا' عمر سے رابطہ کر بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

''آپ! سر کے کیبن میں جا سکتی ہیں میڈم! وہ ویٹ کر رہے ہیں آپ کا۔''

''تھینکس۔''

از حد ممنون لہجے میں کہنے کے ساتھ ہی سرد ہاتھوں کو آپس میں مسلتی' وہ عمر کے آفس کی طرف تھی۔

''السلام علیکم!''

قدرے نروس ہو کر دروازہ ناک کرنے کے بعد اس کے کمرے میں گھستے ہوئے اس نے سلام جھاڑا تھا۔ جواب میں عمر کے تھکن زدہ چہرے پر جیسے ایکدم سے بہار اتر آئی۔

''وعلیکم السلام!؟''

''او میرے خدا! یہ حقیقت ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

زیر لب مسکرا کر اپنی سیٹ سے اٹھتے ہوئے وہ بے حد مسرور دکھائی دیا تھا۔ جس پر سعیہ کے کرب سے رکے ہوئے آنسو پھر سے گالوں پر بہہ نکلے۔

''سنی...... خدا کا واسطہ ہے یار ایک ہفتے بعد مل رہے ہیں ہم' کم از کم تھوڑی دیر تو ان آنسوؤں پر بند باندھ لو۔''

اسے دونوں شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھانے کے بعد' وہ خود اس کے سامنے میز پر بیٹھ گیا۔

''سچ بتاؤ سنی! تم میری محبت میں تڑپ کر یہاں تک پہنچی ہو' یا پھر کسی نے زبردستی بھیجا ہے۔''

''مجھے کوئی زبردستی کیوں بھیجے گا' میں خود آپ سے جھگڑا کرنے آئی ہوں۔''

بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو رگڑتے ہوئے وہ تیز لہجے میں بولی تو عمر بے ساختہ مسکرا دیا۔

''زہے نصیب' خدا کی قسم مجھے تو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا ہے' کہو تو چٹکی کاٹ کر یقین کر لوں۔''

''شٹ اپ' میں جانتی ہوں آپ مجھ سے فلرٹ کر رہے ہیں' اسی لئے پچھلے ایک ہفتے سے گھر نہیں آ رہے۔ حقیقت میں پنکی ہی اچھی لگتی ہے آپ کو' اسی سے پیار کرتے ہیں آپ۔''

وہ آنسو بھی بہا رہی تھی اور اس پر الزام بھی عائد کرتی جا رہی تھی۔

''اچھا...... اور کچھ......؟''

وہ جتنی مضطرب تھی' عمر کے چہرے پر اتنا ہی اطمینان سکون چھلک رہا تھا۔

''اور کچھ نہیں کل میرا آخری پرچہ ہے' مگر مجھ سے یہ سوچ کر ایک لفظ بھی پڑھا نہیں جا رہا ہے کہ آخر آپ نے مجھے بیوقوف کیوں بنایا۔ بقول آپ کے' اگر پنکی مجھ تک پہنچنے کی سیڑھی تھی تو پھر اب تو آپ مجھ

پہنچ چکے ہیں اندر تک آپ کی محبت سرایت کر گئی ہے' پھر اب اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے آپ؟ ری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ مجھے فریب دے رہے ہیں' یا پنکی اور اپنے آپ کو؟ میں یہ سب برداشت ہیں کر سکتی۔''

وہ اس کے سامنے گرنا نہیں چاہتی تھی' مگر اوندھے منہ گر پڑی تھی۔ اپنا آپ کھول کر اپنے شکست کا عتراف کر کے اس نے فتح' عمر عباس نقوی کے ہاتھوں میں تھما دی تھی۔ جواب مسکراتی نگاہوں سے اس کی لرف دیکھتے ہوئے غالباً اس کے حال سے لطف اٹھا رہا تھا۔

''سنی! کیا تم اپنی ہی بہن سے جیلس ہو رہی ہو؟''

اس کے آنسو اسے تکلیف دے رہے تھے مگر وہ خود پر ضبط کئے بیٹھا' اسے مزید ستا رہا تھا۔

''مجھے کسی سے جیلس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی پنکی خبردار جو آج کے بعد کبھی مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو۔''

ایک پل میں تپ کر وہ اس کے سامنے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی' جواب میں عمر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''واؤ غصے میں کتنی پیاری لگتی ہو تم' قسم سے سنی! تمہارا یہی روپ دیکھنے کے لئے پچھلے ایک ہفتے سے خود کو بمشکل کنٹرول کئے ہوئے ہوں میں اور یہ پنکی مائی فٹ وہ اس قابل نہیں ہے کہ تم اسے اپنے ساتھ کمپیئر کرو۔''

''اچھا اور جو آپ اس کے ساتھ روز لنچ اور ڈنر کر رہے ہیں شاپنگ کروا رہے ہیں' وہ سب کیا ہے۔''

''او مائی گاڈ! تم تو آج لڑاکا بیویوں کی طرح مکمل تیاری کر کے آئی ہو۔''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے عمر۔''

اس کا دل اب بھی جل رہا تھا' تبھی عمر نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔

''اپنے عمر کی محبت پر شک کر رہی ہو تم؟ مت کرو سنی! یہ دل صرف تمہارا مسکن ہے یہاں اب کسی اور کا قبضہ کبھی نہیں ہو سکتا' بس ٹھیک ہے' آج کے بعد تم میرے ساتھ لنچ اور ڈنر کیا کرو گی ٹھیک ہے۔''

''جی نہیں' مجھے ابھی اپنی سانسیں عزیز ہیں۔''

اس کے دو بدو کہنے پر وہ پھر مسکرا دیا تھا۔

''آئی لو یو سنی' اب ایسا کچھ نہیں ہوگا جو تمہیں ناگوار گزرے' اب بولو کیا لو گی ٹھنڈا یا گرم۔''

''کچھ نہیں اب چلوں گی میں' اماں انتظار کر رہی ہوں گی میرا۔''

''کرنے دو انتظار پہلی بار خود چل کر مجھ تک آئی ہو' ایسے ہی تھوڑی جانے دے دوں گا تمہیں۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے انٹرکام پر اپنی پرسنل سیکریٹری کو ہدایت کر دی کہ اسے ایک گھنٹے تک کوئی

ڈسٹرب نہ کرے ساتھ ہی مختلف لوازمات کمرے میں بھجوانے کا آرڈر بھی دے دیا تھا۔

''عمر پلیز مجھے جانے دو' اماں بہت ناراض ہو جائیں گی پلیز۔''

''نیپ۔''

اس کے خشک لبوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرواتے ہوئے وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا' جب کہ سنعیہ غیاث کا دل ان لمحوں میں حقیقتاً پسلیاں توڑ کر باہر آنے کو بے قرار ہو گیا تھا۔

♦ ♦ ♦

کل جو پیار بھلانا ہو تو طے کرنے سے کیا فائدہ
جب نہ ساتھ نبھانا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ
پہلے پہلے سب کرتے ہیں' دعوے لوگ محبت کے
بعد میں پھر پچھتانا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ
ساری بات بگڑ نہ جائے' ڈرتا ہوں. رسوائی سے
دنیا کو ہنسانا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ
سفر میں بھوک پیاس لگے گی مشکل ہوں گی راہیں بھی
چلنے سے گھبرانا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ
پل پل تم کو یاد آئے گا' کچا رستہ گاؤں گا
گھر واپس نہ آنا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ
پیار کیا اس کم ہو جائے' دل بھر جائے باتوں سے
ملنے سے کترانا ہو تو' طے کرنے سے کیا فائدہ

شہروز علوی آج کل قدم قدم پر اسے ہرٹ کر رہا تھا۔

مختلف لڑکیوں سے اپنی فرینڈ شپ کے قصے سنا سنا کر اس نے ثمرن اذہان کا دل لہولہان کر دیا تھا۔

جانے کیوں اب گزرتے ہر پل کے ساتھ وہ اسے خود سے دور جاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

جانے کیوں اب اسے اپنے سامنے پاتے ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آتی تھیں' دل میں ایک عجیب سا درد ہلکورے لینے لگتا تھا۔

شب گزرتے ہوئے ان شب روز میں وہ اب خود کو کمزور پڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

کہیں کسی کام میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

لندن سے اُس روز اپنے پاپا شہر دل نواز سے بات کرتے ہوئے بھی وہ پہلے کی طرح مسرور نہیں ہو پاتی تھی۔ اس روز بھی وہ ملول سی لان میں بیٹھی تھی' جب اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے بغور دیکھتا شہروز' تیزی سے سیڑھیاں پھلانگ کر نیچے ہال میں چلا آیا جہاں احتشام' واصف کے ساتھ بیٹھا پاکستان اور انڈیا

ں پروڈکشن کر رہا تھا۔

''لو آ گئے ہیرو صاحب! قسم سے شام بھیا' اگر اپنا شہروز' ملکہ شروات کے ساتھ کام کرے تو مزا آ

''

واصف کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی وہ کہے بغیر نہیں رہ سکا جواب شہروز اسے خفگی سے گھورتے ہوئے

''میرے لئے ایک وہی رہ گئی ہے کیا؟ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ اس کے ساتھ کام

ں۔''

''تو جناب آپ کس کے ساتھ کام کرنا پسند فرمائیں گے یہ بھی بتا دیجئے۔''

احتشام خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

''چھوڑ یار' میں جس کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں' وہ لڑکی مجھے لفٹ نہیں کرواتی۔''

شہروز کے الفاظ اور واصف کا قہقہہ قطعی بے ساختہ تھا۔

''واہ' ایک عام سی لڑکی لفٹ نہیں کرواتی اور جناب ملکہ شروات میں کیڑے نکال رہے ہیں' جو ایک ڈانس کرنے کے بھی لاکھوں روپے لیتی ہے۔''

''لیتی رہے یار' مجھے کیا میرے والی اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔'' اس بار شہروز کا لہجہ قدرے ں لئے ہوئے تھا۔

''تیرے والی ہے کون ذرا اس کا انٹروڈکشن تو کروا' آج کل تو کئی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا جا رہا

ہے۔''

واصف کہاں باز آنے والا تھا۔ شہروز اس لمحے سچ مچ تپ اُٹھا تھا۔

''چپ کر یار' کیا صحافیوں کی طرح انٹرویو لینے بیٹھ گیا ہے میرا۔''

ثمرن کا گم صم سا انداز اسے مسلسل ڈسٹرب کر رہا تھا اور یہ بات احتشام سے پوشیدہ نہیں رہ سکی تھی' وہ اشارے سے واصف کو وہاں سے اٹھنے کی ہدایت کر کے خود اس کے قریب آ بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے' قدرے پریشان لگ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں یار' پچھلے کچھ دنوں سے ثمرن بہت اداس ہے اب بھی باہر لان میں اکیلی بیٹھی ہے میں یوں اس طرح سے اداس نہیں دیکھ سکتا۔''

وہ بھی شاید اس کی دلجوئی کا منتظر ہی تھا تبھی فوراً اپنی الجھن اس پر واضح کر دی تو احتشام سلگ اٹھا۔

''بکواس کرتا ہے تو' یہ ساری اداسی تو نے ہی دی ہے اسے' خوامخواہ فضول ضد میں آ کر اتنی پیاری کو ہرٹ کر رہا ہے تو یاد رکھ شہروز' عورت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے' یہ کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی' اگر کبھی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو چیخ کر ٹوٹ جاتی ہے' اب بھی وقت ہے یار اپنی فضول ضد

تھوڑ... سے ...ئے اور کردے اس سے اپنے پیار کا اظہار وگرنہ خدانخواستہ وہ کہیں کھوگئی ناں تو پھر سار
عمر سر پکڑ کر روتے پھرو گے تم؟"

"چپ کر یار' ہر وقت لیکچر دینے کے موڈ میں نہ رہا کر' جب دیکھو دل دکھانے والی باتیں سنا
رہتے ہو' بندہ کبھی اچھا مشورہ بھی دے دیتا ہے۔"

اس وقت وہ سچ مچ جلا بیٹھا تھا' تبھی تیکھے لہجے میں کہہ کر وہاں سے اٹھ آیا۔

"ہیلو ثمرن! خیریت تو ہے یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟"

اندر لاؤنج سے نکل کر وہ سیدھا لان میں ثمرن کے پاس چلا آیا تھا' جو اس وقت اسی کی یادوں م
کھوئی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں' بس ویسے ہی سردی لگ رہی تھی' تو باہر دھوپ میں آکر بیٹھ گئی۔ چھٹی والے دن کا کچھ
فائدہ اٹھانا چاہئے۔"

"ہاں یہ تو ہے ویسے آج کل بڑی اداس اداس رہنے لگی ہو' کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔"

اس کے سابقہ محبت بھرے لہجے پر وہ ذرا سی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے' میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"ٹھیک ٹھاک کہاں ہو ثمرن؟ جانے کیوں گزرتے ہر دن کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے
ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں' ہمارے بیچ غیر محسوس سے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں ک
تمہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا ثمرن؟"

آج بہت دنوں کے بعد وہ اپنی پرانی جیون میں واپس لوٹا تھا' لہٰذا ثمرن ہزار ضبط کے باوجود بھ
اپنی پلکوں کو نم ہونے سے نہیں روک پائی تھی۔

"تم بہت بدل گئے ہو شہروز' تمہارے پاس اب میرے لئے وقت نہیں رہا ہے۔"

نا چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے گلہ کر بیٹھی تھی' جواب میں شہروز جیسے تڑپ کر رہ گیا تھا۔

"سوری ثمی! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

گھٹنوں کے بل اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے وہ نم لہجے میں بولا تھا۔ اس لمحے شدت سے اس کا دل
چاہ رہا تھا کہ وہ ثمرن سے اپنے پیار کا اظہار کر دے' مگر اس کے ہونٹ فقط کپکپا کر رہ گئے تھے۔

♦ ♦ ♦

ڈوب جائے کسی دریا میں وہ بادل یارب
جس نے برسوں میرے صحراؤں کو ترسایا ہے
جا پلٹ جا غم ہجراں نہیں فرصت مجھ کو
آج اِک بھولنے والا مجھے یاد آیا ہے

ننھے سلمان سے کیا اپنا وعدہ نبھانے کے لئے اس روز وہ صبح ہی صبح "سنوان کاٹیج" چلی آئی تھی۔
ان کو آفس میں بہت ضروری کام تھا' لہٰذا وہ ملازمہ کو سلمان کے ناشتے کی ہدایت کرتے ہوئے معمول
جلدی ہی آفس کے لئے نکل گیا تھا۔

نازیہ سلمان کے کمرے میں آئی' تو وہ ہنوز گہری نیند میں تھا' جب کہ ملازمہ کچن میں اس کے لئے
ے کر رہی تھی۔

سویا ہوا سلمان بہت پیارا لگ رہا تھا' لہٰذا دلی محبت سے مجبور ہو کر اس نے جونہی اپنے لب اس کی
ن پیشانی پر رکھے وہ کسمسا کر بیدار ہو گیا۔

"مما...... آپ......؟"

نگاہ اس پر پڑتے ہی وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ جواب میں نازیہ نے اس کے دونوں گال بھی چوم
لے۔

"یس مائی بے بی' آج مما' فل ڈے آپ کے ساتھ رہے گی ٹھیک ہے۔"

"یاہو...... مما...... کیا آج آپ کی مما کی طبیعت ٹھیک ہو گئی ہے۔"

نازیہ نے اسے یہی کہہ کر بہلایا تھا کہ وہ اپنی مما کی بیماری کی وجہ سے اس کے ساتھ اس گھر میں نہیں
ا کیونکہ اس کی مما کو اس کی ضرورت ہے' تبھی سلمان نے یہ سوال اٹھایا تھا۔

"ہاں' آج ان کی طبیعت قدرے بہتر ہے' تبھی تو آپ کے پاس چلی آئی میں' کہئے خوشی ہوئی۔"

"یس مما' بہت خوشی ہوئی' مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ میرے پاس ہیں' پتہ ہے سکول میں جب
ے دوست مجھے بتاتے ہیں کہ صبح صبح ان کی مما انہیں کیسے پیار کر کے' بستر سے اٹھاتی ہیں تو میرا دل
اس ہو جاتا ہے مما' میں سوچتا ہوں میری مما' میرے پاس کیوں نہیں رہتیں وہ مجھے ان کی مما کی طرح پیار
ر کے کیوں نہیں اٹھاتیں۔"

معصوم سے لہجے میں ڈھیروں حسرتیں پل رہی تھیں۔

نازیہ شیرازی کا دل اس لمحے پھر دکھ سے بھر گیا تھا۔ تاہم جلد ہی وہ اس دکھ کے حصار سے باہر نکلتے
ئے قدرے بشاش لہجے میں بولی تھی۔

"صبح صبح اداسی نہیں مانی' چلو اٹھو' بستر سے آج آپ کی مما' اپنے ہاتھوں سے آپ کو ناشتہ کروائے
گا۔"

"واؤ...... مما...... کیا روز ایسا نہیں ہو سکتا؟"

چھوٹا سا بچہ آج بے حد مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ نقاہت کے باوجود اس کے چہرے پر گلابیاں
کھل رہی تھیں۔

"سلمان' مجھ سے جہاں تک ہو سکا' میں آپ کو خوش رکھنے کی کوشش کروں گی بیٹا۔"

پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے وہ پھر قدرے اداس ہوئی تھی۔

"آج میں بہت خوش ہوں مما' بے حد خوش۔"

بھرپور جوش سے کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی لپٹ گیا تھا۔

"مما' کل میں بھی اپنے دوستوں کو بتاؤں گا کہ آپ نے آج کتنے پیار سے مجھے جگایا۔"

"ٹھیک ہے' ضرور بتانا۔"

اسے بانہوں میں اٹھائے اٹھائے وہ اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"مما...... آئی لو یو۔"

"لو یو ٹو بیٹا!"

اسے ڈائننگ ٹیبل پر کرسی گھسیٹ کر بٹھاتے ہوئے وہ پھر اسے ڈھیر سارا پیار کر گئی تھی۔

"اب بولو ناشتے میں کیا لو گے؟"

دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کا چہرہ تھام کر' وہ اپنی ناک اس کی ناک سے میچ کرتے ہوئے پھر لاڈ سے بولی تھی۔ تاہم اس سے کہ سلمان اس سے اپنی فرمائش بیان کرتا' کوئی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وسیع ہال میں چلا آیا۔

"سلمان بیٹا کہاں ہو آپ؟"

قطعی غیر مانوس پکار پر نازیہ نے فوراً پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا تھا جہاں ایک نہایت فیشن ایبل خاتون کھڑی' خاصی تنقیدی نگاہوں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

●●●

یہ ذرا ذرا سی بات پر' طرح طرح کے عذاب کیوں؟
جو کسی سے بھی خفا نہ ہو' مجھے اس خدا کی تلاش ہے
مجھے لغزشوں پہ ہر گھڑی' کوئی ٹوکتا ہے بار بار
جسے کر کے دل کو دکھ نہ ہو' مجھے اس گناہ کی تلاش ہے
بناء ہم سفر کے کب تلک' کوئی مسافتوں میں لگا رہے
جہاں کوئی کسی سے جدا نہ ہو' مجھے اس راہ کی تلاش ہے
مجھے دیکھ کر جو اک نظر' میرے سارے درد سمجھ سکے
جو اس قدر ہو چارہ گر' مجھے اس نگاہ کی تلاش ہے

وہ ملول سا ٹیرس پر کھڑا' دور آسمان پر اڑتے ہوئے رنگا رنگ پرندوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب عبرینہ ازہان' کافی سوچ و بچار کے بعد دبے پاؤں چلتی ہوئی' اس کی بیک پر آ کھڑی ہوئی۔

"ازہان۔"

بہت سا حوصلہ جمع کرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں اسے پکارا تھا' جواب وہ قدرے چونک

کر پیچھے پلٹتے ہوئے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔"

لہجہ مضبوط بنا کر شفاف ہتھیلیاں ایک دوسرے کے ساتھ رگڑتے ہوئے اس نے یوں چپکے سے اپنے آنے کی وضاحت کی تھی' جب وہ کشادہ پیشانی پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"کہو اب کیا سما گیا ہے تمہارے دماغ میں۔"

"آپ کے ساتھ جو بھی مسئلہ ہے' میں اس سے باخبر نہیں ہوں' نہ ہی آپ کی ذات کو کریدنے کا کوئی شوق ہے مجھے' میں جسٹ یہ کہنے آئی تھی' کہ میرا کردار آئینے کی طرح شفاف ہے۔ مغربی معاشرے میں رہ کر بھی میں نے اپنا پندار ہمیشہ سلامت رکھا ہے' کل رات آپ کے کمرے میں آنے کی جو حماقت مجھ سے سرزد ہوئی' خدا گواہ ہے کہ اس میں کسی بھی طرح سے میری بدنیتی شامل نہیں تھی۔ میں جسٹ ایک چھوٹا سا مذاق کرنے آئی تھی' مگر جواب میں جو لفظ آپ نے تماچے کی طرح میرے منہ پر مارے' میں ان سے بہت زیادہ ہرٹ ہوگئی ہوں۔"

خود کو لاکھ مضبوط کرنے کے باوجود بھی اس کا لہجہ بھرا گیا تھا۔ تاہم ازہان نے استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اگلے ہی پل رخ پھیر لیا تھا۔

"اس ساری تقریر کا مقصد۔"

قطعی بے نیاز لہجے میں کہتے ہوئے' وہ اسے سخت زہر لگا تھا۔ سارہ ٹھیک ہی کہتی تھی' وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس سے محبت کی جاتی۔

"میں تقریر نہیں کر رہی ہوں' میں آپ سے صرف اتنا ہی کہنے آئی ہوں کہ اگر میرے یہاں رہنے سے آپ کو کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے' تو صاف صاف کہہ دیں' میں یہاں سے چلی جاؤں گی' کیونکہ میری وجہ سے کوئی تکلیف میں رہے' یہ مجھے پسند نہیں۔"

"اور؟"

اس کی تمام تر باتوں کے جواب میں رخ پھیرے پھیرے ہی اس نے پوچھا تھا' جب وہ بے ساختہ پھٹ پڑی تھی۔

"اور یہ کہ آپ نہایت کٹھور انسان ہیں' آپ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے ساتھ مخلص رہا جائے' محبت کی جائے آپ سے۔"

نا چاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی تھی' جب ازہان پلٹ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"محبت کرتی ہو مجھ سے؟"

عجیب جنونی سا لہجہ تھا۔ سبرینہ ازہان کے آنسو اس لمحے اس کی پلکوں پر ہی اٹک کر رہ گئے تھے۔

"جواب دو ناں' محبت کرتی ہو مجھ سے؟"

وہی اس کا ضدی سا انداز سبرینہ ازہان کو اس لمحے سچ مچ اس سے خوف آنے لگا تھا۔ تبھی اس نے ب جھکا کر کپکپاتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں۔"

"بکواس ہے یہ۔"

ٹیرس کی آہنی گرل پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے اس نے اپنے لب سختی سے آپس میں بھینچے

"بہت مکار ہوتی ہو تم لڑکیاں ایک دم فضول۔"

سبرینہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اس پر کس کا غصہ نکال رہا ہے۔

"جاؤ تم یہاں سے' میرا جو دل چاہے گا' میں وہی کروں گا سمجھی تم۔"

اس سے واقعی کسی قسم کے اخلاق کی توقع رکھنا بیکار تھا۔

"اوکے میں چلی جاتی ہوں' لیکن کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ذرنشاء میں ایسی کون سی بات ہے' جو مجھ ہیں ہے۔"

اس کے سوال نے ازہان کو مزید تپا کر رکھ دیا تھا' لہٰذا وہ اس کی طرف پلٹا تو اس کا چہرہ خاصا سرخ ہو تھا۔

"تم یہاں سے جاتی ہو کہ میں تمہیں اٹھا کر نیچے پھینک دوں؟"

"اٹھا کر پھینک دیں' میں خود سے جانے والی نہیں ہوں۔"

اس کے جلال کے جواب میں' وہ خاصے اطمینان سے بولی تو ازہان اپنی جگہ سلگ کر رہ گیا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔"

"آپ کے ساتھ جاؤں گی اکیلے نہیں۔"

اسے ایک دم ہی ازہان کو چڑانے میں مزہ آنے لگا تھا۔ سو پھر سے ضدی لہجے میں بولی' تو ازہان ا پر ایک سلگتی نگاہ ڈالتے ہوئے' نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

♦ ♦ ♦

انسان کے دل کا موسم اچھا ہو تو پھر کائنات کی ہر چیز خوبصورت ہی دکھائی دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی ل آج کل سعیہ غیاث کا تھا۔

صبیحہ بیگم اور پنکی دونوں بے حد حیران تھیں کہ اسے ایسا کون سا قانون کا خزانہ مل گیا ہے' جو وہ یوں اؤں میں اڑتی پھر رہی ہے۔

گھر کا سارا کام خوشی خوشی کرنے کے ساتھ ساتھ پڑھائی میں بھی اس کی توجہ پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ رنے اس سے کہا تھا کہ وہ امتحان میں اس کے لئے فرسٹ پوزشن حاصل کرے لہٰذا اس کی خوشی کا مان

رکھنے کے لئے' وہ مکمل تندہی سے اپنے امتحانات میں مصروف ہوگئی تھی۔ کچھ ہی مہینوں میں اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا' تو حسب توقع اس نے پوری کلاس میں ٹاپ کیا تھا۔

گھر میں اس کے سوا اور کسی کو بھی اس کی اس درجہ کامیابی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا رات جیسے ہی عمر کا فون آیا' وہ اس سے بات کرتے ہوئے رو پڑی۔

''سنی جان رو کیوں رہی ہو؟''

اپنے ہیلو کے جواب میں اس کی نم آواز سن کر وہ بے قرار ہو کر اٹھا تھا' جب وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''عمر میرا رزلٹ آ گیا ہے۔''

''ویل تو کیا تم اس لئے رو رہی ہو کہ تم فیل ہو گئیں؟''

''نہیں فیل ہوں میرے دشمن۔''

''او' تم تو دشمنوں کے فیل ہونے پر آنسو بہا رہی ہو۔''

''نہیں عمر۔'' پاؤں پٹختے ہوئے وہ قدرے چڑ کر بولی تو عمر بے ساختہ کھلکھلا دیا۔

''بولو ناں رو کیوں رہی ہو تم؟''

اگلے ہی پل وہ سنجیدہ بھی ہو گیا تھا' تبھی وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''آج مجھے میری مما بہت یاد آ رہی ہے عمر' ان کی خواہش تھی کہ میں بہت ساری تعلیم حاصل کروں۔ پڑھ لکھ کر لوگوں کی بھلائی کے کام سرانجام دوں اور آج میں نے فسٹ پوزیشن کے ساتھ گریجوشن مکمل کر لی ہے۔ پوری کلاس میں ٹاپ کیا ہے' لیکن گھر میں کسی نے بھی' میری کامیابی پر خوشی کا اظہار نہیں کیا' کوئی میری خوشیوں میں خوش ہونے والا نہیں ہے۔''

ناچاہتے ہوئے بھی اس کی آواز پھر بھر آئی تھی۔

''سنی۔'' دوسری طرف سے عمر کا دل جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔

''سنی میں ہوں ناں تمہاری خوشیوں میں خوش ہونے والا' تم یقین کرو' تمہارے رزلٹ کا سن کر میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا ہوں' بولو اتنی بڑی کامیابی پر کیا گفٹ کروں تمہیں؟''

خوشی اس کے ایک ایک لفظ سے عیاں تھی۔ لہٰذا سنعیہ کا دل بھی خوشی سے بھر گیا۔ تبھی وہ مسکرا کر قدرے ممنونیت سے بولی۔

''تھینکس عمر آپ کی محبت سے بڑھ کر اور کوئی تحفہ میرے لئے انمول نہیں ہے۔''

''او کے تو پھر آج شام ہماری بے لوث محبت وصول کرنے کے لئے تیار رہنا' میں آ رہا ہوں شام میں۔''

''نن' مما اور پنکی۔''

اس کی بات درمیان میں کاٹ کر وہ عجلت میں بولا۔

سارا دن سنعیہ یہی سوچ کر پریشان ہوتی رہی کہ شام میں عمر آئے گا تو وہ صبیحہ بیگم اور پنکی کے سامنے اس سے بات کیسے کرے گی؟ اور اگر عمر نے کوئی ایسی ویسی بات کہہ دی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ عجیب بے بسی تھی کہ وہ اسے خود سے کال کر کے آنے سے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا سیل نمبر بھی اس کے علم میں نہیں تھا' سو دن بھر کڑھتی رہی' جیسے جیسے شام قریب آ رہی تھی' اس کا دل لرزتا جا رہا تھا پھر اچانک جیسے معجزہ ہو گیا۔

جونہی شام کے سائے پھیلے' صبیحہ بیگم اور پنکی دونوں خوب تیار ہو کر' گھر سے نکل گئیں۔

سنعیہ تو اس حسین اتفاق پر خوشی سے گنگ ہی رہ گئی تھی۔

ابھی انہیں گھر سے نکلے بمشکل پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ڈور بیل پھر سے بج اٹھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے عمر اپنی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر پھیلائے کھڑا' اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم عزیز از جان! کیسی ہو؟''

وہیں دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک لگا کر وہ دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے بولا تو سنعیہ راستہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

''پلیز اندر آ جائیں' یونہی گلی میں کسی نے دیکھ لیا' تو خواہ مخواہ کی باتیں بن جائیں گی۔''

''تو بن جانے دو ناں یار' بدنامی ہوگی' تو ہماری شادی بھی ہو جائے گی۔''

گھر کے اندر قدم رکھتے ہوئے وہ قدرے لاپروائی سے بولا تو سنعیہ کا دل پھر سے مچل اٹھا۔

''بہت خراب ہیں آپ' میں دن بھر سے یہ سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی کہ اگر امی اور پنکی کے سامنے آپ نے ایسی ویسی کوئی بات کہہ دی تو میرا کیا بنے گا؟''

سنعیہ کی بات پر وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

''کیا سنی یار! اتنا ڈرتی کیوں ہو تم؟ میرے ہوتے ہوئے کوئی ٹیڑھی نگاہ سے تمہاری طرف دیکھ بھی نہیں سکتا او کے۔''

اس کے کندھوں پر اپنے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ ڈالتے ہوئے وہ بولا' تو سنعیہ نے فوراً لرزتی پلکیں گرا کر آہستہ سے اثبات میں ہلا دیا۔

''عمر... مما اور پنکی کہاں گئی ہیں؟''

کچھ ہی لمحوں کے بعد اس نے پوچھا' تو وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''آہ یہ ظالم محبت بھی انسان کو کس کس طرح سے خوار کرتی ہے۔''

ڈھیلے ڈھالے انداز میں' قریبی صوفے پر گرتے ہوئے اس نے سرد آہ بھری تھی۔ جواب میں

سنعیہ قدرے حیران ہوتی اس کے سامنے ہی والے صوفے پر ٹک گئی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں اپنے ایک فرینڈ کی فرضی برتھ ڈے پارٹی ارینج کروا کر آنٹی اور پنکی کو وہاں ... کر آیا ہوں۔اب وہ بیچاری بڑی بے تابی کے ساتھ میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔''

''او' بڑی فکر ستا رہی ہے آپ کو اس کی۔''

اس کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً ہی جلتے ہوئے بولی تو عمر کے لب پھر سے مسکرا اٹھے۔

''ظاہر ہے فکر تو ہوگی' آخر کو سالی آدھے گھر والی ہے میری۔''

اس کا موڈ بے حد فریش تھا' لہٰذا سنعیہ اسے گھور کر دیکھتے ہوئے' پھر خود بھی مسکرا دی۔

''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ' آج مابدولت تمہیں ساحل سمندر کی سیر کروانے کا ارادہ رکھتے ہیں'' پھیل کر صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے کہا تو سنعیہ فکر مندی سے اس کی طرف د... لگی۔

''نہیں عمر! مما اور پنکی اچانک آ گئیں تو میری خیر نہیں ہوگی' پھر بابا بھی پچھلے تین چار روز آؤٹ آف سٹی ہیں' اگر وہ اچانک آ گئے تو؟''

''تو کچھ نہیں' کوئی قیامت نہیں آئے گی' نہ ہی میں تم پر کوئی آنچ آنے دوں گا' جاؤ شاباش ج... سے تیار ہو کر آ جاؤ۔''

''مگر عمر۔''

''کوئی اگر مگر نہیں' آؤ شاباش۔''

اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے اسی کے کمرے میں لے آیا۔

''پتہ نہیں کس سیارے کی مخلوق ہو تم' زندگی کیسے گزاری جاتی ہے تمہیں کیا پتہ۔''

خود سے آگے بڑھ کر اس کی وارڈ روب سے اپنے پسندیدہ کلر کا لائیٹ پرپل سوٹ نکال کر اس ... ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ قدرے رعب سے بولا۔تو سنعیہ متفکر ہونے کے باوجود مسکرائے بغیر نہ رہ سکی

''محترمہ! کبھی مارکیٹ کا چکر بھی لگا آیا کریں۔''

اگلے ہی پل وہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔تو سنعیہ کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ سمجھ چکی تھی کہ عمر نے اس کی وارڈ روب میں پرانے کپڑوں کی اکثریت دیکھ کر اسے یہ مشورہ دیا ہے' ا... چپ کھڑی رہ گئی۔

''سنی پلیز جلدی کرو' نہیں تو میں خود تمہارا حلیہ بدل کر رکھ دوں گا۔'' اس کے کہنے کی دیر تھی کہ سنـ... فوراً واش روم کی طرف بھاگ گئی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ تیار ہو کر نیچے آئی' تو عمر بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''تھینک گاڈ' آج کی تاریخ میں محترمہ کی تیاری مکمل تو ہوئی' وگرنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ کو ...ے سے نکلنے میں دو ہفتے لگ جائیں گے۔''

ستائش سے بھرپور نگاہ' اس کے حسین سراپے پر ڈالتے ہوئے' وہ قدرے مسرور لہجے میں بولا تھا۔

''چلتے ہوئے تم اپنی مرضی کر رہی ہو' مگر واپسی میری مرضی سے ہوگی او کے۔''

گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے مدھر آواز میں سرگوشی کی' تو سنعیہ کی دھڑکنیں پھر سے انتشار ...ار ہو کر رہ گئیں۔

• • •

موسم خاصا اداس ہو رہا تھا۔

خزاں رت میں درختوں سے گر کر زمین پر بکھرتے پتوں کی زردی نے اس کے اندر بھی عجیب سی ...پھیلا دی تھی۔

کیسی عجیب بات تھی کہ اس کے لئے دنیا میں جیسے کہیں بھی سکون میسر نہیں رہا تھا۔

اپنی ہی سانسیں روح پر بوجھ محسوس ہو رہی تھیں۔

آفس میں ذہن لگ رہا تھا' نہ ہی گھر میں دل...... عجیب سی بے کلی تھی' جسے وہ کوئی بھی نام دینے سے ...رتھا' پچھلے کئی روز سے اس نے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔

اس وقت بھی وہ کمرے میں اندھیرا کئے' بیڈ پر الٹا لیٹا تھا' جب دادو ہلکے سے دروازہ ناک کرنے بعد دھیرے دھیرے چلتی ہوئیں اس کے پاس بیڈ پر آ بیٹھیں۔

''اسفی! کیا بات ہے بیٹے' پچھلے کئی دنوں سے بہت اداس دکھائی دے رہے ہو۔''

اپنا شفقت بھرا ہاتھ اس کے گھنے براؤن بالوں میں پھیرتے ہوئے انہوں نے محبت سے پوچھا جب وہ پلٹ کر اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے پلکیں موند کر بولا۔

''پتہ نہیں دادو' ان دنوں میں خود اپنی کیفیت سمجھنے سے قاصر ہوں' کہیں کسی کام میں بھی دل نہیں لگ ...ہے۔شاید میں ممی پاپا چندی اور روحیل کو بہت مس کر رہا ہوں۔''

اپنے سگے باپ کے ساتھ ساتھ سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کا تذکرہ اس نے یوں کیا تھا ...وہ لوگ پتہ نہیں اس سے کتنے اٹیچ ہوں' حالانکہ جو سلوک اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں اس سے ساتھ روا رکھا تھا۔وہ ہرگز فراموش کئے جانے کے قابل نہیں تھا۔

اب بھی وہ لوگ یورپ گھومنے کے لئے گئے ہوئے تھے' مگر اس سے کسی نے جھوٹے منہ بھی ساتھ ...نہیں کہا تھا۔

اپنی سوتیلی ماں اور بہن بھائی کے برے رویوں کے باوجود' وہ ہر پل ان سب کے لئے جان قربان ...نے کو تیار رہتا تھا۔

اپنی ماں کے ہر حکم کو عبادت کا درجہ دیتا تھا' جب کہ وہ اس کی تمام تر فرمابرداری کے باوجود اس دلی عناد رکھتی تھیں۔ گھر میں سوائے دادو اور پاپا کے اور کوئی بھی اس کا خیر خواہ نہیں تھا' مگر اسفند نے ان کو کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔

''اسفی بیٹے! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔''

اسفند شیرازی کے ستے ہوئے چہرے پر اک ملول سی نگاہ ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا تھا' جب محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کر لوں گا دادو! جب بھی آپ جیسی کوئی سویٹ اینڈ کیوٹ سی لیڈی ملی' فوراً شادی کر لوں گا' پرامس۔''

''ہٹ بدمعاش' روز ایک ہی بات کہہ کر ٹرخا دیتا ہے مجھے' پتہ نہیں شیرازی نے کیا سوچ رکھا ہے' تیس سے اوپر کا ہو رہا ہے' مگر اسے کوئی پروا ہی نہیں ہے' یوں اسے بیوی بچوں میں مدہوش ہے جیسے تجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں اس کا' بس اسفی بہت ہو گیا۔ اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی' تمہیں اگر کوئی لڑکی پسند نہیں آ رہی تو نا سہی' میں خود ہی تمہارے لئے لڑکی پسند کر لیتی ہوں اپنی دادو کی پسند پر بھروسہ تو ہے نا تجھے۔''

پتہ نہیں وہ آج کیا ارادہ کر کے آئی تھیں۔ اسفند ایک دم سے بوکھلا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں دادو' کیوں مجھ غریب کی آزادی کی دشمن ہو گئی ہیں آپ؟ پلیز تھوڑا وقت اور دیں' پھر آپ جیسے کہیں گی میں ویسے ہی کروں گا۔''

''اچھا اور اس دوران اگر دادو نہ رہی تو؟''

''پلیز دادو! کتنی بار کہا ہے آپ سے کہ میرے سامنے ایسی باتیں نہ کیا کریں' خدانخواستہ اگر آپ میری شادی سے پہلے کچھ ہو گیا۔ تو میں ساری عمر کنوارہ رہوں گا' کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔''

دادو جانتی تھیں کہ وہ ان سے بے حد اٹیچ ہے تبھی اس کے تڑپنے کا لطف لیتے ہوئے بولیں۔

''اچھا اس لڑکی سے بھی شادی نہیں کرو گے' جس کا جوگ لے کر بیٹھے ہوئے ہو۔''

یہ حملہ پہلے حملے سے بھی زیادہ کاری تھا' لہٰذا وہ خفگی سے ان کی طرف دیکھ کر پھر انہی کی گود میں منہ چھپاتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔''

''چل جھوٹا نہ ہو' خوب جانتی ہوں میں تجھے' خدا کرے' وہ لڑکی تجھے مل جائے میرے بچے۔'' پیار سے ایک ہلکی سی چپت اس کے مضبوط کندھے پر رسید کرتے ہوئے وہ قدرے یاسیت سے بولیں' اسفند کے لبوں سے بے ساختہ نکل گیا۔

''آمین۔''

اگلے روز آفس میں ثمرن سے اس کا سامنا ہوا تو جانے کیسے وہ اس سے کہہ بیٹھا۔

''مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی مس ثمرن۔''

اس کے اضطراری انداز نے ثمرن کو چونکا دیا تھا' تاہم وہ خود کو ریلیکس رکھتے ہوئے بولی۔

''کہیئے سر! میں سن رہی ہوں۔''

اگلے کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہوئے تھے' اپنے سامنے ٹیبل پر پڑے پیپر ویٹ کو گھماتے ہوئے وہ خود کو دل کی بات کہنے کے لئے تیار کر رہا تھا۔

''ثمرن بہت سوچنے کے بعد میں خود کو آپ سے یہ بات کہنے کے لئے تیار کر پایا ہوں کہ مجھے آپ کی ضرورت ہے' آسان لفظوں میں' میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں' کیا آپ میرا ہاتھ تھامنا پسند کریں گی۔''

اس کی بات غیر متوقع نہیں تھی۔ ثمرن جانتی تھی ایک نہ ایک دن وہ یہ کہے گا' وہ خود بھی چاہتی تھی کہ وہ یہ سب کہے' مگر کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے باوجود اس وقت اس کے اندر جیسے دور تلک اداسی بکھرتی چلی گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

وہ گم صم سی ننھے سلمان کا ہاتھ پکڑے کھڑی' اس عورت کو دیکھ رہی تھی' جو سلمان کو آواز لگاتی' سرعت سے چلتی ہوئی' اس کے قریب آ پہنچی تھی۔

''سلمان میرے بچے کیسے ہو تم؟''

نازیہ شیرازی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سلمان کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

''او مائی گاڈ! کتنا کمزور ہو گیا ہے میرا بچہ' پتہ نہیں وہ شخص اس کا خیال بھی رکھتا ہے کہ نہیں؟'' بلند آواز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ سلمان کیلئے خاصی فکرمندی دکھا رہی تھی' جب کہ سلمان یوں سہم کر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا' گویا اسے جانتا تک نہ ہو۔

''ایکسکیوزمی' کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند فرمائیں گی؟''

سلمان کا چہرہ دیکھ کر بالآخر نازیہ شیرازی نے اسے مخاطب کرنے کی جسارت کر ڈالی تھی۔ جواب ملا وہ یوں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی' گویا اس کے مخاطب کئے جانے پر حیران ہو۔

''تم کون ہو؟''

نخوت سے ناک سکوڑتے ہوئے اس نے نازیہ کا سوال یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

''یہ میری مما ہیں' نازی مما۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' سلمان لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ اٹھا۔

''شٹ اپ تمہاری مما میں ہوں صرف میں سمجھے تم۔''

نازیہ کی توقع کے برخلاف وہ خاصی مشتعل ہو اٹھی تھی۔ ننھے سلمان کا بازو اس کی مضبوط گرفت میں تھا اور وہ نازیہ کی طرف دیکھتے ہوئے رو رہا تھا۔

"پلیز بچے کو چھوڑیں آپ' دیکھیں یہ رو رہا ہے۔"

نازیہ اس تمام صورت حال سے خاصی پریشان ہو اٹھی تھی' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عورت ا[یسا] کیوں کر رہی ہے۔

"تم اپنی اوقات میں رہو تو بہتر ہے' میں اس بچے کی ماں ہوں' سنوان ہمدانی کی سابقہ بیوی ہو[ں] میں' سنا تم نے' چار دن پال پوس کر تم اس بچے کی ماں بن بیٹھیں' یہ میرا بچہ ہے' میرا' میں نے جنم دیا [ہے] اسے پورے پانچ سال اس کی شکل دیکھنے کو ترستی رہی ہوں میں' اب اسے خود سے دور نہیں ہونے دوں گی' کہہ دینا اس سنوان ہمدانی سے لے کر جا رہی ہوں اپنا بچہ۔"

ناگن کی مانند پھنکارتے ہوئے اس نے ننھے سلمان کو اپنے دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور بیرو[نی] دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ایکسکیوزمی دیکھیں پلیز سنوان کو آ جانے دیں' آپ کو جو بھی کرنا ہے اس کے سامنے کیجئے گا میں یوں اس طرح سے آپ کو بچہ لے جانے نہیں دوں گی۔"

لمحے کے ہزارویں حصے سے قبل وہ لپک کر اس کی راہ میں آ کھڑی ہوئی تھی۔

"شٹ اپ تم ہوتی کون ہو میری راہ میں آنے والی ہٹو سامنے سے۔"

اس عورت میں تہذیب و تمیز نام کی کوئی چیز نہیں تھی لہٰذا نازیہ کو اپنے سامنے سے ہٹانے کے لئے اس نے اسے زور سے دھکا دیا' جس کے باعث وہ لڑکھڑا کر قریبی ٹیبل کے قریب گری اور اس کی پیشانی پر چوٹ لگ گئی۔

"مما۔"

اس کی پیشانی سے نکلتا خون دیکھ کر سلمان مچل اٹھا تھا۔ عین اسی لمحے کسی کے بھاری بوٹوں کی آواز ابھری اور اگلے ہی پل سنوان ہمدانی رابعہ نورین کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

"تمہاری جرأت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی؟"

غیض و غضب کا نمونہ بنا وہ اس سے پوچھ رہا تھا' جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں چنگھاڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے تمہاری اس کٹیا کا دیدار کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے' میں یہاں صرف اپنے بچے کو لے جانے کے لئے آئی ہوں۔"

"شٹ اپ سلمان میرا بیٹا ہے یہ میرے پاس رہے گا۔"

سنوان کی کشادہ پیشانی پر غصے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

"سلمان کو جنم دینے والی میں ہوں' مسٹر سنوان! آپ شاید یہ بات بھول رہے ہیں' بہرحال بہت [رہ لی]ا یہ تمہارے پاس' میرے بیٹے پر میرا بھی کوئی حق ہے۔"

وہ بھلا اس کے غصے سے کہاں مرعوب ہونے والی تھی' ننھے سلمان کو اس تمام صورت حال سے سہا دیا [تھا] لہٰذا اب اس نے سنوان کی طرف لپکتے ہوئے زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

"دیکھو رابعہ نورین! میں اگر تمہارے ساتھ شرافت سے پیش آ رہا ہوں' تو اسے میری کمزوری مت [سمج]ھو' مت بھولو کہ اس بچے کو تم اس وقت بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئی تھیں' جب اسے تمہاری سب سے [زیا]دہ ضرورت تھی' حق کی بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی۔"

نازیہ چپ چاپ ایک سائیڈ پر کھڑی' ان دونوں کے بیچ ہونے والے جھگڑے کو دیکھ رہی تھی۔ [سنو]ان کی نظر ابھی تک اس کی پیشانی کے زخم پر نہیں پڑی تھی۔ اس کا لہجہ ازحد تلخ ہو رہا تھا۔

"سلمان میرا بھی بیٹا ہے' تم مجھے اسے لے جانے سے نہیں روک سکتے۔"

"شٹ اپ۔" وہ دھاڑ کر کہتے ہوئے اس نے سلمان کو کھینچ کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

"جاؤ یہاں سے میں دوبارہ کبھی تمہیں سلمان کے قریب نہ دیکھوں۔"

ایک ہاتھ سے اس کا بازو اپنی گرفت میں لے کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں سنوان' میں اپنے بیٹے کو تم سے حاصل کر کے رہوں گی۔" جاتے [ج]اتے اس نے سنوان کو دھمکی دی تھی۔ جسے سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ واپس ہال میں آ گیا تھا۔ جہاں [ناز]یہ شیرازی اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھے نیچے زمین پر ہی بیٹھی تھی۔

"مما۔"

سلمان اسے دیکھتے ہی پھر مچل اٹھا تھا۔ اب کے سنوان ہمدانی نے بھی قدرے حیرانگی سے اس کی [ط]رف دیکھا تھا۔

"یہ...... یہ سب کیا ہے مس نازیہ؟" تیزی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے وہ اس کے سامنے ہی نیچے زمین پہ بیٹھ گیا تھا۔

"پاپا' ما کو اس عورت نے مارا تھا۔"

سلمان اس سے پہلے ہی جواب دیتے ہوئے اس سے لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ جب کہ سنوان کی پیشانی پر بل سے شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہوا مسٹر سنوان' مانی ابھی بچہ ہے اسے کیا پتہ؟"

پیارے سلمان کے معصوم چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اسے اپنے ساتھ لگا کر بولی' تو سنوان لب بھینچ کر رہ گیا۔

"میں فسٹ ایڈ بکس لے کر آتا ہوں۔"

انگلے ہی پل وہ اس کی پیشانی پر لگنے والے زخم کا بغور معائنہ کرتا وہاں سے اٹھ کر کچن کی طرف بڑھ گیا تھا۔

♦ ♦ ♦

حمدان بھیا کی شادی کی تقریب اپنے اختتام پر تھی۔

دولہا کے روپ میں سجے سنورے حمدان احمد کا سراپا وجاہت کا زبردست نمونہ لگ رہا تھا۔ برات جانے میں کچھ ہی وقت تھا۔

صبح سے کام میں مصروف ہونے کے باعث سبرینہ کو خود سجنے سنورنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اب بھی اگر حائقہ پھپھو اسے زبردستی کچن سے باہر نہ نکالتیں تو شاید وہ برات میں شامل ہونے سے بھی رہ جاتی۔

کچن سے نکل کر اپنے گیلے ہاتھ صاف کرتی وہ اوپر اپنے کمرے کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک نگاہ سامنے سے آتے ازہان پر جا پڑی جو رف حلیئے میں بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ یونہی تیار ہوئے بغیر پھر رہا تھا۔

"السلام علیکم! آپ تیار نہیں ہوئے۔"

فوراً اسے پیشتر اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے وہ پوچھ بیٹھی تھی جب وہ ابرو اچکا کر تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم سے مطلب؟"

"مطلب تو ہے ناں سب تیار ہو کر اتنے اچھے لگ رہے ہیں اور آپ؟"

"تم اپنے کام سے کام رکھو اوکے! مجھ سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس کی بات درمیان میں کاٹ کر وہ پھر تلخی سے بولا تھا۔ جب سبرینہ ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔

"اچھا...... اگر فری ہو گئی تو کیا کر لیں گے آپ؟"

اس کی شخصیت میں ایک دم سے اعتماد آ گیا تھا۔

ازہان اسے نظرانداز کرتا اپنے کمرے میں آیا تو سبرینہ بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی۔

"میں ڈریس پسند کرنے میں آپ کی مدد کروں؟"

خود ہی وارڈروب کی طرف لپکتے ہوئے وہ بولی تو ازہان جیسے تھک کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"کوئی مدد نہیں چاہئے مجھے تمہاری کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی ہو تم؟"

"اور کوئی تو آپ کے پیچھے پڑتا نہیں میں نے سوچا میں ہی پڑ جاؤں ویسے آپ کا اس میں کیا نقصان ہے۔"

اپنی مرضی سے اس کا گرے تھری پیس نکال کر پریس کرتے ہوئے وہ بولی تو ازہان زچ ہو کر رہ

گیا۔

"سنئے وہ مجھے اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ جیولری اور چوڑیاں چاہئے لادیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔"

"کیوں میرے کزن نہیں ہیں آپ؟"

قطعی بے ساختگی میں اس کے منہ سے نکلا تھا جواب میں ازہان نے یوں چونک کر اس کی طرف دیکھا گویا اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں میرے پاپا آپ کی مما کو منہ بولی بہن کہتے تھے۔ اس لحاظ سے آپ میرے کزن ہی ہوئے ناں خیر چھوڑیں اس بات کو جلدی سے کپڑے بدل کر تیار ہو جائیں۔ شیو بنانے کا ٹائم تو اب رہا ہی نہیں میں بھی اب تیار ہونے جا رہی ہوں۔"

پٹر پٹر بولتے ہوئے اس نے اپنی بے ساختگی پر پردا ڈالنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

ازہان کے لئے ایک مرتبہ پھر اسے نظرانداز کرنا خاصا دشوار ہو گیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ لائیٹ پرپل کلر کے سادہ سے کام والے سوٹ میں ملبوس اس کے سامنے آئی تو خاصی فریش لگ رہی تھی۔

"تیار ہو گئے آپ؟ واؤ بہت پیارے لگ رہے ہیں قسم سے۔"

بڑی بڑی پرکشش نگاہوں میں بے حد ستائش تھی۔ ازہان اس لمحے بس اسے گھور کر رہ گیا تھا۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

بالکل معمولی سے میک اپ کے باوجود اس کا حسین سراپا بجلیاں گرا رہا تھا لہٰذا ازہان نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

"مجھے معلوم ہے میں بہت پیاری لگ رہی ہوں مگر آپ اپنے منہ سے یہ کبھی نہیں کہیں گے جلتے جو ہیں مجھ سے۔"

کہنے کے ساتھ ہی وہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تو ازہان سرد آہ بھر کر وہیں بیڈ پر ڈھے گیا۔

تھوڑی دیر میں برات کی روانگی عمل میں آئی تو ہر کوئی پھر سے متحرک ہو گیا۔

دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہٰذا سبرینہ حویلی میں ہی رک گئی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے باعث پوری حویلی میں ایک دم سے سناٹا پھیل گیا تھا۔

پورا دن وہ دادی ماں کے پاس بیٹھی ان کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔ جانے کیوں دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔ شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ کوئی تنہا گوشہ ملے اور وہ وہاں بیٹھ کر خوب ڈھیر سارا رو لے۔

آج اسے اپنے پاپا کی بھی بہت یاد آ رہی تھی۔

خدا خدا کر کے دن ڈھلا' تو وہ دادی ماں کو سکون سے سوتا چھوڑ کر' دادا جی کے کمرے کی طرف چلی آئی۔ دھڑ دھڑ کرتے دل کو بمشکل سنبھال کر اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو انہیں کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف پایا۔ آج پہلی بار اس نے اپنے دادا جی کی جھلک دیکھی تھی۔ لہٰذا دل کی حالت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ خود کو نارمل کر پاتی' کہ قریب ہی پڑے ٹیلی فون کی گھنٹی خوب زور و شور سے بج اٹھی۔

''ہیلو سبی' میں سارہ بول رہی ہوں' دیکھو ازہان بھیا کا بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے' ان کی حالت بہت سیریس ہے پلیز ان کے لئے دُعا کرو۔''

دوسری طرف اس کی پھپھوزاد کزن سارہ یزدانی کہہ رہی تھی اور سبرینہ کو لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود ایک دم سے فریز ہو گیا ہو۔

''ہیلو سبی تم سن رہی ہو ناں؟''

ائیر پیس سے اب بھی سارہ کی آواز ابھر رہی تھی' مگر وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ نگاہوں کے سامنے ایک دم سے سجے سنورے ازہان کا وجیہہ سراپا آ گیا تھا۔ آج گرے تھری پیس سوٹ میں وہ لگ بھی تو کتنا پیارہ رہا تھا۔

گم صم سے انداز میں سوچتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے سارہ کو ''ہاں'' کہا تھا۔

''دیکھو سبی ہم لوگ گھر واپس آ رہے ہیں تم مناسب لفظوں میں نانو کو بتا دینا او کے۔''

''ٹھیک ہے۔''

گھٹی گھٹی سی مدہم آواز میں کہتے ہی وہ قریبی صوفے پر ڈھے گئی تھی۔

آپ ہی آپ آنکھوں سے گرم آنسوؤں کا لاوہ بہہ کر گالوں کو تر کرتا ہوا نیچے زمین میں جذب ہو گیا۔

''نہیں...... تمہیں کچھ نہیں ہو گا ازہان...... میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی۔''

سینے میں الجھتی سانسوں سے بے نیاز خود اپنے ہی درد سے کٹتے ہوئے بہت مدہم لہجے میں وہ چلائی تھی۔

پچھلے کئی سالوں سے اس نے خدا کو یاد نہیں کیا تھا۔ مگر اس لمحے' خدا سے اپنے محبوب کی زندگی کی بھیک مانگنے کے لئے اسے خدا یاد آیا تھا۔ لہٰذا اسی وقت برستے آنسوؤں کے ساتھ وضو کر کے وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

ساحل سمندر پر موسم خاصا خوبصورت ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ گہری ہوتی شام کے دھند لکے ارد گرد اپنا سحر پھیلاتے ہوئے بہت دل نشین دکھائی دے رہے تھے۔

سنعیہ نے زندگی کو اتنا خوبصورت پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''عمر!''

''ہاں۔''

وہ جو اس کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے سمندر کی لہروں پر نگاہیں جمائے بیٹھا تھا' اس کی پکار ذرا جی جان سے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عمر! مجھے زندگی بہت خوبصورت محسوس ہونے لگی ہے' یہ...... یہ خواب ٹوٹ تو نہیں جائے گا ناں' ...... تم مجھ سے بدل تو نہیں جاؤ گے عمر!''

وہ اتنی خوف زدہ اور وہمی کیوں رہتی تھی' عمر اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا۔ تبھی وہ اپنائیت سے اس کا ...ھ تھپتھپاتے ہوئے بولا تھا۔

''جو لوگ آپ سے محبت کرتے ہوں' ان پر کبھی شک نہیں کیا کرتے سنی! محبت کو بدگمانی کی بھینٹ میں چڑھانا چاہئے' ورنہ یہ آپ سے روٹھ جاتی ہے اور پتہ ہے سنی محبت اگر ایک بار آپ سے روٹھ جائے تو پھر کبھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا کرتی۔'' اس کی باتوں میں جو فلسفہ در آتا تھا' وہ کبھی کبھی سنعیہ غیاث کی ...جھ میں نہیں آتا تھا۔

اس وقت بھی وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھائے' سادگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''خیر چھوڑو' یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی' لاؤ اپنا ہاتھ دو' مجھے رنگ پہنانی ہے۔'' فوراً اسے ...شتر اس کا موڈ بدلا تھا۔

سنعیہ نے اس بار قدرے کنفیوز ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے آگے کر دیا تھا۔

''لیجئے جناب! منگنی کی رسم تو ادا ہو گئی' اب نکاح باقی رہ گیا ہے' وہ بھی انشاء اللہ جلد ہی ہو جائے گا۔ ...ر تو آپ مکمل طور پر ہماری دسترس میں ہوں گی۔'' پل دو پل کے لئے وہ شوخ ہوا تھا۔

سنعیہ کے لئے اس لمحے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔

پہلی بار اپنے دل کی اودھم مچاتی دھڑکنوں کا شور سننا' اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ عمر عباس تو ...ی ...ربت میں بسر ہوتے یہ چند لمحے اس کی کل زندگی کا حاصل تھے۔

''فلو تمہاری شاندار تعلیمی پوزیشن کا انعام تو ہو گیا۔ اب آؤ تمہیں کچھ چیزیں مارکیٹ سے تمہاری ...ند کی دلوا دوں' پھر ہم مل کر ڈنر کریں گے' اس کے بعد لانگ ڈرائیونگ پھر واپسی کا پروگرام ہو گا۔''

''جی نہیں مجھے ابھی اپنی جان کی سلامتی عزیز ہے' بس اب گھر چلو عمر پلیز۔''

ایک لمحے میں اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''ارے تو فاؤل ہے میں نے گھر سے نکلتے ہوئے تم سے وعدہ لیا تھا کہ واپسی میری مرضی سے ہو ...۔'' اس کے مقابل کھڑے ہوتے ہوئے اس نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا۔

تاہم سنعیہ نے اس کے احتجاج کی مطلق پروانہ کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

''نہیں عمر میں اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہ سکتی' ویسے بھی کافی ٹائم ہو گیا ہے' پلیز گھر چلو۔''

''ہرگز نہیں' ابھی ہم شاپنگ کریں گے پھر ڈنر اس کے بعد گھر واپسی کا سوچیں گے۔''

''پلیز عمر آج کے لئے اتنا وقت بہت کافی ہے۔''

اس کے سنعیہ نے احتجاج کیا تھا اور عمر نے بے نیازی سے رخ پھیر لیا تھا۔

''تمہارے لئے ہو گا' میرا دل نہیں بھرا ہے ابھی۔''

''تمہارا دل تو کبھی نہیں بھرے گا' تمہاری وجہ سے میں مما کے عتاب کا نشانہ نہیں بن سکتی۔'' لپک آیا۔

''سنی پلیز یار! ڈنر تو کر لو میرے ساتھ' آنٹی اور پنکی اتنی جلدی گھر آنے والی نہیں ہیں۔''

اسے سنجیدہ دیکھ کر وہ منت پر اتر آیا تھا' مگر سنعیہ نے اس کی ریکوسٹ پر بھی کان نہیں دھرے۔

''ہرگز نہیں۔ گھر چل کر کھانا کھالیں گے' مجھے پاپا کے لئے کھانا تیار کرنا ہو گا' ہو سکتا ہے آج وہ واپس لوٹ آئیں۔''

''پلیز سنی۔'' اس کی وضاحت سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ اپنی ہی ضد پر اڑا ہوا تھا۔

''نہیں' تو بس نہیں۔'' سنعیہ اس کی خواہش کو سمجھ ہی نہیں سکی تھی۔ لہٰذا اس کی خوشی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات پر اڑی رہی تو عمر نے بھی چپ سادھ لی۔ کلفٹن سے گھر تک کے تمام سفر میں وہ خاموش ہی رہا تھا' پھر اسے گھر کے عین سامنے ڈراپ کر کے بناء کچھ کہے سنے وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

♦ ♦ ♦

بچھڑ جانے والے لوگو' کبھی تو سوچو
جن کو تم اپنی چاہت کی
ان دیکھی زنجیر میں باندھ کے آئے ہو
جن کو تم خوش رنگ خوابوں کا لالچ دے کر
تنہا ہی چھوڑ آئے ہو
وہ پل پل رستہ دیکھتے دیکھتے
اک دن سانسیں ہار گئے تو
کس کو خواب دکھاؤ گے تم
پھر لوٹ کے دیس کیوں جاؤ گے تم

وہ ملول سا کھڑکی میں کھڑا' تیزی سے برستی ہوئی بارش کی بوندوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب اس ے ے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔

سلمان نے فوراً چونک کر پیچھے نگاہ کی تو اپنے عزیز دوست جبار جعفری کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی

دھیمے سے مسکرا دیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں سلمان! تم پاکستان جا رہے ہو؟''

چہرے پر ہلکی سی خفگی لئے وہ اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ پھر سے اپنی توجہ بارش کی سمت مبذول کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں یار! تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ اب ان فضاؤں میں دل نہیں لگتا۔''

''واہ سبحان اللہ! کیا جواز پیش کیا ہے' دل نہیں لگتا۔ جہاں دل لگتا ہے وہاں کیا رکھا ہے سوا ذلالت کے۔''

جبار جعفر کا لہجہ بے لچک تھا۔ تبھی سلمان علوی کی آنکھوں میں بھی کچھ لمحوں کے لئے جیسے دھندی چھا گئی تھی۔ بہت دیر کے بعد خود کو کچھ بھی بولنے کے لئے تیار کر پایا تھا۔

''بہت سال ہو گئے جبار! اب اس دھرتی سے دور رہنا بہت محال لگنے لگا ہے۔''

''اس دھرتی سے دور رہنا یا اس لڑکی سے دور رہنا؟''

اس کی بات اچکتے ہوئے جبار نے اس پر خفیف سا طنز کیا تو وہ پھر سے مسکرا دیا۔

یکلخت ہی بیتے ہوئے لمحوں کی دھول اس کی آنکھوں میں لہرائی تھی۔ لب کچھ بھی کہنے کی کوشش میں محض وا ہو کر رہ گئے تھے۔

''مت جاؤ سلمان پلیز۔''

اب کے جبار نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس سے ریکویسٹ کی تھی۔ جواب میں وہ کسی ٹوٹے ہوئے درخت کی مانند ڈھے کر قریبی بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''جانے دو یار! سات سال بہت ہوتے ہیں کسی کی جدائی میں بیتانے کے لئے۔ اب حوصلوں میں وہ پہلی سی مضبوطی نہیں رہی۔''

وہ واقعی بہت شکستہ حال دکھائی دے رہا تھا۔

جبار نے ایک دکھ بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے سرد آہ بھری تھی۔

''او کے' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

بحث برائے بحث سے دامن بچاتے ہوئے اس نے فوراً ہتھیار ڈالے تھے۔ جواب میں سلمان کے چہرے پر بکھری تھکن طمانیت میں بدل گئی۔

''تھینکس یار!''

''بتاؤ نہیں کہ۔ یہ بتا مستقل وہاں سیٹل ہونے کا ارادہ ہے یا یونہی موڈ بدلنے کے لئے جا رہے ہو۔'' وہ بھی اس کے پہلو میں ہی آن ٹکا تھا۔ تبھی سلمان نے اسے بتایا تھا۔

''ہاں جا کر پھر نہیں جانے کا حوصلہ کہاں رہے گا مجھ میں؟''

''کیوں؟ تم کیا سمجھتے ہو وہ اب بھی تمہارے انتظار میں بیٹھی تمہارا راستہ دیکھ رہی ہوگی؟''

''ہاں۔''

سلمان علوی کے لہجے میں گہرا یقین تھا۔ تبھی جبار مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

''تم تو پاگل ہو یار! کوئی اتنے سال تک کسی کے ہونے یا نہ ہونے کی آس میں نہیں جیتا' بھول گئی وہ بھی تجھے۔''

''نہیں یار! میں جانتا ہوں وہ سانس لینا بھول سکتی ہے۔ مگر...... میرے پیار کو بھلانا اس کے لئے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اسے اپنی محبت کی زنجیر میں نہیں باندھا' کوئی عہد و پیمان بھی نہیں کئے تھے مگر پھر بھی میں اسے جانتا ہوں۔ وہ مجھے بھول کر اور کسی کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی۔''

اس لمحے جبار جعفر کو اس کے یقین بھرے مان پر رشک آیا تھا۔

نازیہ شیرازی کے بارے میں سلمان علوی کی زبانی بہت باتیں سنی تھیں اس نے' جب سے وہ زندگی کی طرف واپس لوٹا تھا' تب سے اس کی زبان پر صرف ایک ہی لڑکی کا تذکرہ ہوتا تھا۔

''نازیہ شیرازی کا۔''

وہ کھانا پینا بھول جاتا تھا۔ مگر نازیہ شیرازی کو یاد کرنا نہیں بھولتا تھا۔

جبار جعفر اس لڑکی کی قسمت پر جتنا بھی رشک کرتا کم تھا کہ جو لڑکی پچھلے سات سالوں سے دھڑکن بن کر اس کے جگری یار سلمان علوی کے دل میں دھڑک رہی تھی۔

''او کے یار! تو اب آرام کر' شام میں ملتے ہیں دوبارہ۔''

کچھ ہی دیر بعد وہ اس کے پہلو سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جواب میں سلمان نے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اسے گلے لگایا تھا۔

جبار جعفر کے رخصت ہوتے ہی وہ پھر سے کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تھا۔

باہر برستی بارش کی شدت میں اب قدرے کمی آ گئی تھی۔ وہ ٹوٹ کر رونا چاہتا تھا' مگر آنکھیں جیسے خالی ہو کر رہ گئی تھیں۔

بیتے ہوئے لمحے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سوچ کا حصہ نہیں بن رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اُڑ کر پاکستان جائے اور اپنی محبت کو بانہوں میں سمیٹ کر ساری دنیا سے چھپا لے۔

باہر اب برف باری شروع ہو گئی تھی۔ تبھی وہ کھڑکی بند کر کے پھر سے اپنے بستر کی طرف آیا تھا۔ کہ ابھی اسے اپنا سامان پیک کر کے پاکستان واپسی کی تیاری بھی کرنی تھی۔

• • •

دشت ہجراں میں سایہ نہ صدا تیرے بعد
کتنے تنہا ہیں تیرے آبلہ پا تیرے بعد

تجھ سے بچھڑا تو مرجھا کے ہوا برد ہوا
کون دیتا مجھے کھلنے کی دعا تیرے بعد

ازہان یزدانی کے ایکسیڈنٹ کی خبر نے پوری حویلی میں ہلچل مچادی تھی۔

حائقہ بیگم اور دادی ماں کے ساتھ ساتھ کچھ دیگر رشتہ دار خواتین بھی بے حد مضطرب دکھائی د رہی تھیں۔

سبرینہ احسان کے آنسو تو جیسے رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

ابھی تو اس کی محبت نے پاؤں پاؤں چلنا بھی نہیں سیکھا تھا۔

ابھی تو وہ اسے تنہائی میں سوچتے ہوئے بھی گھبراتی تھی۔

ابھی تو اس کی رفاقت کے خواب ٹھیک سے بہار کی صورت اس کی آنکھوں میں اترے بھی نہ تھے۔ کہ جدائی کا خوف سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

وہ زاروقطار رو رہی تھی اور خدا سے اس شخص کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی کہ جو اسے نظر بھر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ پورا دن بسر ہوا تھا۔ شب کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔ جب برات جانے والوں کی واپسی ہوئی تھی۔ حادثہ چونکہ واپس لوٹتے ہوئے ہی ہوا تھا۔ لہٰذا احمران کی دلہن بھی ا سب کے ہمراہ تھی۔

ازہان کو وہ لوگ پہلے ہی ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروا چکے تھے۔ لہٰذا احمران وغیرہ ساتھ نہیں آ تھے۔

ہر طرف ایک عجیب سی ہڑبونگ مچ گئی تھی۔

سب کا دھیان ازہان کی طرف ہونے کی وجہ سے دلہن کو بھی وہ رسپانس نہیں مل رہا تھا۔ جو کہ اس حق تھا۔

وسیع ہال میں سب لوگوں کے بیچ بیٹھی ذرنشاء آفندی خاصی تفصیل کے ساتھ ازہان کے ایکسیڈن کی روداد سنا رہی تھی اور باقی سب لوگ محویت سے اسے پٹر پٹر بولتے ہوئے سن رہے تھے۔ جو بنا ک ملال کے بڑی سہولت سے حائقہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"غلطی ازہان کی ہی تھی آنٹی! وہ اتنی تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ سب نے کتنا کہا اس سے کہ اتنی جلدی کرے۔ مگر اسے پہلے کبھی کسی کی سمجھ آئی ہے جو اب آئے گی۔"

سبرینہ حیران تھی کہ اس کے لہجے میں کسی قسم کی کوئی فکر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ الٹا وہ اسے مورد الزا ٹھہرا کر اپنی بیزاری کا اظہار کر رہی تھی۔

سبرینہ کو بہت کوشش کے باوجود بھی ازہان اور اس کے رشتے کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

گھر والوں کے ساتھ ساتھ اس کی منکوحہ بھی اس سے خوش نہیں تھی اور کیوں خوش نہیں تھی۔ یہ ابھی انے سے قاصر تھی۔ لہٰذا چپ چاپ وہاں بیٹھی دل ہی دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی

"ایکسیڈنٹ ہوا کیسے تھا ذرنشاء! میرا مطلب ہے تم سب لوگ تو ساتھ ہی تھے۔ پھر اسے ہی اکیلے وٹ کیسے لگ گئی؟"

حائقہ بیگم نے الجھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔ جب وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کھلے ہوئے سلکی لرون کے پیچھے دھکیلتے ہوئے بولی۔

"وہ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں تھا آنٹی! ہم سے پہلے ہی وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ ہماری گاڑی پیچھے تھی اور وہ اپنی بائیک پر اکیلا تھا۔ تھوڑا ڈسٹرب بھی تھا۔ تبھی شاید سامنے سے آتی ہوئی گاڑی پر یں دے پایا تھا اور پھر ایک دم سے وہ سب ہو گیا۔ جس کی ہمیں پہلے ہی توقع تھی۔"

ذرنشاء مزید بھی کچھ بتا رہی تھی۔ ساتھ میں سارہ بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ تاہم وہ ان کے یان سے اٹھ آئی تھی۔

اسے ازہان کے لئے ان سب کا اجنبی انداز شدید تکلیف سے ہمکنار کر رہا تھا۔ لہٰذا کمرے میں آ پھر سے وضو کرنے کے بعد جائے نماز پر بیٹھ گئی۔

وہ ایک شخص کہ جس کے لئے اس کے اپنوں کے دلوں میں بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اسی شخص کی محبت نڈھال وہ خدا کے حضور گڑگڑاتے ہوئے اس کی لمبی عمر اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

اسے اس کے برے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نہ ہی وہ اس الجھن میں پڑنا چاہتی تھی کہ کے اپنے ہی اس سے اس درجہ متنفر کیوں ہیں؟

اس وقت وہ محض اپنے دل کی صدا سن رہی تھی۔ جو ازہان یزدانی کی تکلیف پر درد سے چور تھا۔ اس سلامتی اور صحت مندی کے لئے دعا گو تھا اور شاید یہ اس کی دعاؤں کا نتیجہ ہی تھا کہ خالق کائنات نے پھر سے زندگی کی انمول نعمت لوٹا دی تھی۔

وہ موت سے ہاتھ چھڑا کر زندگی کی طرف واپس لوٹ آیا تھا۔ مگر ایکسیڈنٹ میں اس کی ٹانگیں ید متاثر ہوئی تھیں۔

ڈاکٹرز کے مطابق اسے اپنی ٹانگوں پر چلنے کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار تھا۔

ٹانگوں کے ساتھ ساتھ اس کی بیک بون بھی قدرے متاثر ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے فی الحال وہ خود اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

ڈاکٹرز نے اسے بہت حوصلہ دیا تھا۔ مگر اس کے احساسات منجمد تھے۔ یوں جیسے یہ حادثہ اس کے تھ نہیں کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہو۔

پورا ایک ہفتہ ہوسپٹل میں ایڈمٹ رہنے کے بعد وہ گھر شفٹ ہوا تھا۔

اس کی جو حالت تھی اسے دیکھ کر دادی ماں کے ساتھ ساتھ حائقہ بیگم' سارہ' حمدان کی بیوی نا سبرینہ سب کے دل جکڑے گئے تھے۔

اسپیشلی سبرینہ کے آنسو تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے کیونکہ وہ اس سے پہلے اسے د ہوسپٹل نہیں گئی تھی۔

بس حمدان' حائقہ بیگم' سارہ یا ذرنشاء کی معرفت ہی اس کا حال دریافت کرتی رہتی تھی اب ج آنکھوں سے اس کے زخم دیکھے تو وہ خود پر کنٹرول نہیں رکھ پائی تھی۔

ذرنشاء جو ازہان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اسے بے ساختہ روتے دیکھ کر نخوت سے کہے بنا نہیں سکی تھی۔

''اب یہ آنسو بہانے بند کر دیجئے محترمہ! کچھ نہیں ہوا ازہان کو۔ بفضل خدا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمہارا درد عجیب ہی ہے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔''

اسے ذرنشاء کے الفاظ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ تاہم ازہان نے ضرور چونک کر ایک بے سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

جو سوں سوں کرتی اس کے پاس ہی کھڑی اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔

ایک مدت کے بعد اس نے کسی کو اپنے لئے یوں روتے دیکھا تھا۔ لہٰذا کرب سے سرد آہ بھر ہوئے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر چپ چاپ پلکیں موند گیا۔

''او کے' ازہان! میں اب چلتی ہوں۔ صبح آؤں گی نہ بھی آسکوں تو پرواہ مت کرنا۔ کیونکہ یہاں سے بڑھ کر تمہارے تیماردار موجود ہیں۔''

سبرینہ کو اس سے الجھنا کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ وگرنہ اس سے پوچھتی ضرور کہ وہ کیوں اس کے لئے اپنے دل میں اس قدر عناد رکھے ہوئے ہے۔

ازہان نے اس کے رخصت ہونے پر بھی اپنی آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

تبھی وہ متفکر سی لب کچلتے ہوئے اس کے قریب آبیٹھی تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے ازہان!''

پورے ایک ہفتے بعد وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ فقط چھ سات دنوں میں ہی کتنا کمزور ہو کر رہ گیا تھا خوبصورت چہرے پر زردی بکھر گئی تھی۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس لمحے سبرینہ سے اپنے آنسو روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہونا ہے؟''

''جو کچھ ہو گیا ہے۔ کیا وہ کم ہے آپ کے لئے؟''

آزردگی کے ساتھ وہ پھر بولی تھی۔ جب ازہان آنکھیں کھول کر قدرے بیزاری سے اس کی طرف ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے' تم جاؤ یہاں سے۔''

''کچھ کیسے نہیں ہوا' سارا جسم تو زخموں سے چور ہو گیا ہے۔''

''پھر...... تمہیں کوئی تکلیف ہے؟''

اب کے وہ بری طرح چڑا تھا' تبھی چیختے ہوئے بولا تو سبرینہ بے ساختہ سر جھکا گئی۔

پھر ازہان سکون سے پلکیں موند کر کمبل میں منہ چھپا گیا تو مجبوراً اسے بھی اپنے کمرے میں واپس آنا

♦ ♦ ♦

اوچیاں لمبیاں لال کھجوراں تے اُتے پتر جناں دے ساوے
جس دم نال پیار ہے ساڈا' اُسا کوں او دم نظر نہ آوے
گلیاں سونجیاں اجاڑ ڈسن تے میکو وہڑا کھاون آوے
غلام فرید اوتھے کی وسنا' جتھے یار نظر نہ آوے

''ایک سوال پوچھوں مس نازیہ! آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟''

وہ پارک میں سنگی بینچ پر بیٹھی' بے فکری سے کھیلتے ہوئے معصوم بچوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب ادھر اُدھر کے دوران سنوان ہمدانی نے اس سے کہا۔ جواب میں وہ قدرے چونک کر اس کی طرف ئی تھی۔

''پوچھئے...... کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ؟''

اس کے سادگی سے کہنے پر' سنوان ہمدانی نے کچھ لمحے خاموشی کی نذر کئے تھے۔

پھر ایک گہری سانس خنک ہوا کے سپرد کرتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟''

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ لمحے میں نازیہ شیرازی کے چہرے کا رنگ بدل کر رہ گیا تھا۔

ازحد مضطرب ہو کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''پلیز بیٹھئے مس نازیہ! میرا مقصد آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں تھا۔''

وہ خود بھی قدرے الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

''مجھے آپ کے پرسنلز میں انٹرفیر کرنے کا کوئی حق نہیں' لیکن پھر بھی ایک اچھے دوست کی حیثیت اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ انتظار ہمیشہ ان لوگوں کا کیا جاتا ہے جن کے واپس لوٹنے کی کوئی امید جنہیں لوٹ کر آنا نہیں ہوتا۔ ان کے لئے آنکھیں نہیں تھکایا کرتے۔''

وہ کہہ رہا تھا اور نازیہ شیرازی کے پورے وجود پر جیسے لرزا سا طاری ہوگیا تھا۔

"کیوں نہیں بھلا دیتی آپ اسے جو آپ کو یاد نہیں کرتا۔ اسے تو شاید یہ یاد رکھنے کی فرصت بھی نہ ہوگی کہ وہ کبھی آپ کی زندگی میں آیا بھی تھا۔ یہاں سب یہی کرتے ہیں مس نازیہ! بغیر اجازت کے ہ ہماری زندگیوں میں آتے ہیں' ہمارے دل کو اپنے بس میں لے کر ہماری دھڑکنوں کو اپنی آہٹوں پر دھ سکھاتے ہیں اور جب ہم ان کے ساتھ کے عادی ہو جاتے ہیں تو وہ ہمارے دل کا سارا نظام الٹ پ کر کے روح میں طوفان اٹھا کر یہ سوچے بغیر ہماری زندگی سے دور چلے جاتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر ج گے کیسے؟ آنکھوں کو آنسو بہانے سے باز کیسے رکھیں گے؟ کیسے سمجھائیں گے دل کو کہ وہ زخمی ہونا چ دے' بیتے لمحوں کی رفاقتوں کو بھلا دے؟ بہت مشکل ہوتا ہے مس نازیہ! خود کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔"

سنوان ہمدانی کا لہجہ قدرے پست تھا۔ تبھی اس نے اپنے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے کہا تھا۔

"جب آپ اس بات کی حقیقت کو سمجھتے اور جانتے ہیں تو پھر مجھ سے ریکویسٹ کیوں کر ر ہیں؟"

"کیوں کہ اسی میں آپ کی بھلائی ہے مس نازیہ!"

پلٹ کر جواب دیتے ہوئے اس نے پھر سے نازیہ شیرازی کی طرف نگاہ کی تھی۔

"مرد کے لئے جو لوگ قدرے آسان ہوتا ہے' مگر ایک عورت کے لئے بہت مشکل ہے یہ کرنا۔ ہمارا معاشرہ کسی بھی عورت کو ایسا کوئی حق نہیں دیتا کہ وہ خالص اپنی مرضی اور رضا کے لئے کوئی قدم اٹھائے جو اسے دوسرے لوگوں کی نگاہ میں مشکوک کرتا ہو' آپ خود سمجھدار ہیں۔ ذرا سوچئے مس ناز لوگ آپ کو اس درجہ ملول اور تنہا دیکھ کر کیا کیا نہ سوچتے ہوں گے۔ لوگوں کو چھوڑیئے اپنے گھر والوں لئے ہی سوچ لیجئے۔ کیا ان کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ آپ کو خوش اور آباد دیکھیں' اپنے گھر میں بستا دیکھ آپ انہیں کس بات کی سزا دے رہی ہیں آپ کیا سمجھتی ہیں انہیں آپ کی اس تنہائی اور اداسی سے کوئی فر نہیں پڑتا؟ نہیں مس نازیہ! انہیں فرق پڑتا ہے۔ میں کہنا نہیں چاہتا مگر حقیقت یہی ہے کہ آپ خودغر ہیں جب کہ محبت میں ایک خودغرضی ہی تو نہیں ہوتی۔"

اس کی نگاہوں میں دھول اڑ رہی تھی جب کہ نازیہ شیرازی کے اندر چھپا درد پانی بن کر اس آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔

"پتہ ہے مس نازیہ! رابعیہ مجھے اور سلمان کو کیوں چھوڑ گئی تھی؟"

بالکل اچانک اس نے گفتگو کا ٹریک بدلا تھا۔

جواب میں ان ساعتوں کے ساتھ نازیہ شیرازی نے خاموشی سے اس کی طرف نگاہ کی تھی جیسے پو رہی ہو کیوں؟

تبھی وہ ایک مرتبہ پھر گہری سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا تھا۔

"یہ جو محبت ہوتی ہے ناں مس نازیہ! بڑی عجیب چیز ہے۔ اگر درست انسان سے ہو تو زندگی سنور ہے۔ لیکن اگر یہی محبت کسی رانگ پرسن کے ساتھ ہو جائے تو پھر وہاں لے جا کر مارتی ہے جہاں پینے ں کا ایک گھونٹ بھی نہیں ملتا۔" دونوں کے بیچ کچھ لمحوں کے لئے پھر خاموشی در آئی تھی۔

یوں لگتا تھا جیسے دونوں ہی اندر سے تھک گئے ہوں' تاہم سنوان ہمدانی نے فوراً ہی خود کو سنبھالتے کہنا شروع کیا تھا۔

"اسے بھی مجھ سے محبت تھی' بے تحاشا محبت' اتنی شدید محبت کہ بعض اوقات اسے میرے بغیر سانس ں محال لگتا تھا۔ وہ خود مجھ سے کہتی تھی کہ اس کے لئے کائنات کا حسن میرا وجود ہے لیکن...... وہ جھوٹ ھی مس نازیہ! اس کی محبت کھوکھلی تھی۔ اسے تب تک مجھ سے پیار تھا جب تک میں اسے پھولوں کی رکھتا رہا۔ زندگی کی ہر آسائش مہیا کرتا رہا۔ پھر جونہی میں قدرت کی طرف سے مصائب کے گھیرے یا۔ وہ بدل گئی۔ زندگی کی بہاروں میں خوشی خوشی میرے سنگ سانس لینے والی میری محبت' خزاں رت کو تھوڑے دن بھی برداشت نہ کر پائی اور اپنا ہاتھ چھڑا کر مجھ سے دور چلی گئی۔"

صرف ایک لمحے کے لئے اس نے پھر خاموشی اختیار کی تھی۔

"بہت مان تھا مجھے اس کی محبت پر' لیکن اس نے میری محبت کے تاج محل کو اپنے لالچ سے زمین کر دیا۔ وہ دن جو قدرت کی طرف سے مجھ پر آزمائش کے دن تھے۔ جب مجھے اس کے ساتھ اور ے کی بہت اشد ضرورت تھی۔ تبھی وہ میرا ساتھ چھوڑ کر میری زندگی ویران کر گئی۔ اور زبردستی مجھ سے ورس لے کر اپنے امیر کبیر ماں باپ کے پاس دوبارہ لوٹ گئی۔ اس نے یہ بھی سوچا ہی نہیں کہ میں اور ان اس کے بغیر کیسے رہیں گے؟"

اس کی خوبصورت آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ لہجہ دکھ سے بھر آیا تھا۔

نازیہ شیرازی کو اس لمحے اپنا اور اس کا درد ایک جیسا محسوس ہو رہا تھا۔

"دیکھئے ناں مس نازیہ! آزمائش کے وہ دن تو گزر گئے۔ آج پھر میں دولت میں کھیل رہا ہوں ن...... میرا دل خالی ہو گیا ہے۔ کاغذی محبت کی دربدری دل اجاڑ گئی ہے۔ لیکن...... پھر بھی میں آپ کی ح شکستہ نہیں ہوں۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں یہ آنسو ان لوگوں کے لئے کبھی نہیں بہانے چاہئے جو رے آنسوؤں کے قابل نہ ہوں' کیونکہ جو لوگ ہمارے آنسوؤں کے قابل ہوتے ہیں وہ ہمیں کبھی نے نہیں دیتے۔"

اس کا ایک ایک لفظ نازیہ شیرازی کے اندر طوفان اٹھا رہا تھا۔

وہ خود میں کچھ بھی بولنے کی سکت نہیں پا رہی تھی۔

سنوان ہمدانی سے ہمدردی جتانے کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا اس میں تبھی خاموش بیٹھی رہی تھی۔

"آپ سوچ رہی ہوں گی کہ میں یہ سب آپ سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ بائے گاڈ مس نازیہ! مجھے

آپ سے کوئی غرض نہیں، میں تو آپ کو محبت کی تھیوری سمجھانا چاہتا ہوں' کیونکہ یہ محبت زندگی میں بہت روپ بھر کر میرے سامنے آئی ہے۔ سلمان کی طرح میں بھی چھوٹا سا تھا جب میرے بابا نے میری ماں کی وفاؤں اور خدمت گزاری کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کسی اور عورت کے ساتھ دوسری شادی کر لی۔ بلیوی مس نازیہ شیرازی! میری ماں جی ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل خاتون تھیں مگر اس کے باوجود بابا نے انہیں درد کی دلدل میں دھکیلا اور ان پر اس عورت کو فوقیت دی جو صورت وسیرت دونوں لحاظ سے ہی ان سے بہت پیچھے تھی۔ جاننا چاہیں گی کیوں؟ کیونکہ اس عورت سے انہیں محبت تھی' درست یا غلط' یہ جاننے کی انہوں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی' بڑی آسانی سے وہ مجھے اور ماں جی کو نظر انداز کر کے اس دوسری عورت کے ناز اٹھاتے تھے۔ اس کی بے نیازیوں کے باوجود ہاتھ باندھے کھڑے اس کے ایک اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ماں جی نے کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں آنے دیا۔ اس کی وجہ بھی محبت ہی تھی مس نازیہ! وہ محبت جو ماں جی کو بابا سے تھی۔ وگرنہ وہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ سکتی تھیں' ان کے پاس بھی دھن دولت کی کمی نہیں تھی۔ مگر میری ماں نے زندگی کی آخری سانس تک محبت کو نبھایا تھا۔ اور یہ ثابت کیا تھا کہ محبت ہمیشہ بےلوث ہوتی ہے۔ یہ کبھی صلے کی ڈیمانڈ نہیں کرتی۔"

اس کا اضطراب قدرے کم ہوا تھا۔ عین اسی لمحے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلتا سلمان بھاگتے ہوئے ان کے قریب چلا آیا۔

"مما! مجھے آئس کریم کھانی ہے چلیں۔"

کتنا خوش تھا وہ بچہ اس کی محبت پا کر؟ کیا وہ اس بچے کی یہ خوشی چھیننے کا حوصلہ کر پائے گی؟ صرف ایک لمحے کے لئے اس نے خود سے سوال کیا تھا جواب میں اس کے دل نے فوراً اس کی سوچ کی نفی کر دی تھی۔

"نہیں مانی! سردی بڑھ رہی ہے پھر بیمار پڑ جاؤ گے چلو بھاگو یہاں سے۔"

اس کی بجائے سنوان ہمدانی نے قدرے رعب سے کہتے ہوئے اسے ڈانٹا تو وہ منہ بسور کر رہ گیا۔

نازیہ شیرازی اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے فوراً ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

"نہیں مس نازیہ! میں جانتا ہوں کہ میرے بچے کے لئے کیا چیز کتنی ضروری ہے؟ میں اسے کمزور بنانا نہیں چاہتا۔ بہت جلد میں اسے سمجھاؤں گا کہ آپ اس کی مما نہیں ہیں بلکہ سمجھانے کی تو شاید ضرورت ہی نہیں پیش آئے کیونکہ اگلے ہی ہفتے میں ہمیشہ کے لئے دوبئی شفٹ ہو رہا ہوں۔"

وہ آج اسے شاک پہ شاک دے رہا تھا۔

اس لمحے نازیہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس قسم کے احساسات کا اظہار کرے۔ کیا ایک مرتبہ پھر "سلمان" کی جدائی اس سے برداشت ہو پائے گی؟

وہ اجڑا ہوا دل جو اس ننھے فرشتے کی معصوم باتوں سے بہلنا سیکھ گیا تھا کیا پھر سے اس دل کا ویران رہنا سہہ پائے گی وہ؟ شاید نہیں......

"ایم سوری! میں آپ کو ہرٹ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مگر یہ سب بہت ضروری ہے۔ وہ محبت' جو کبھی کسی منزل کی طرف نہ لے کر جاتی ہو اس محبت کے احساس کو خود سے مانوس نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر یہ احساس دل میں جڑیں پکڑ لے تو پھر دل سے دربدر ہوتے ہوئے بڑی توڑ پھوڑ مچاتا ہے۔ شگاف ڈال کر نکلتا ہے دل سے' بہرحال کافی ٹائم ہو گیا ہے میرے خیال سے اب ہمیں گھر واپس چلنا چاہئے۔"

اپنی بات مکمل کرتے ہوئے وہ سنگی بینچ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"سلمان! آؤ بیٹے گھر چلیں۔"

سلمان جو اس سے روٹھ کر دوبارہ اپنے دوستوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اب اس کی پکار پر پھر اس کے قریب چلا آیا۔

نازیہ شیرازی اس روز بہت شکستہ انداز میں خالی خالی دماغ کے ساتھ گھر واپس لوٹی تھی۔

♦ ♦ ♦

بارشوں کے موسم میں
تم کو یاد کرنے کی عادتیں پرانی ہیں
اب کی بار سوچا تھا عادتیں بدل دیں گے
پھر خیال آیا کہ
عادتیں بدلنے سے بارشیں نہیں رکتیں

"ثمرن یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟"

وہ اپنے کمرے میں مقید اپنی وارڈ روب درست کر رہی تھی جب احتشام خفا خفا سا چہرہ لئے اس کے پاس چلا آیا۔

"کیا سن لیا ہے آپ نے؟"

دونوں بازو سینے پر باندھ کر وہ نارمل انداز میں اس کی طرف پلٹی تھی۔ جب وہ دکھ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم اتنی ناسمجھ نہیں ہو جو گھر میں اٹھے طوفان کی وجہ تمہیں معلوم نہ ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو تم کہ ہم تمہیں شیراز سے منسوب کئے بیٹھے ہیں' پھر..... وہ تمہارا باس اسفند شیرازی کیوں پرپوز کیا ہے اس نے تمہیں؟"

"وہ مجھے پسند کرتے ہیں' میں خود بھی ان کا ہاتھ تھامنا چاہتی ہوں اس لئے۔"

احتشام کے سلگتے لہجے کے جواب میں اس کا انداز بہت پرسکون تھا۔تبھی وہ مزید چٹختے ہوئے بولا تھا۔

"کیوں...... ہم بھی یہی جاننا چاہتے ہیں کہ تم شہروز کا ہاتھ چھوڑ کر اس پرائے شخص کا گھر کیوں بسانا چاہتی ہو' جسے ہم ٹھیک سے جانتے بھی نہیں ہیں؛ جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ شہروز تمہیں کتنا چاہتا ہے۔ کل سے کمرے میں بند کیا ہوا ہے اس نے خود کو رات کا کھانا صبح کا ناشتہ کچھ نہیں کیا اس نے اور پھر تم بھی تو اسے چاہتی ہو' کیا تم اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ خوش رہ سکو گی؟"

"نہیں ثمرن' شہروز کے علاوہ تمہیں کوئی خوش نہیں رکھ سکتا۔"

بہت کوشش کے باوجود بھی وہ خود کو بلند آواز میں چلانے سے روک نہیں پایا تھا۔تبھی ایک پھیکی سی مسکان ثمرن ازہان کے خشک لبوں پر بکھری تھی۔

"تو آپ چاہتے ہیں میں اپنی نظر میں گر جاؤں محبت' جو نہایت مقدس اور ریا سے پاک جذبہ ہے اس پر سمجھوتہ کرلوں' ٹوٹ کر بکھر جاؤں اس شخص کے قدموں میں جس کے نزدیک میری خودداری میری نسوانیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔"

وہ دل کا یہ درد کسی پر عیاں کرنا نہیں چاہتی تھی۔مگر اب زبان کھولے بناء کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں بھیا' میری مما جنہیں برطانوی شہری ہونے کے باوجود میرے پاپا سے والہانہ پیار تھا۔وہ اسی پیار کی بھینٹ چڑھ گئیں' پاپا انہیں طعنہ دیتے کہ ان کی بولڈ محبت میں الجھ کر وہ اپنوں سے دور ہو گئے۔ ہمیشہ کہتے ہیں بے وقوف تھا جو اپنا دیس اپنے لوگ چھوڑ کر تمہاری فضول محبت میں الجھ کر یہاں پھنس گیا ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والے میرے ممی پاپا نے ہمیشہ دریا کے دو کناروں کی مانند زندگی بسر کی میں سب کچھ بھلا سکتی ہوں لیکن وہ لمحہ نہیں جب موت کی بانہوں میں جھولتی میری مما کے لبوں پر صرف پاپا کا نام تھا۔جن کے لئے انہوں نے اپنا گھر' اپنے والدین' اپنی دولت وجائیداد سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔زندگی میں پہلی بار اپنی اسی مما کی آنکھوں میں محبت کی دربدری کا دکھ دیکھا تھا میں نے جب زندگی موت کی دہلیز پر کھڑی ان سے دامن چھڑاتے ہوئے انہیں الوداع کہہ رہی تھی۔ تب پہلی بار میں نے ہمیشہ مسکرانے والی اپنی مما کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے ویرانی ہی ویرانی بکھری ہوئی دیکھائی دی تھی ان کی آنکھوں میں' زمین آسمان' سب ان کے حال پر افسردہ تھے۔ ہمیشہ کے لئے جدا ہوتے ہوئے ان کی آنکھوں میں گہرا سکوت تھا۔اپنوں سے جدائی کا درد تھا۔سب سے بڑھ کر پاپا کی بے وفائی کا دکھ تھا۔آنسوان کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ان کا دامن تر کر رہے تھے۔وقت رخصت وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہ سکی تھیں اور اس روز مجھے لگا تھا جیسے ان کے ساتھ ساتھ میں بھی مرگئی ہوں۔"

بولتے بولتے اس کا گلہ رندھ گیا تھا' ہاتھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

احتشام سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اسے یہ سب کیوں بتا رہی ہے؟

تبھی جینز کی پاکٹ میں ہاتھ پھنسائے' الجھی الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا جو اس وقت خود بھی از حد ڈسٹرب دیکھائی دے رہی تھی۔

"میں مرگئی تھی شامی بھیا! یہ شہروز کی محبت کا احساس تھا جو مجھے دوبارہ زندگی کی طرف کھینچ کر واپس لایا تھا۔ میں اس کی ہمراہی میں اپنے سارے دکھ دفن کر دینا چاہتی تھی۔اس کا ہاتھ تھام کر بیتے ہوئے وقت کے ہر زخمی لمحے کو بھلا دینا چاہتی تھی' لیکن...... لیکن اس نے بھی میری معصوم بے لوث محبت کو اپنی اناء کے قلعے میں بند کر دیا۔وہ چاہتا ہے میں جھولی پھیلا کر اس سے محبت کی بھیک مانگوں؟ آپ ہی بتائیے احتشام بھیا! کیا محبت کبھی بھیک میں ملتی ہے؟" ایک مرتبہ پھر اس کا لہجہ رندھ گیا تھا۔

بے دردی سے گالوں پر لڑھکتے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے اس لمحے وہ اسے بہت معصوم دیکھائی دے رہی تھی۔احتشام محض خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

"عورت کی تو پوری زندگی محبت ہوتی ہے بھیا۔صرف محبت کے لئے بڑے سے بڑا دکھ ہنس کر اٹھاتی ہے محبت کی سرخروئی کے لئے اپنا آپ مٹا ڈالتی ہے آپ ہی بتائیے بھیا کیا عورت کا اتنا حق بھی نہیں کہ اسے اپنا آپ مٹا کر بھی محبت کے دو بول صلے میں مل جائیں؟ جو سوال آپ مجھ سے کرنے آئے ہیں یہی سوال شہروز سے بھی تو کیا ہوتا' اگر وہ چاہتا تو کیا اس کے علاوہ میں کسی اور کا نصیب بننے کا سوچتی؟"

ثمرن ازہان کی آنکھیں اس لمحے سرخ ہو رہی تھیں۔

احتشام دیکھ سکتا تھا کہ اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہوا ہے' تبھی وہ انسانیت اور خودداری کے بہت بلند مقام پر کھڑی اس لڑکی کی طرف اشک بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے ساتھ لگا گیا۔

کہنے سننے کو جیسے اب کچھ باقی ہی نہیں رہا تھا۔

ابھی دو روز پہلے ہی اسفند شیرازی نے اس کی مکمل رضا کے بعد اپنی دادو کو باقاعدہ رشتے کی نیت سے ان لوگوں کے پاس بھیجا تھا۔دادو نے انہیں بتایا تھا کہ یہ رشتہ اسفند کے ساتھ ساتھ ثمرن کی خوشی کا باعث بھی ہے اور یہی بات "شاہ ولا" کے لوگوں کے لئے شدید اچنبھے کا باعث بنی تھی' کیونکہ وہ سب لوگ اپنے اپنے طور پر اسے شہروز سے منسوب کئے بیٹھے تھے۔

مجھ کو اس پہلی آواز سے ملا دو
جس نے مجھے تخلیق کیا ہے
پھر میں اس سے پوچھوں گا
تو نے مجھے ہونے نا ہونے کا
جو گہرا زخم دیا ہے
وہ خود میری خواہش تھی یا پھر تیری مجبوری تھی

اپنے اپنے طور پر سبھی نے اسے سمجھانے اور اس سے ایسا غیر متوقع قدم اٹھانے کی وجہ دریافت کی

تھی، مگر اس نے لبوں پر خاموشی کا قفل لگا لیا تھا۔ وہ کبھی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ اب اس کے لئے شہروز کا ہاتھ تھامنا ممکن کیوں نہیں رہا۔

لاکھ وہ ٹوٹی ہوئی تھی، مگر اپنی محبت پر کوئی بھی سمجھوتہ کرنا اسے گوارہ نہیں تھا' بقول شاعر۔

محل دو محل کی نعمت کو اضافی سمجھا
ہم نے احساس کی دولت کو ہی کافی سمجھا
اس نے شرطیں بڑی آسان رکھی تھی لیکن!
ہم نے سمجھوتہ محبت کے منافی سمجھا

اسفند شیرازی کے پرپوزل کو لے کر تمام گھر والوں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مگر اس نے کسی کے احساسات کی پروا نہیں کی اور بلا آخر وہی ہونا تھا جس کی ضد اس نے باندھ لی تھی۔

♦ ♦ ♦

پچھلے کچھ دنوں سے نازیہ شیرازی کی طبیعت بہت خراب تھی۔

بہت سوچا تھا اس نے اپنی محبت اور اپنے مستقبل کے بارے میں' سنوان ہمدانی کی باتیں رہ رہ کر اس کے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔

اس رات دیر تک جاگتے ہوئے وہ بہت روئی تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو خوبصورت آنکھوں میں سرخ ڈورے نمایاں تھے۔ صائمہ شیرازی کو اس کا چہرہ بہت ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

تھکے تھکے سے اعصاب کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے نکل کر سیدھی اپنی امی کی طرف آئی تھی جو نماز فجر کے بعد تسبیح کرنے میں مشغول تھیں۔

”امی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔“

بہت خاموشی سے چپ چاپ آکر وہ ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ جواب میں انہوں نے قدرے چونک کر حیرانگی سے اس کی طرف نگاہ کی تھی۔

”بولو بیٹے! میں سن رہی ہوں۔“

ایک کے بعد ایک تسبیح کے دانے گراتے ہوئے انہوں نے بہت نرمی سے اجازت دی تھی۔ جب وہ قدرے اضطراب سے انگلیاں چٹخاتے ہوئے اداس لہجے میں بولی۔

”وہ..... بات اصل میں یہ ہے کہ سنوان صاحب سلمان کو لے کر پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ میں..... میں سلمان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ پلیز سنوان صاحب سے کہیں کہ وہ سلمان کو میرے پاس چھوڑ جائیں' میں اس کا بہت خیال رکھوں گی۔“

اس کے الفاظ نے انہیں مزید حیران کر ڈالا تھا۔

چپ چاپ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ جیسے اس کی آنکھوں سے اس کے اندر کا حال جاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”نازو..... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں بیٹے؟“

”پتہ نہیں اماں!“

بھرائے لہجے میں کہتے ہوئے وہ سسک پڑی تھی' پھر اپنا سر ان کی گود میں رکھتے ہوئے ملول لہجے میں بولی۔

”میں بہت تھک گئی ہوں اماں' بہت انتظار کر چکی ہوں میں اس کا' اب اور آپ لوگوں کو اذیت نہیں دینا چاہتی میں' کہہ دیں سنوان ہمدانی سے میں سلمان کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔“

اپنی زبان سے نکلے ان الفاظ سے وہ کتنی ہرٹ ہوئی تھی' یہ صرف اس کا دل جانتا تھا۔ عائشہ بیگم اس کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔ تبھی بہت پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسرور لہجے میں بولی تھیں۔

”خدا تمہیں ہمیشہ بہت خوش رکھے میری بیٹی! ابھی سنوان نے چند دن پہلے ہی مجھ سے اس موضوع پر بات کی تھی۔ وہ دل سے تجھے اپنانا چاہتا ہے بیٹے! سب کچھ جانتا ہے تیرے بارے میں' پھر بھی شادی کرنا چاہتا ہے تجھ سے' کیونکہ تجھ سے بہتر اس کے بچے کو ماں کا پیار اور کوئی نہیں دے سکتا۔ بہت اچھا ہے پہ مگر میں تجھ سے بات کرتے ہوئے ڈرتی تھی' پھر سے تو خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھے' اسی لئے تجھ سے کچھ نہیں کہا اور اسے صاف انکار کر دیا۔ اب خدا نے تمہارے دل میں ہدایت ڈالی ہے۔ یقیناً وہی تجھے تیرے نصیب کی خوشیاں دینے والا ہے۔ میں کرتی ہوں سنوان سے بات۔ تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گی نازی۔“

کس قدر حلاوت سے وہ اسے تسلی دے رہی تھیں۔

نازیہ شیرازی کا دل اس لمحے جیسے کٹ رہا تھا۔

خود اپنے ہی آنسوؤں کے لاوے کو ضبط کر کے اپنا درد دبانا اس کے لئے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تبھی وہ اپنا بھیگا چہرہ ان کی گود سے اٹھا کر اپنے آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے بولی تھی۔

”مجھے دنیا میں صرف ایک ہی شخص خوش رکھ سکتا تھا ماں اور..... اسی کا ساتھ خدا نے میرے نصیب میں نہیں لکھا۔ ہوا کے جھونکے کی مانند وہ آیا اور چلا گیا۔ میں اس کے سوا اور کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی ماں' کبھی نہیں رہ سکتی' ہاں کسی دوسرے کو ضرور خوشی دے سکتی ہوں۔“

اس کا گلا رندھ رہا تھا۔

عائشہ بیگم کی آنکھیں اس لمحے اس کے درد سے بھر آئی تھیں۔

تاہم اس سے پہلے کہ وہ اس سے کچھ کہتی' سلمان تیزی سے داخلی دروازہ دھکیل کر اس کی طرف دوڑ

آیا۔ سلمان کے پیچھے ہی سنوان ہمدانی نے بھی قدم گھر کی دہلیز پر دھرے تھے۔

''مما! کل میرا برتھ ڈے ہے میں نئے اپنے فرینڈز کو انوائیٹ کرنا ہے' پلیز آپ میرے ساتھ چلیں ناں۔''

اس کے قریب پہنچ کر اپنے ہاتھوں میں اس کے ہاتھ لیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ جواب میں نازیہ شیرازی نے فوراً اپنی بھیگی پلکیں رگڑ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''چلیں گے بیٹے! ضرور چلیں گے۔''

''مما! آپ رو کیوں رہی ہیں؟''

اب اس کی توجہ اس کی بھیگی پلکوں کی جانب مبذول ہوئی تھی۔

سنوان ہمدانی نے بھی عائشہ بیگم کے پہلو میں قدرے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے اس کی طرف بغور دیکھا تھا۔

نازیہ شیرازی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس چھوٹے سے بچے کو اپنے رونے کی کیا وجہ بتائے' تبھی ایک پھیکی سی مسکان لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''مما کی آئیز میں درد ہو رہا تھا بیٹے! اسی لئے رو رہی تھی۔''

فوری طور پر یہی بہانہ اس کی سمجھ میں آیا تھا اور اس نے بنا لیا تھا۔

''چلو آؤ کمرے میں چل کر تیار ہوتے ہیں اور سنوان صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

اٹھتے اٹھتے اس نے سنوان ہمدانی سے بھی دعا سلام کر لی تھی۔

''جی بالکل! اللہ کا بہت کرم ہے۔''

اس کا موڈ اس لمحے بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

نازیہ شیرازی اس سے مزید کوئی بات کئے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ تبھی عائشہ بیگم نے اس سے اپنا مدعا بیان کرنا شروع کیا تھا۔

♦♦♦

سو رستے ہیں ملتے جلتے اِک مجبوری ٹھیک نہیں
جو کہنا ہے کھل کر کہہ دے بات اُدھوری ٹھیک نہیں
کوئی حیلہ' کوئی بہانہ' کوئی مناسب راہ نکال
مجھ سے ایسے ملتے رہنا غیر ضروری ٹھیک نہیں
ہم محفل میں آئے تو وہ پیچھے جا کر بیٹھ گئے
ہم سے ایسے ملتے رہنا' غیر ضروری ٹھیک نہیں

عمر سنعیہ سے شدید ناراض تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے اُس نے نہ تو اُسے کوئی کال کی تھی اور نہ ہی گھر ملنے آیا تھا۔

وہ شدید مضطرب تھی۔

سب سے چھپ چھپ کر کتنی ہی بار رو چکی تھی۔ بھری دُنیا میں وہ ایک شخص جو اُس سے سچی محبت کا طلبگار اور دعویٰ دار تھا' وہی شخص چھوٹی سی بات پر اِتنا بدل جائے گا اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اندھیروں بھری زندگی میں واحد چراغ کی مانند اُس شخص کو وہ کسی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی' تبھی اس روز ساری انا' غصہ سب بھلا کر اُس کے آفس چلی آئی تھی۔

بے حد بوجھل اعصاب اُسے شدید اذیت سے دوچار کر رہے تھے۔

پچھلے ایک ہفتے سے وہ پنکی کو بے حد خوش دیکھ رہی تھی۔ ہر روز وہ گھر سے غائب ہوتی تھی اور واپسی پر اپنی ماں سے صرف عمر کی باتیں ہی کیا کرتی تھی۔ سنعیہ کے لئے یہ سب بے حد تکلیف کا باعث بن رہا تھا۔

دِل میں مختلف خدشات سر اُٹھا رہے تھے۔

اِتنی آسانی سے اپنی محبت کسی اور کو سونپ دینے کا حوصلہ اُس میں نہیں تھا۔

ٹوٹ کر رونے کی خواہش میں ہر روز وہ جیسے بکھرتی چلی جا رہی تھی۔ پہلی بار جب وہ اُس کے آفس میں آئی تھی تو دِل خوش کن تصورات سے دھڑک رہا تھا' مگر اِس وقت اُس کی ذہنی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔

ٹوٹ کر چاہنے کا دعویٰ کرنے والے شخص نے پچھلے ایک ہفتے میں اُس کا حال پوچھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

اُس روز شدید ذہنی اذیت کے باوجود وہ بہت دیر تک ویٹنگ روم میں بیٹھ کر عمر کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی رہی تھی جو اُس کی آمد کی اطلاع پا کر بھی اُسے اپنے رُوم میں نہیں بلا رہا تھا۔

سیکرٹری نے اُسے پہلی فرصت میں سنعیہ کی آمد سے باخبر کر دیا تھا' مگر پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل کسی کے ساتھ رُوم میں مصروف تھا۔

تبھی وہ ویٹنگ رُوم سے باہر نکل کر اُس کے آفس سے باہر آئی تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے قریب ہی عمر اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے پنکی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

بس یہی ایک لمحہ تھا جب وہ بجھ کر راکھ ہوئی تھی۔

سارے مان' سارے خواب اسی ایک لمحے میں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔

عمر جو تیز تیز چلتا اُس کے قریب سے نکلا تھا' اُس کی نظر سنعیہ کے دُھواں دُھواں چہرے پر پڑی تھی مگر وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتا پنکی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ شخص جس نے زندگی میں پہلی بار

اُسے جینا سکھایا تھا اِس لمحے جانے کیوں اُسی شخص کے ہاتھوں اُسے اپنی رُوح سُولی پر لٹکتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ جانے ایک دم سے کیا ہوا تھا کہ وہ گھر واپسی کا راستہ ہی بھول بیٹھی تھی۔ بھٹکتے قدم جانے کس منزل کی راہ کھوج رہے تھے کہ اچانک روڈ کراس کرتے ہوئے وہ ایک گاڑی سے ٹکرا گئی اور اگلے ہی لمحے اُس کے ہواس مکمل طور پر اندھیروں میں ڈوب گئے۔

موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی پھیلی دھوپ یکلخت بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے۔ ذہن و دل جیسے ایک دم سے سنسان ہو کر رہ گئے تھے۔ نظر کے سامنے بس ایک ہی منظر بار بار جھلملا رہا تھا۔ پنکی اور عمر لباس نقوی کے ملاپ کا منظر عمر کے بازو میں قید پنکی کا بازو اور عمر کی نگاہوں کی بیگانگی۔

گزرتے ہر لمحے کے ساتھ وہ جیسے مسمار ہوتی جا رہی تھی۔

اس لمحے اسے نہ تو کچھ دیکھائی دے رہا تھا نہ ہی وہ کچھ سن پا رہی تھی۔

ہوش و ہواس اپنے اختیار میں ہی نہیں رہے تھے۔

مان ٹوٹ جانے کے صدمے نے اسے نڈھال کر چھوڑا تھا۔

پتہ نہیں وہ کب تک یونہی سن حواس کے ساتھ اجنبی راستوں پر آگے بڑھتی رہتی کہ اچانک سامنے سے آتی ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا کر قدرے فاصلے پر جا پڑی۔

صرف ایک لمحے میں اس کے احساسات اندھیرے میں ڈوبے تھے اور اس کے بعد وہ اپنے آپ سے غافل ہو کر ہوش ہواس سے بیگانی ہو گئی تھی۔

♦ ♦ ♦

گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
کن خوابوں کو، کن سوچوں کو، کن باتوں کو
کن لمحوں کو، کن باتوں کو
برف سا ٹھنڈا کر دیتی ہے
لمحوں کو قید میں کر دیتی ہے
جب میری لہر تھکتی سوچ
تیرے خیال کے شانے پر سر دھر دیتی ہے
تو گرم لحاف کے اندر آتی سرد ہوا
سب کچھ برف سا کر دیتی ہے

کمرے میں مکمل اندھیرا کئے وہ جلتی ہوئی کینڈل کے موم ہو ہو کر پگھلنے کا نظارہ کر رہی تھی، یوں ے اُس کینڈل کے ساتھ ہی اُس کا اپنا وجود بھی ختم ہوتا جا رہا ہو۔ گھر والوں کے ساتھ سنوان ہمدانی کو بھی ماں کے فیصلے سے خوشی ہوئی تھی۔ مگر نازیہ شیرازی کے اندر تک جیسے سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اُس

وقت وہاں کمرے کی تاریکی میں وہ جلتی ہوئی کینڈل کو نہیں بلکہ اپنے دِل کو دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے گرم آنسوؤں کا کرب اُسے شمع کے قطروں سے مشابہہ دکھائی دے رہا تھا۔ آج اسے یقین آ گیا تھا کہ اُس کی محبت مرچکی ہے اب وہ شخص جس کی طلب زندگی کا مقصد بن کر روح میں سرایت کرگئی تھی۔ اُس کے لوٹ آنے کی ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔

وہ رو رہی تھی اور اُسے یاد آرہا تھا کہ سلمان علوی سے اُس کا پہلا ٹکراؤ کہاں ہوا تھا۔ پہلے ٹکراؤ میں اُس نے کتنی بدتمیزی سے اُسے کھری کھری سنائی تھیں' پھر دوسری بار جب اُس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ تو کیسے معجزاتی طور پر سلمان علوی نے اُس کی ہیلپ کی تھی کتنا پریشان ہو رہا تھا وہ اُس کیلئے۔

دوسری ملاقات کا مختصر احوال اُس نے اپنے گھر والوں کو بھی سنا دیا تھا۔ پھر جس روز وہ ہوسٹل سے ڈسچارج ہو رہی تھی' اُس روز سلمان علوی خود بھی اُس کے گھر والوں سے ملا تھا۔ گفتگو اور رہن سہن سے وہ بے حد سادہ انسان ظاہر ہوتا تھا۔ اور اس کی یہ سادگی ہی نازیہ کے دِل میں گھر کرگئی تھی۔

بہت دِنوں تک اُس سے دوبارہ نہ ملنے کے باوجود وہ اُسے فراموش نہیں کر پائی تھی۔ رات میں تمام جھمیلوں سے فارغ ہو کر بستر پر لیٹتی تو بے ساختہ سلمان علوی کی یاد اُس کے دِل میں چٹکی کاٹتی تھی۔

اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ کچھ روز قبل ہی تعلیم سے فراغت کے بعد اُس نے ایک ماہانہ پرچے میں ملازمت اختیار کی تھی۔ دفتر سے واپسی پر اکثر تھکن کے باعث وہ راستے میں پڑنے والے پارک میں چلی جاتی تھی اور اس روز بھی وہ آفس سے پارک کی طرف جا رہی تھی۔ جب اچانک روڈ سے گزرتے ہوئے کسی نے اُسے پکار لیا۔

''ایکسکیوزمی۔''

صدا غیر مانوس نہیں تھی لہٰذا اُس نے فوراً پلٹ کر پیچھے دیکھا تھا۔ جہاں اُس نے کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر بلو جینز اور لائیٹ گرے ٹی شرٹ میں ملبوس سلمان علوی کھڑا پُر شوق نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس لمحے نازیہ شیرازی کے دِل میں دھڑکنیں بہت تیزی سے مشتہر ہوئی تھیں۔ اس کے پُر تھکن چہرے پر یکدم خوبصورت رنگ بکھر گئے تھے۔ شاید ان رنگوں کا بھید سلمان علوی بھی پا گیا تھا۔ تبھی وہ حوصلہ پا کر مسکراتے ہوئے اُس کے قریب آیا تھا۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

اُس کے قریب پہنچ کر اُس نے پوچھا تھا۔ جب وہ سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہوں' آپ یہاں کیسے؟''

''میں روز یہیں ہوتا ہوں۔ آئی مین جس روڈ سے آپ روز گزر کر اس پارک تک آتی ہیں اُسی روڈ پر میرا گھر ہے۔ آپ سے پہلے ٹکراؤ بھی کئی بار میں نے اسی روڈ سے آپ کو کالج جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید آپ نے نہ دیکھا ہو۔ میں اکثر اپنے گھر سے باہر کھڑا ہوتا ہوں۔''

وہ اُسے نہایت دوستانہ انداز میں بتا رہا تھا اور نازیہ حیران ہو رہی تھی کہ اب تک اُس کی موجودگی

بے خبر کیسے رہی؟

''آپ سے ایک سوال کروں' مائینڈ تو نہیں کرینگی؟''

چھوٹے چھوٹے قدم اُس کے ساتھ ہی اُٹھاتے ہوئے اُس نے پھر پوچھا تھا۔ جب وہ اعتماد سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''جی پوچھئے؟''

''مجھ سے دوستی کرینگی؟''

اپنا مدعا بیان کرنے میں اُس نے ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ تبھی وہ بولی تھی۔

''میں لڑکوں سے دوستی نہیں کیا کرتی۔''

''اچھی بات ہے ناں یار' تمہیں لڑکوں سے دوستی کرنے کے لئے کہہ بھی کون رہا ہے؟''

وہ یوں ہو رہا تھا جیسے اُس سے نجانے کتنی پرانی شناسائی ہو۔

''بی ہیوو مس نازیہ' میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ جیسے آپ کہیں گی ویسے ہی کروں گا۔ مجھ سے دوستی آپ کے لئے ہرگز شرمندگی کا باعث نہیں بنے گی۔''

اُس لمحے اُس کا اقرار نازیہ شیرازی کو بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ شاید تبھی وہ خاموش رہی تھی۔

''پلیز مان جائیں ناں۔ نہیں تو میں اسی روڈ پر کسی گاڑی کے نیچے آ کر اپنی جان دے دُوں گا۔''

بچوں کی طرح ضد کرتا وہ اُس کے دل میں اتر رہا تھا۔

''اوکے' ہو گئی فرینڈ شپ' خوش؟''

وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ تبھی وہ خوشی سے مچلا تھا۔

''تھینک یو' تھینک یو سو مچ' آپ واقعی بہت اچھی ہیں میری سوچ' میرے خیالات سے بھی زیادہ ہی ہے۔''

اس وقت اُس کے چہرے پر اتنے خوبصورت رنگ بکھرے تھے کہ نازیہ شیرازی زیادہ دیر تک اس کے چہرے پر نگاہ نہیں جما سکتی تھی۔

''نازی' روز اِسی ٹائم اِسی پارک میں ملا کرو گی ناں؟''

اُوکے کچھ ہی لمحوں میں وہ اُس سے پوچھ رہا تھا اور نازیہ شیرازی کا سر فوراً بے پیشتر اقرار میں ہل گیا۔ اُس روز گھر آ کر اس نے پھر صائمہ سے اُس کی ڈھیروں باتیں کی تھیں۔

آگے آنے والے دِنوں میں وہ مزید ایک دوسرے کے قریب آتے گئے تھے۔ نازیہ نے اُس سے اُس کی فیملی کے متعلق پوچھا تو وہ سنگی بینچ سے سر ٹکا کر قدرے سنجیدگی سے بولا تھا۔

''فیملی کے بارے میں کیا بتاؤں یار' بتانے لائق کچھ رہا ہی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

وہ حیران ہوئی تھی‘ جب وہ بولا۔

”کچھ نہیں‘ مما میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئی تھیں‘ بابا بھی اُن کی رحلت کے کچھ ماہ کے بعد وفا پا گئے۔ مجھ سے بڑے دو بھائی ہیں‘ ایک ملک سے باہر شفٹ ہے‘ دوسرا میرے ساتھ رہتا ہے‘ ایک ط سے میری پرورش اُسی کے ہاتھوں ہوئی ہے‘ شادی شدہ ہے‘ تین بچے بھی ہیں اُس کے‘ بیوی ہٹلر قسم کی ہے اُس کی‘ بہت ظلم کئے ہیں اُس نے مجھ پر‘ بابا کے ساتھ بھی اُس کا رویہ اچھا نہیں تھا‘ پہروں اُ بدتمیزی پر کڑھتے رہتے تھے‘ میں اُن کی حمایت میں کچھ کہہ دیتا‘ تو بھیا کے آنے سے پہلے ہی گھر میں طوفا کھڑا کر دیتی تھی اب بھی اُس کا بس نہیں چلتا‘ ورنہ ایک لمحے میں میرے قُل پڑھوا دے۔“

اپنی بات کے اختتام پر وہ دھیرے سے مسکرایا تھا‘ جب نازیہ دُکھ سے اُس کی طرف دیکھتے ہو بولی۔

”تم اُس کے ظلم کیوں سہتے ہو‘ ماشاءاللہ جوان جہان ہو۔“

”ہاں‘ تم نہیں سمجھو گی‘ عورت جب اپنے اوچھے پن پر آتی ہے تو اُس کے شر سے کوئی بچ نہیں سکـ بس سمجھ لو میں بھی اُس کے نشانے پر ہوں‘ اِسی لئے کبھی مفت کی روٹیاں توڑنے کا طعنہ دیتی ہیں تو کبھ آوارہ گردی کا۔“

اُس کے لہجے میں عجیب سی کسک تھی۔ نازیہ شیرازی کے دِل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔

”کیوں...... تم نے کیا بگاڑا ہے اُن کا؟“

”میں نے بہت کچھ بگاڑا ہے اُن کا‘ سب سے بڑا جرم تو یہی کیا ہے کہ اُن کی لاڈلی چھوٹی بہن کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا‘ محترمہ بہت پیار کا دعویٰ کرتی ہیں‘ مگر مجھے اچھی نہیں لگتی‘ بس اُسی روز سے بھابی نے نشانے پر رکھ لیا ہے‘ بھائی کو الگ میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہیں‘ کبھی بھوک لگی ہو تو کھانا ختم کر دیتی ہیں‘ کبھی ایمرجنسی میں کہیں جانا پڑ جائے تو کپڑے ہی دُھلے نہیں ملتے‘ میرا دِل نہیں لگتا نازی‘ دل چاہتا ہے اپنا آپ لے کر کہیں چلا جاؤں۔“

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سر کے بالوں میں پھنساتے ہوئے وہ بولا تو نازیہ اُس سے کہے بغیر نہ سکی۔

”کہیں جانے سے مسئلہ تو حل نہیں ہو جائے گا سلمان‘ تم یوں کرو‘ ہمارے گھر آ جایا کرو‘ میری ماں اور بابا تمہیں اِتنا پیار کریں گے کہ ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے گا۔“

”اچھا‘ چلو ٹھیک ہے‘ کل سنڈے ہے‘ تم تو پارک آؤ گی نہیں‘ میں ہی تمہارے گھر آ جاؤں گا۔“

سلمان نے اُس کی بات کو ٹالا نہیں تھا۔

آنے والے دِنوں میں واقعی سلمان علوی اُس کے گھر کا فرد بن کر رہ گیا تھا۔ اُس کے اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق نے عائشہ بیگم اور حفیظ صاحب دونوں کو ہی اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ حفیظ صاحب اُس

ہ زیادہ انحصار کرنے لگے تھے۔ عائشہ بیگم بھی ہر معاملے میں اُس سے مشورے کو ضروری خیال کرتی ۔ صائمہ کو اُس کی صورت جیسے ایک سگا بھائی میسر آ گیا تھا۔ وہ اُس سے روز کوئی نہ کوئی فرمائش کرتی ی۔

زندگی حقیقی معنوں میں کتنی خوبصورت ہے‘ سلمان علوی کو یہاں اِس گھر میں آ کر پتہ چلا تھا۔ اب ے سارے کام نازیہ نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔

♦ ♦ ♦

جن دِنوں گھر میں نازیہ کی شادی کا سوال اُٹھا تھا‘ اُنہی دِنوں سلمان کی بے قراری عروج پر پہنچ گئی نازیہ دیکھ سکتی تھی وہ کئی کئی روز تک گھر نہیں آتا تھا‘ کپڑے بھی نہ بدلتا اور پہلے کی طرح شوخیاں بھی تا‘ اُن دِنوں اُس نے شیو بھی بڑھا لی تھی۔ عائشہ بیگم جیسے ہی اُس سے کسی خاتون کی رشتے کیلئے آمد کا یں وہ مضطرب ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا‘ یہی چیز نازیہ شیرازی پر اُس کے اندر کا حال عیاں کرتی تھی۔

اُس نے روبرو کبھی اُس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اُس سے پیار کرتا ہے‘ مگر اِس کے باوجود وہ اُس کی ں میں ہلکورے لیتے بے چینی کے سمندر سے یہ جان گئی تھی کہ محبت کی راہ گزر پر وہ اکیلی ہی گامزن ہے۔

سلمان اندر ہی اندر گھٹ کر شدید بخار کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

اُس روز حفیظ صاحب کے کام پر جانے کے بعد عائشہ بیگم صائمہ کو ساتھ لے کر بازار چلی گئیں۔ زیہ شیرازی سنڈے کی چھٹی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہفتہ وار صفائی میں لگ گئی۔ تب پورے ایک ے بعد اُس نے دروازے پر سلمان علوی کی مخصوص دستک سنی تھی۔

لحہ بھر کیلئے اُس کی دھڑکنیں پھر منتشر ہوئی تھیں‘ لپک کر دروازہ کھولتے ہوئے اُس نے سلمان علوی ھا تھا جو قطعی رف حلیے میں بہت بیمار دکھائی دے رہا تھا۔

نازیہ اُسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”سلمان...... تم ٹھیک تو ہو......؟“

پہلی بار وہ حقیقی معنوں میں اُس کیلئے پریشان ہوئی تھی۔ سلمان اندر آیا تو اُس کی چال میں بھی شکستگی

”کیا ہوا ہے......؟“

اُسے خاموش پا کر اُس نے پھر پوچھا تھا‘ جب وہ صحن میں دھری کرسی پر ٹکتے ہوئے بولا۔

”کچھ نہیں یار‘ بس یونہی ذرا سا بخار ہو گیا تھا‘ ایک ہفتے بستر سے اُٹھا ہی نہیں گیا۔“

”ذرا سا بخار...... اپنا حال دیکھو کیا ہو رہا ہے‘ بندہ کسی کو خیر خبر کی اطلاع تو دے دے‘ مجھ پر تو پابندی اں نہیں جا سکتی‘ تم پر تو کوئی پابندی نہیں تھی‘ پھر بھی تم نہیں آئے۔“

اُس کی پریشانی مزید بڑھی تھی۔ سلمان نے چند پل اُس کی طرف دیکھنے کے بعد دھیرے سے رُ
پھیرلیا۔

''تُم جانتی تو ہو نازی' وہاں میں جیسے بھی رہ رہا ہوں' تُم اُس سے لاعلم نہیں ہو' پتہ نہیں کیوں آج کل امی بہت یاد آتی ہیں' کبھی کبھی تو خدا سے گلہ بھی کر جاتا ہوں' میری ہی ماں کو کیوں چھینا اُس نے' میرا دامن کیوں محبتوں سے خالی رکھا؟''

ایک لمحے کیلئے اُس کی سُرخ آنکھوں میں نمی چھلکی تھی۔ نازیہ کا دِل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

''تُم ایسا نہ سوچا کرو سلمان' میں ہوں ناں تمہارا خیال رکھنے والی' پھر ماں بابا اور صائمہ ہیں ناں۔''

''کب تک...... یہ رشتے کب تک میرے ساتھ رہیں گے' اِدھر تُم اِس گھر سے رُخصت ہوئیں ا
اُدھر سب تمہارے شوہر کی طرف متوجہ ہو جائیں گے' میری حیثیت پھر فالتو چیز کی ہو جائے گی' میں یہ س
برداشت نہیں کر سکوں گا نازی' جن پیاروں کی اپنائیت دیکھی ہے اُن کی بیگانگی برداشت نہیں ہو گی م
سے۔''

اُس وقت وہ اِس درجہ مایوس کیوں تھا نازیہ چاہ کر بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے سلمان' کیوں اتنا فضول سوچنے لگے ہو تُم' میں کہیں نہیں جا رہی' ہمیشہ یہیں رہوں گی' تُم سب لوگوں کے پاس۔''

''ہاں میرے پاس کیا ہے تمہیں دینے کیلئے؟''

وہ اپنی مفلسی پر ہنسا تھا' جب وہ افسوس سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''سب کچھ تو ہے تمہارے پاس' محبت بھرا دِل' ذہانت' وجاہت' نیک نامی اور کیا چاہئے مجھے؟''

''تم پاگل ہو' زندگی ان چیزوں کے سہارے بسر نہیں ہوتی' سکون اور عزت سے جینے کیلئے دولت سب سے بڑی چیز ہے' اور وہی میرے پاس نہیں ہے۔''

''تو کیا ہوا' آج نہیں تو کل سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' تُم ٹینشن مت لو' اگر سکون اور عزت کیلئے دولت بنیادی چیز ہوتی تو کوئی امیر سوسائیڈ نہ کرتا نہ ہی سکون کی نیند لینے کیلئے اسے خواب آور گولیوں کی ضرورت پڑتی۔''

وہ ہمیشہ یونہی اُس کا حوصلہ بندھاتی تھی۔ اِس لمحے بھی سلمان اُسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

''تُم بہت اچھی ہو نازی' میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھتا۔''

حسرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قدرے یاسیت سے بولا تھا جب وہ اُسے ڈپٹتے ہوئے بولی۔

''اچھا بس' فضول بولنا بہت آ گیا ہے تمہیں' میں چائے لاتی ہوں تمہارے لئے۔''

وہ چائے کیلئے اُٹھ گئی تو سلمان وہیں کچن میں اُس کے پاس چلا آیا۔

''نازی...... مجھے تُم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی' سُن کر مجھ سے خفا تو نہیں ہو گی......؟''

وہ قدرے اُلجھن کا شکار تھا' تاہم نازیہ اُس کی پریشانی نہیں سمجھ سکی تھی' تبھی لاپروائی سے بولی۔

''کہو کیا بات ہے' تُم سے خفگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اُس کی اجازت پر چند لمحے وہ خاموش رہا تھا' پھر بولا۔

''میں اپنی موجودہ زندگی اور حالات سے بہت تنگ آ گیا ہوں یار' اِسی لئے یہاں سے کوچ کر
نے کا فیصلہ کر لیا ہے' میرے ایک دوست کے ابو ائیر فورس میں ہیں' پچھلے دِنوں میں اُن سے ملا تو اُنہوں
مجھے ائیر فورس میں اپلائی کا مشورہ دے دیا' کچھ میرا اپنا بھی شوق ہے' شعبہ بھی بے حد اچھا ہے اور
ی بھی بہت اچھی ہی ہو گی' اِسی لئے میں اگلے چند روز میں اسلام آباد جا رہا ہوں' تُم دُعا کرنا اِس بار
ت مجھ سے بے وفائی نہ کرے۔''

نازیہ شیرازی کے دِل کو اُس کے عام سے الفاظ نے گویا کاٹ ڈالا تھا۔ وہ لمحے میں تڑپ کر اُس کی
ب متوجہ ہوئی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو سلمان۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں نازی' اب اِس شہر میں میرا دِل نہیں لگتا' کچھ عرصے مزید یہاں رہا تو شاید زندہ
نہ رہ سکوں' میری زندگی میں اب تمہارے حصول کے سوا اور کوئی مقصد بھی باقی نہیں رہا ہے' اور یہ تو تُم
جانتی ہو ناں' جب تک میں کچھ کر نہیں پاؤں گا' تب تک انکل تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں نہیں دیں گے'
نہیں کھونا نہیں چاہتا' یوں سمجھ لو تمہارے سوا میری زندگی میں کوئی رنگ نہیں ہے' میں انکل' آنٹی کی
لوث محبت پر شک نہیں کرتا' لیکن اُنہیں مطمئن کرنے کے لئے کہیں نہ کہیں ہاتھ پاؤں تو مارنے ہی
ں گے ناں؟''

وہ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا' مگر نازیہ کیلئے اُس کی بات کو تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا' تبھی وہ رو پڑی
۔

''نہیں' تُم کہیں نہیں جاؤ گے' اِس شہر سے دور تو بالکل نہیں' پلیز یہیں کوئی جاب ڈھونڈ لو ناں۔''

''جاب پلیٹ میں رکھ کر نہیں ملتی نازی' بہت خوار ہونا پڑتا ہے اس کیلئے' اور پھر میں نہیں چاہتا' میری
ے تمہیں آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا پڑے' نہ ہی میں تمہیں اُس عورت کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں جو
ں کے رُوپ میں سوتیلی ماں سے بڑھ کر ہے' میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو نازی' پلیز۔''

وہ بہت زیادہ ڈیپریس تھا۔ نازیہ اُس سے زیادہ پریشان ہو کر رہ گئی تھی۔

کسی قول و قرار کے بغیر بھی وہ ایک دوسرے کا حال بخوبی سمجھ سکتے تھے۔

اُس روز وہ چائے پیئے بغیر ہی' عائشہ بیگم اور صائمہ کا پوچھ کر چلا گیا تھا' تاہم اگلے روز اُس نے دیگر
ر والوں کو بھی اپنے ارادے سے باخبر کر دیا تھا۔

حفیظ صاحب اور عائشہ بیگم نے اُس کے اقدام کو بہت سراہا تھا۔ تاہم صائمہ نے نازیہ کی طرح اُس کی جدائی پر اپنے دُکھ اور افسردگی کا اظہار کیا تھا' مگر اُس نے اُسے بہلا لیا۔

اپنی رخصت سے ایک دِن پہلے اُس نے نازیہ سے خصوصی فرمائش کی تھی کہ وہ آفس سے واپسی کے بعد' اپنے پہلے معمول کی مانند اُسے پارک میں ضرور ملے۔ نازیہ نے اُس سے بول چال بند کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کر رکھا تھا یہ پیغام بھی صائمہ کی معرفت اُس تک پہنچا تھا' اور ہزار ناراضگی کے باوجود' جانے کیا سوچ کر' آفس سے واپسی کے بعد پارک کی طرف چلی آئی تھی' جہاں وہ پہلے سے موجود اُس کی راہ دیکھ رہا تھا۔

''کیسی ہو نازی......؟''

جونہی وہ سنگی بینچ پر اُس کے قریب بیٹھی اُس نے مسکرا کر پوچھ لیا۔

''تمہیں کیا' جیسی بھی ہوں' تُم اپنی بات کرو' کیوں بلایا ہے مجھے یہاں۔''

اُس کی خفگی اب تک برقرار تھی۔ سلمان پھر دھیمے سے مسکرا دیا۔

''بس یونہی' تمہیں دیکھنے کو دِل چاہ رہا تھا' گھر میں تو لفٹ کرواتی نہیں ہو' میں نے سوچا یہیں مل لُوں۔''

''کیوں مل لُوں......؟''

نازیہ کا خیال تھا شاید اُس کی خفگی سے متاثر ہو کر وہ اپنے جانے کا ارادہ بدل دے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔

''بس......کہا ناں دِل چاہ رہا تھا' پھر پتہ نہیں یہ حسین صورت کب دیکھنا نصیب ہو......؟''

اب کے پھر نازیہ نے اُسے شکوہ کناں نگاہوں سے گھورا تھا۔

''سوری...... پلیز غصہ تھوک دو ناں یار' دیکھو جو بھی کر رہا ہوں وہ تمہارے لئے ہی تو کر رہا ہوں' وگرنہ مجھے تو جینے کی طلب ہی نہیں تھی' تُم زندگی میں آئی ہو تو دِل میں کچھ کرنے کی امنگ جاگی ہے' یہ عارضی جدائی ہی ہمارے دائمی مِلن کا سبب ہوگی' تُم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔''

آج اُس کا حلیہ بھی درست تھا اور موڈ بھی۔ نازیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اُس پر اپنے جذبات کیسے واضح کرے۔ لہٰذا سر جھکا کر اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''نازی......پلیز یار' تُم ایسا بی ہیو کرو گی تو میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا' تُم تو میرا حوصلہ ہو یار' مما کے بعد اگر کوئی عورت میری زندگی میں بہت زیادہ شیئر رکھتی ہے تو وہ تُم ہی ہو' میں نے انکل آنٹی سے دو سال کا ٹائم لیا ہے' دو سال کے بعد اللہ نے چاہا تو تُم مجھے اُس مقام پر پاؤ گی' جہاں میں مکمل اعتماد سے سر اُٹھا کر تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا سکوں گا' بولو میرا ساتھ دو گی۔''

اب کے اُس نے اپنا مضبوط ہاتھ اُس کے سامنے پھیلایا تھا۔ جواب میں اُس نے نا چاہتے ہوئے بھی اپنا ہاتھ اُس کے کشادہ ہاتھ پر رکھ دیا۔

''ہاں۔''

''تھینک یو۔''

ممنونیت سے کہتے ہوئے سلمان نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''نازی...... پتہ ہے' اِس لمحے میرا شدت سے دِل چاہ رہا ہے کہ اِس ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی ی کر تمہیں اپنا پابند کر جاؤں۔ مگر......افسوس ابھی میں اِس قابل بھی نہیں ہوں' پھر بھی مجھے یقین ہے' تُم ا انتظار کرو گی' کرو گی ناں......؟''

''ہاں۔''

وہ جیسے اُس کے سحر میں آ گئی تھی' جیسے جیسے وہ اُس سے کہتا گیا تھا ویسے ویسے وہ مانتی گئی تھی۔ اور پھر بچھڑ گیا۔ آنے والے دِنوں کے ڈھیروں خوب صورت خواب اُس کے سپرد کر کے خود گم ہو گیا۔ مگر وہ پنے اقرار کے سحر سے نہ نکل سکی۔

ابتداء میں اُس نے اُس سے رابطہ رکھا تھا۔ اپنی مشکلات سے بھی آگاہ کرتا رہا تھا اُسے' مگر چند ماہ کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ نہ کوئی خط' نہ فون۔

دِن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے' مگر اُس کی کوئی خبر نہ آئی۔ نازیہ شیرازی کی سماعتیں اور دروازے پر ہونے والی دستکوں سے بندھ کر رہ گئے تھے' مگر سات سال تک اُس کا انتظار لاحاصل ہی اور اب وہ اپنے اقرار کے حصار کو خود توڑ رہی تھی۔

دھیرے دھیرے سرکتے لمحے اُس کی رُوح کو اُدھیڑتے جا رہے تھے۔

موم بتی مکمل ختم ہو گئی تھی' تب اُس نے تھک کر پلکیں موند لیں۔ آج محبت اور لاحاصل انتظار کا ایک باب ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا۔

♦ ♦ ♦

دادا جی اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے خاصے انہماک سے لان کا نظارہ دیکھ رہے تھے' جہاں سادہ ے کپڑوں میں ملبوس سبرینہ پودوں کو پانی دیتے ہوئے جانے کس سوچ میں گم تھی۔ وہ اِس لڑکی کو پچھلے کئی ز سے یونہی لان میں پودوں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ پھولوں کو چومتی تھی تو کبھی بکھرے ہوئے پتوں کو سمیٹ رہی ہوتی' حویلی میں پھول پودوں سے شغف اُن کے بعد صرف ایک ہی تی کو رہا تھا اور وہ اُن کا چہیتا بیٹا احسن تھا۔ احسن کے بعد لان ملازمین کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا' کبھی کبھار اُن کا دِل چاہتا تو وہ پودوں کو پانی دے دیتا تھا۔

مگر یہ لڑکی اُن کی دیکھ بھال ایسے ہی کر رہی تھی جیسے کبھی وہ خود احسن کے ساتھ مل کر کیا کرتے تھے۔

جانے وہ کون تھی؟ اِس سے پہلے اِتنے سالوں میں اُنہوں نے کبھی اُس لڑکی کو وہاں حویلی میں نہیں

دیکھا تھا۔ اُس سادہ سی لڑکی کے بارے میں ایک دم سے اُن کا تجسس بڑھا تھا۔ اپنے لباس اور کام سے ہرگز اُنہیں کوئی ملازمہ نہیں لگتی تھی' تبھی روزانہ قرآنِ پاک کی تلاوت کے بعد وہ اپنی وہیل چیئر گھسیٹ کھڑکی کی طرف لے آتے تھے اور جب تک سبرینہ لان میں کام کرتی رہتی تھی وہ اُنہیں دیکھتے رہتے تھے جانے کیوں اُسے دیکھ کر اُنہیں اپنے احسن کی بے حد یاد آتی تھی اور اکثر وہ چپ چاپ رو پڑتے تھے۔

اُس روز جانے کیا سوچ کر وہ اُن کے کمرے میں چلی آئی تھی۔

''اسلام علیکم۔''

کئی بار دستک کے بعد دادا جی نے اُسے اپنے رُوم میں آنے کی پرمشن دی تھی۔ جب اُس نے جھٹ سے سلام جھاڑ دیا۔ جواب میں اُنہوں نے قدرے ناراضی سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ......ازہان نے بھیجا ہے دادا جی' خود آ نہیں سکتا ناں' اِس لئے۔''

اُن کی خفگی پر فوراً سے پیشتر اُس نے اپنے کی وضاحت کر دی تھی' تبھی وہ نرم پڑے تھے۔

''تم ہو کون......؟ اور ازہان کہاں ہے......؟''

وہ ابھی تک ازہان کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی سے باخبر نہیں ہو پائے تھے' تبھی رُعب سے پو تو وہ بولی۔

''میں سبرینہ ہوں دادا جی' برطانیہ سے آئی ہوں' حائقہ آنٹی میری مما کی بہت اچھی فرینڈ ہیں اُنہوں نے ہی مجھے یہاں بلوایا ہے' اور وہ ازہان ہے ناں' اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' ٹانگوں پر چوٹ ہے۔ ڈاکٹرز نے بستر سے اُٹھنے سے منع کر دیا ہے' اِسی لئے مجھے بھیج دیا' آپ کو بُرا تو نہیں لگا۔''

اِس وقت سبرینہ احسان کی جگہ اگر کوئی اور اُن کے کمرے میں آتا تو یقیناً وہ اُس سے اُلجھ پڑتے' مگر سبرینہ احسان کے بارے میں وہ خود بھی جاننا چاہ رہے تھے' لہٰذا نرم رہے۔

''چوٹ کیسے لگ گئی اُسے......؟''

وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے ہی اُنہوں نے پوچھا تھا' جب وہ مزید قریب آتے ہوئے بولی۔

''بائیک سے گر گیا تھا' بہت تیز ڈرائیو کرتا ہے ناں اِسی لئے ایسا ہوا' آپ کے لئے کھانا لاؤں؟''

ایک دم سے اُس نے گفتگو کا ٹریک بدل دیا تھا۔

''ہاں لے آؤ' میری دواء کا ٹائم بھی ہو رہا ہے۔''

اُنہیں ازہان کی فکر بھی لگ گئی تھی۔ احسن صاحب کے بعد وہی اُن کے سب سے زیادہ قریب ر تھا۔

سبرینہ کا دِل اِس لمحے خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔ آج اُس نے نہ صرف اپنے دادا جی کو غور سے دیکھ لیا تھا' بلکہ اُن سے ملاقات بھی ہو گئی تھی' اور اب یہ ملاقات جاری رہنے کا اُسے پورا یقین تھا۔

اگلے روز فجر کی نماز کے بعد وہ اُن کے کمرے میں آئی تو اُس کے آنچل میں بہت سے موتیا کے مہکتے پھول تھے۔

''یہ لیں دادا جی' نئے پودے پر لگنے والے پہلے پھول ہیں' آپ کو پھول اچھے لگتے ہیں ناں۔''

اپنے بابا کی معرفت وہ اُن کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی' مگر وہ یہ حوالہ نہیں جانتے تھے تبھی چونکے تھے۔

''رکھ دو ناں' تم کیسے جانتی ہو کہ مجھے پھول اچھے لگتے ہیں؟''

اُنہوں نے پوچھا تھا' جب وہ مسکرا کر وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

''حائقہ پھوپھو نے بتایا تھا کہ باہر لان میں سبھی پھول پودے آپ کے ہاتھ سے لگے ہوئے ہیں' اِسی لئے میں نے کہا؟ کیا آپ کو پھول پسند نہیں ہیں؟''

وہ جلد سے جلد اُن سے فرینک ہونا چاہتی تھی' مگر دادا جی اُسے ایسا کوئی موقع نہیں دے رہے تھے۔ تبھی خاموش رہے مگر سبرینہ نے ہمت نہیں ہاری' گاہے بگاہے اُن کے کمرے میں آمد کے بعد وہ کچھ نہ کچھ ضرور بولتی رہتی تھی' کبھی تاریخ پر ڈسکس کرتی تو کبھی اُن کے جوانی کے زمانے کو ادھیڑ کر بیٹھ جاتی' باتوں باتوں میں کبھی احسن صاحب اور بیہ خانم کا تذکرہ نکل جاتا تو سبرینہ دیکھ سکتی تھی کہ دادا جی کے نرم چہرے پر عجب سا اضطراب بکھر کر رہ جاتا تھا۔

بہت تھوڑے دِنوں میں وہ اُس پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے لگے تھے۔ اب اُن کے تمام کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دینے کے علاوہ' وہ روز رات میں اُنہیں مختلف اسلامی کتابوں سے بہت اچھے اچھے واقعات بھی پڑھ کر سناتی تھی۔ دادا جی اُس سے بہت زیادہ خوش رہنے لگے تھے۔

اب اکثر وہ اپنے دِل کی باتیں بھی اُس کے ساتھ شیئر کر لیا کرتے تھے۔ سبرینہ کو اپنا مقصد بہت جلد پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

• • •

جو بندھن ضبط کے ہیں آج سارے ٹوٹ جائیں گے
ان آنکھوں کے سمندر کے کنارے ٹوٹ جائیں گے
بہت رویا کرے گا ہجر کی ویران راتوں میں
ہماری قربتوں کے جب سہارے ٹوٹ جائیں گے
عروجِ عشق پر پہنچا کے ہم کو چھوڑ مت دینا
بڑے نازک ہیں ہم تو غم کے مارے ٹوٹ جائیں گے
چلے جاؤ گے تم تو کھیل کر مجبور لوگوں سے
مگر کتنے ہی دل ہوں گے جو سارے ٹوٹ جائیں گے

بکھر جائیں گے ریزہ ریزہ ہو کر ان کے قدموں میں
انہی کے غم میں جب سینے ہمارے ٹوٹ جائیں گے

شاہ ولا میں ثمرن ازہان کی ضد پر اسفند شیرازی کا پرپوزل قبول کرلیا گیا تھا۔ شہروز علوی کے لئے زندگی کا یہ قدم بہت حیران کن اور تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ زندگی اس کے ساتھ اتنا بھیانک مذاق بھی کرسکتی ہے۔

ثمرن ازہان' جو دھڑکن بن کر اسے کے دل میں دھڑکتی ہے۔ وہ کسی اور کی زندگی کا حصہ بھی بن سکتی ہے۔

جب سے اسے احتشام کی معرفت' اس کی رضامندی کا علم ہوا تھا وہ غم و غصے سے گویا پاگل ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شادی کی ڈیٹ جس روز فکس ہو رہی تھی اسی روز وہ دندناتا ہوا اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں ثمی' تم اپنے باس سے شادی پر رضامند ہو؟''

وہ آڑی ترچھی بیڈ پر لیٹی مختلف سوچوں میں گم تھی جب اس نے بارعب لہجے میں پوچھا تھا۔ جواب میں وہ افسوس سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

''ہوں' یہی سچ ہے' کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے اس پر۔''

''ہاں ہے اعتراض' تم ہماری کسٹڈی میں ہو' تمہارے اچھے برے کا سوچنا ہمارا فرض ہے' ہمارا درد سر ہے' پھر تم اکیلے ہی اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرسکتی ہو؟''

وہ اب بھی دل کی بات زبان سے کہنے کی جرأت نہیں کرپایا تھا اور اسی چیز نے ثمرن ازہان کو مزید ہرٹ کیا تھا۔

اس وقت بڑی پھیکی سی بے جان مسکراہٹ اس کے خشک لبوں پر بکھری تھی۔ آنکھوں میں مزید درد عود آیا تھا۔ وہ بولی تو اس کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے کانچ سی کھنک تھی۔

''تم شاید بھول رہے ہو شہروز کہ یہ زندگی میری ہے اسے کیسے اور کس کے ساتھ گزارنا ہے' یہ میں سوچوں گی' تم نہیں۔''

''او' تم یوں کہو ناں کہ اپنے باس کی دولت اور وجاہت پر مرمٹی ہو۔''

اس کا دل جل رہا تھا تو لہجہ کیسے بے تاثر رہتا۔

ثمرن ازہان کے لبوں پر ایک مرتبہ پھر بڑی بے جان سی مسکراہٹ بکھری تھی۔

''تم کیا سمجھتے ہو' دولت اور وجاہت کے معاملے میں تم کسی سے پیچھے ہو؟''

''ہاہ میرا یہاں کیا ذکر' تمہیں تمہارے خوابوں کا راج کمار مل رہا ہے۔ تم خوش رہو' باقی کوئی جئے مرے تمہیں اس سے کیا؟'' وہ صاف جلا تھا اور اس کی یہ جلن ثمرن کی لمحاتی ہی سہی مگر لطف دے گئی تھی۔

''تم جو کہنا چاہتے ہو وہ صاف صاف کہو شہری' خواہ مخواہ کی ٹینشن مت پھیلاؤ۔''

''میں تو خواہ مخواہ ہی ہوں' تمہیں تمہارا گوہر مقصود جو مل گیا ہے۔''

رخ پھیرتے ہوئے اس نے پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔

''اوکے تمہیں کوئی پرابلم ہے تو بتاؤ۔''

اس کے تنے ہوئے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے پوچھا تھا' جب وہ مزید سلگتے ہوئے بولا۔

''مجھے کیا پرابلم ہونی ہے' تم خوش ہو اسی میں میری خوشی ہے مگر۔''

کہتے کہتے وہ ایک پل کے لئے رُکا نہیں جب ثمرن نے چونک کر اس کی طرف نگاہ کی۔

''مگر......کیا شہری؟''

''کچھ نہیں۔''

ایک لمحے میں آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھرایا تھا۔ پھر ایک پل بھی وہاں رکے بغیر' وہ تیز قدم اٹھاتا اس کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

دسونی کت حال سناواں
دسونی کت لوڑاں
دونویں ہتھیں گھڑ گھڑ دل نوں
نی میں آپو بیٹھی توڑاں
نی میں دل نوں رانجھن کیتا' دل کرے نت کھوڑاں
میں ایس دل نوں موتی کر کے رل گئی وانگ روڑاں

شہروز تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے کمرے سے نکل چکا تھا' مگر وہ اب بھی نڈھال بیٹھی کمرے کی دہلیز کو دیکھ رہی تھی۔

آنسو تھے کہ یہ کسی آبشار کی مانند اس کی آنکھوں سے پھوٹ بہے تھے۔ وہ محبت میں ہارنا نہیں چاہتی تھی مگر ہار گئی تھی۔

شہروز علوی کی بزدلی نے توڑ کر رکھ دیا تھا اسے اپنی اپنی انا اور خودداری کے مقبرے میں مقید وہ دونوں ہی نفوس' خود ہی اپنی خوشیوں کے محل کو اپنے ہاتھوں سے مسمار کرنے پر تل گئے تھے۔ شاید دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ انا محبت کی قاتل ہے۔

انہیں معلوم نہیں تھا کہ محبت کے کھیل میں جو ہار جاتا ہے۔ ہمیشہ جیت اسی کا مقدر بنتی ہے۔ تاہم وہ ابھی جیت نہیں پائی تھی۔

اسے شہروز علوی کو کھودینے کا دکھ تھا۔ مگر وہ خود کو اس کا ذمہ دار نہیں سمجھتی تھی۔ سارا قصور سارا الزام

شہر درے رتھ پنے کے بعد اسے اپنا ہر اقدام بالکل درست دکھائی دے رہا تھا۔

♦ ♦ ♦

پورے سات گھنٹے ہوش و حواس سے بیگانہ رہنے کے بعد وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی تو ایک مہربان سی شخصیت کو اپنے پاس موجود دیکھ کر قدرے حیران رہ گئی۔

''اب کیسی طبیعت ہے بیٹی؟''

اس کی پیشانی پر اس مہربان شخصیت کا ہاتھ تھا' تبھی اسے اپنے ساتھ ہونے والا حادثہ یاد آ گیا اور وہ اپنی بکھری ہوئی ہمت مجتمع کرتے ہوئے بیڈ پر اٹھ بیٹھی۔

''مم...... میں ٹھیک ہوں' آپ کون ہیں' اور...... مجھے یہاں کون لایا ہے۔''

اس کے اس سوال پر ایک دھیمی سی مسکان' سامنے بیٹھی شخصیت کے لبوں پر بکھری تھی۔

''تجھے یہاں کاشف لایا ہے بیٹی! اسی کی گاڑی کے ساتھ ٹکر ہوئی تھی تیری' بہت اچھا ہے دل کا بس مزاج کا تھوڑا تیکھا ہے' میں ماں ہوں اس کی۔'' اپنا مختصر تعارف کروانے کے بعد انہوں نے سنعیہ پر بھرپور مہربان نگاہ ڈالی تھی۔

''بیٹی! میں تیرا نام تو نہیں جانتی' لیکن جانے کیوں تیری صورت دیکھ کر لگتا ہے' جیسے تو بہت دکھی ہے کاشی مجھے ماں جی کہتا ہے' تو بھی مجھے اپنی ماں ہی سمجھ اور اپنے گھر والوں کے متعلق بات' تا کہ تجھے ان کے پاس بھجوا سکوں۔''

اپنے گھر والوں کے متعلق سن کر اس کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر آنسوؤں سے بھر آئیں تھیں۔ تبھی وہ قدرے مغموم لہجے میں بولی تھی۔

''میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے ماں جی' وہ رشتے جن کے ساتھ میں اب تک نبھا کرتی آئی ہوں' ان رشتوں نے بھی اپنا مان چھین لیا مجھ سے۔''

نم لہجے میں کہتی وہ انہیں اپنی زندگی کی تمام حقیقتوں سے آشنا کرتی چلی گئی تھی۔ ماں جی کو واقعی اس کی کہانی سن کر گہرے ملال نے آ گھیرا تھا۔ ان کا شفیق ہاتھ بھی سنعیہ کے سر پر تھا اور وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے بیٹی! بے شک تیری زندگی دکھ سے لبریز ہے' لیکن پھر بھی ایک ماں کی حیثیت سے میں تمہیں یہی نصیحت کروں گی کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے بیٹی! گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو یہ معاشرہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا' پھر ماں نہ سہی' تیرا باپ تو ہے۔ ایک دن اسے ضرور اپنی غفلت کا احساس ہوگا۔''

''نہیں ہوگا ماں جی' پچھلے اٹھارہ سال سے انہیں وہ دکھائی دیتا ہے جو میری سوتیلی ماں انہیں دکھاتی ہیں۔ انہیں وہی سنائی دیتا ہے جو ماں انہیں سنانا چاہتی ہیں' میں اس زندان میں اب واپس نہیں لوٹنا چاہتی ماں جی' اب مزید ہمت نہیں رہی ہے مجھ میں۔''

حقیقت بھی یہی تھی' عمر عباس نقوی کی بے وفائی نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جس کی ت کا ہاتھ تھام کر اس نے ہر زیادتی ہر دکھ کو برداشت کرنے کا عظم کیا تھا اب اسی محبت کی دربدری پر وشنل ہوتے ہوئے وہ اپنا تمام حوصلہ ہار گئی تھی۔ جانے کیوں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے اب بھری دنیا ہیں کوئی ایک بھی اس کا اپنا نہیں رہا ہے۔

اس وقت اس کا دل شدید رنجیدہ ہو کر' عمر عباس نقوی سے متنفر ہو رہا تھا۔ وہ اس کے متعلق کچھ بھی چتے ہوئے شدید ہرٹ ہو رہی تھی۔

عمر اور پنکی کی ''دوستی'' کا جو نظارہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی اس کے بعد وہ اپنے دل میں عمر لئے قطعی گنجائش نہیں نکال پا رہی تھی۔ اسے وہ بھی دنیا کے دوسرے عام مردوں کی طرح فلرٹی اور بات سے کھیلنے والا ہی لگا تھا۔

لہٰذا ماں جی نے اسے مزید سمجھانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے فی الحال خاموش رہنے میں ہی یت جانی تھی۔ ابھی وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب تھی لہٰذا وہ اسے مزید ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ چپ پ اسے پیار کر کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

سنعیہ کو تنہائی میسر آئی تو اس کا ذہن پھر سے مختلف خیالات کی اماہ جگاہ بن گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ی سوتیلی ماں نے اس کی عدم موجودگی پر خوب شور مچا کر محلے میں اس کی بدنامی کی ہوگی۔ اس کا باپ ندگی سے سر جھکائے دل ہی دل میں اس کے مر جانے کے دعائیں مانگتا ہوگا اور پنکی اس نے تو رانے کے نوافل پڑے ہوں گے کہ اس کی راہ کا کانٹا خود ہی راستے سے ہٹ گیا۔ البتہ عمر عباس نقوی کو ور دھچکا لگا ہوگا۔

اس نے شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ہرٹ ہو کر ایسا بھی کوئی قدم اٹھا سکتی ہے۔ ایک ''کھلونے'' ، بھلا ایسی توقع رکھ بھی کون سکتا ہے۔

نادان دلوں سے کھیلنا اور کھیل کر توڑ دینا امیر زادوں کا مشغلہ ہوتے ہیں' اسے بھی اس وقت ایسا ہی وس ہو رہا تھا جیسے عمر نے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اسے بیوقوف بنایا ہو۔ محبت کا ''لالی پاپ'' تھما اس کے پر خلوص جذبات کو توہین کی ہو۔

جیسے جیسے یہ سب باتیں اس کے ذہن میں آ رہی تھیں' ویسے ویسے اس کے آنسوؤں کی شدت میں افہ ہوتا جا رہا تھا۔ کتنی بد نصیب تھی وہ کہ اسے دنیا میں کوئی ایک رشتہ بھی خالص نہیں ملا تھا۔

آنسوؤں کی یہ آبشار جانے کب تک بہتی رہتی کہ اچانک کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ں اور اگلے ہی پل کوئی اس کے قریب چلا آیا۔

''السلام علیکم! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

وہ جو کوئی بھی تھا' بہت مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ سنعیہ اسے دیکھ کر محض اثبات میں سر ہی ہلا سکی

تھی۔

''مجھے ڈاکٹر کاشف کہتے ہیں' امی نے تعارف کروادیا ہوگا میرا؟''

وہ اس کے قریب ہی کرسی گھسیٹ لایا تھا۔ تاہم سنعیہ نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا' ابھی تک رکھا نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتیں۔''

وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار بھی تھا اور اسی چیز نے سنعیہ غیاث کا حوصلہ بڑھا تھا۔

''مجھے سنعیہ کہتے ہیں' ماں جی کو اپنی کہانی سنا چکی ہوں میں۔''

''گڈ اپنی امی کے لئے آپ کے منہ سے ماں جی سن کر بہت اچھا لگا' سوری کہ میری وجہ سے ناحق آپ کو اتنی تکلیف اٹھانا پڑی۔ اصل میں اس وقت میں اپنے ایک دوست سے موبائل پر بات کر رہا تھ سارا دھیان بھی اس کی طرف تھا' تبھی آپ کے ساتھ ٹکر ہوگئی' اُمید ہے آپ میری اس گستاخی کو درگزر فر دیں گی۔''

دھیمے سے مسکراتے ہوئے اس نے کہا تھا' جواب میں سنعیہ بھی اپنے آنسو پونچھ کر بمشکل مسکر دی۔

''تھینکس' میرا خیال ہے اب اگر آپ آرام کرنے کا سوچیں تو زیادہ بہتر ہے' کیونکہ ابھی فی الحال آپ کو آرام کی زیادہ ضرورت ہے' ماں جی مجھے مختصر طور پر آپ کے بارے میں بتا چکی ہیں' آپ پلیز کوئی ٹینشن مت لیں' خدا کی کائنات بہت بڑی ہے' انشاء اللہ اب آپ کے ساتھ آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔''

ہمدرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سنعیہ غیاث اس لمحے حقیقتاً اپنے دکھوں کے حصار سے کسی حد تک باہر نکل آئی تھی۔

عمر عباس نقوی اس کے یوں اچانک غائب ہوجانے پر ازحد ڈیپریس ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ تو اسے محض جلانا چاہتا تھا۔ تھوڑا سا ستا کر اپنے ہرٹ ہونے کا بدلا لینا چاہتا تھا۔ مگر جواب میں سنعیہ نے جو قدم اٹھایا تھا اس کا اسے وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ ذہنی طور پر پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دلی طور پر بھی بے حد فکر مند تھا۔

وہ کہاں کس حال میں ہوگی؟ یہ سوچ ہی اس کا دل جلا رہی تھی۔ اسے نہ صرف پنکی بلکہ خود پر بھی بے حد غصہ آرہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی نے اس کے دل کو چھوا تھا لیکن اپنی حماقت سے اسے اس لڑکی کی زندگی اور عزت دونوں ہی خطرے میں نظر آرہی تھیں۔

کہاں کہاں انہیں تلاشا تھا اس نے اسے مگر سنعیہ کو نہیں ملنا تھا سو وہ نہ ملی۔ گزرتے ہر پل کے

س کے دل کی تکلیف جیسے بڑھتی جارہی تھی۔ خود غیاث صاحب کا حال بھی دیکھنے والا تھا۔ انہیں یہی تھا کہ سنعیہ کے کسی لڑکے کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔ لہٰذا وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر گھر سے فرار ہو اس سلسلے میں پنکی نے اپنی ماں کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اس نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے غیاث ب کے سامنے یہ بیان دیا تھا کہ پچھلے کئی روز سے سنعیہ کی حرکتیں مشکوک ہورہی تھیں وہ رات کو دیر اگ کر کسی کے فون کا انتظار کرتی تھی اور وقت بے وقت گھر سے نکل جاتی تھی۔ ہر وقت بے وجہ قہقہے ں کا مشغلہ بن گیا تھا۔ غیاث صاحب کے لئے یہ سب باتیں نئی اور حیران کن تھیں لہٰذا انہوں نے لو جان سے ماردینے کا پختہ عزم کرلیا تھا۔

♦ ♦ ♦

جانے والے چلے جاتے ہیں چپ چاپ مگر
کوچۂ یاد میں قدموں کے نشاں بولتے ہیں

چھاجوں مینہ برس رہا تھا۔ مگر اُس کے ہواس جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

کمرے میں نائیٹ بلب کی مدہم سی روشنی میں اپنے بستر پر دائیں بائیں کروٹیں بدلتا وہ سخت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

اُسے یاد آ رہا تھا' سات سال قبل جب نازیہ شیرازی اُس کی زندگی میں آئی تھی تو وہ کچھ نہیں تھ اُس کے پاس پہننے کیلئے ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے' وہ چھٹی جماعت میں تھا جب اُس والدہ کا ساتھ اُس سے چھوٹ گیا تھا' میٹرک تک پہنچا بھی نہیں تھا کہ والد کا سہارا بھی نہ رہا۔ وہ اپنی ما سے بے حد اٹیچڈ تھا۔ روز نت نئی فرمائشیں کرتا' اُنہیں خوب تنگ بھی کرتا' مگر اِس کے باوجود وہ کبھی اُس غصہ نہ ہوتیں۔ اُن دِنوں گھر میں بڑے بھیا کی اور چھوٹے بھیا کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں' مگر اُ کی مما کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے وہ کسی بھی کام میں حصہ نہ لے سکیں' سب کچھ رشتہ دار خواتین سپرد تھا' دونوں بھائی ماں کی بیماری کو یکسر نظر انداز کئے اپنی اپنی شادی کی تیاریوں میں جتے دکھائی د

تھے۔ صرف وہی تھا جو سکول سے آتے ہی ماں کی بستر کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جاتا اور اُنہیں اپنے سکول کے ساتھ ساتھ گھر میں ہونے والی تبدیلیوں کی بھی ڈھیروں باتیں سناتا رہتا۔

اُسے اپنے بھائیوں کی شادی کی خوشی سے زیادہ اپنی ماں کی بیماری کا دُکھ تھا' مگر وہ اِتنا چھوٹا اور بے ں تھا کہ چاہ کر بھی اُن کیلئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بابا بھی اُسی کی طرح کسی قدر بے بس دکھائی دیتے تھے۔

جس روز اُس کے بھائیوں کا ولیمہ تھا اُس روز اُس کی ماں بھوکی رہی تھی' کسی نے اُنہیں ایک گلاس نی پلانا بھی گوارہ نہیں کیا تھا' اُس روز نئی بھابھیوں کو دیکھ کر اور مختلف کاموں میں اُلجھ کر وہ خود بھی اپنی ماں سے غافل ہو گیا تھا' جس کا افسوس اُسے اگلے کئی روز تک رہا تھا۔

بھابھیوں کے آنے کے بعد اُس کی ماں اور بھی بے وقعت ہو گئی تھی' بھائیوں کیلئے اب اُن کے پاس گھڑی بیٹھ کر اُن کا حال پوچھنے کی فرصت بھی نہیں رہی تھی۔ صرف وہی تھا جو اُن کا خیال رکھتا تھا۔

اُن دِنوں اُس کے ایگزیم چل رہے تھے۔ لہٰذا وہ جلدی گھر آ جاتا تھا۔

اُس روز بھی وہ عربی کا پیپر دے کر گھر واپس آیا تو اپنی ماں کو کچن میں اوندھے منہ گرے دیکھ کر اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ روز سکول سے واپسی پر وہ پہلے کچن میں آ کر پانی پیتا تھا' پھر ماں کے س جاتا تھا' اُس روز بھی پانی پینے آیا تھا' مگر ماں کا حال دیکھ کر بھوک پیاس اڑ گئی۔

دونوں بھابھیاں اپنے اپنے کمروں میں بند تھیں اور نجانے کیا کر رہی تھیں۔ جانے کس چیز کی طلب نے اُس کی مما کو کچن کی طرف آنے پر مجبور کیا تھا' وہ رو رہا تھا اور ساتھ ہی اپنی مما کو اُٹھانے کی کوشش بھی کر ہا تھا مگر اُس کے جھنجھوڑنے پر بھی اُٹھ نہیں رہی تھیں۔ تب وہ زور زور سے رو کر اپنی بھابھیوں کو پکارنے لگا ا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس کی دونوں بھابھیاں اور بھائی' ناگواری کے تاثرات لئے اپنی اپنی خواب گاہوں کے نکل کر اُس کے قریب آئے تھے۔ اُنہوں نے اُسے ڈانٹا بھی تھا۔ مگر...... وہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہا ا۔

اُسے اُس لمحے صرف اپنی ماں کی فکر ستا رہی تھی۔

اُس سے اگلا دِن اُس کے لئے بہت بڑی تباہی لایا تھا۔ وہ وجود جو اُس کے لئے ٹھنڈی چھاؤں کے مصداق تھا۔ اب اُسے میسر نہیں رہا تھا' اِس صدمے نے کتنے ہی دِن اُسے بستر سے اُٹھنے ہی نہیں دیا۔

رفتہ رفتہ بابا کے پیار نے اُسے سنبھال لیا اور اُس نے پھر سے اپنی توجہ پڑھائی پر مبذول کر لی مگر ں کی کمی کا خلاء کبھی نہ بھر سکا۔ اپنی دونوں بھابیوں کے ساتھ بھی اُس کا رویہ ہمیشہ روکھا پھیکا ہی رہا۔ جس لی وجہ سے وہ دونوں ہی اُسے جوتے کی نوک پر رکھنے لگیں' دِن بھر کولہو کے بیل کی مانند کام لے کر بھی وقت نہ کھانا دیتیں نہ کپڑے۔ اب اُسے اپنے تمام کام بھی خود ہی کرنے پڑتے تھے۔

رات میں اُسے پڑھنا ہوتا تھا' مگر اُس کی "سگھڑ" بھابھیاں بجلی کی بحث کا رونا رو کر گھر کی تمام

بتیاں گل کر دیتیں اور یوں اُسے موم بتی کی روشنی میں نظر جما جما کر پڑھنا پڑتا۔ کبھیں کوئی معمولی سی کوتاہی ہو جاتی تو دونوں بھائی اُسے پیٹنے میں کوئی کسر نہیں رکھتے تھے۔ اُن دِنوں اُس کا دِل زندگی سے بے حد اچاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

بابا کی وفات کے بعد تو جیسے وہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ بھی کوئی انسان ہے۔ اپنا آپ اُس نے اپنی بھابیوں، بھائیوں اور اُن کے بچوں کیلئے وقف کر دیا تھا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد اُس کا بڑا بھائی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ ملک سے باہر شفٹ ہو گیا۔ بابا کی تمام جائیداد بھی دونوں نے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لی تھی۔ سلمان کے ہونٹ اِس زیادتی پر بھی چپ رہے تھے۔

زندگی کے انہی اندھیروں میں نازیہ شیرازی اُجالے کا روپ لے کر اُس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اپنے مزاج کی سادگی اور ظاہری بھول پن سے وہ اُسے دوسری عام لڑکیوں سے قدرے مختلف لگی تھی، قدرت اُسے اتفاقیہ طور پر اُس سے ٹکراتی رہی اور وہ جانے کیسے اُس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

اُسے یاد آ رہا تھا ایک بار گھریلو سودا سلف لاتے ہوئے اُس کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، جس پر حسبِ توقع اُس کے بھائی اور بھابھی نے اُسے ڈانٹا تھا، مگر جیسے ہی وہ بازو اور سر پر بندھی پٹی کے ساتھ پارک میں نازیہ شیرازی سے ملا اُس کا حال دیکھنے والا تھا۔ سلمان نے اپنے طور پر اُسے بہلانے کی بہت کوشش کی، مگر اِس کے باوجود وہ دُکھ سے رو پڑی تھی، مما کے بعد وہ دوسری لڑکی تھی جسے اُس کی پرواہ تھی، جسے اُس کی تکلیف درد پہنچاتی تھی۔

اُسے یاد تھا وہ کیسے اُس کی سانسیں گنتی تھی، ایک روز بھی وہ اگر اُس سے ملنے نہ آتا تو وہ پارک میں ہی شام کر دیا کرتی تھی، سلمان اُس کی عزت کرتا تھا، اِس لئے نہیں چاہتا تھا کہ وہ اُس کی بھابھی سے مل کر کوئی بھی غیر اخلاقی بات سنے اور ہرٹ ہو، اپنی تعلیم کے مکمل ہونے تک وہ کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا جو اُس کے اور نازیہ شیرازی کے حق میں بُرا ہوتا۔

پھر جب اُس نے ایف ایس سی اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا تو اپنے دوست کے والد کے مشورے پر ائیر فورس میں جانے کی دُھن ذہن میں بسا لی۔ نازیہ شیرازی اِس بات پر بھی اُس سے کتنی برہم ہوئی تھی، خود اُس کا دِل بھی کب چاہتا تھا اُس سے دُور جانے کو، مگر...... وہ اپنے حالات سے مجبور ہو گیا تھا۔ آنے والے خوبصورت دِنوں میں جو خواب اُس نے دیکھے تھے اُن خوابوں کو تعبیر دینے کیلئے اُس کا جانا ضروری تھا۔ اور یہی قدم...... اُسے اپنی محبتوں سے میلوں دُور لے گیا۔

اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس لڑکی کی محبت سانس بن کر اُس کے اندر بسی ہے، وہ سات سال تک اُس کا حال ہی نہیں جان سکے گا۔ اُسے بتا بھی نہیں سکے گا کہ اُس پر کیا بیتی ہے؟

ایڈمیشن ٹیسٹ کے بعد (Issb) انٹر سروس سلیکشن بورڈ سے ایم پی ایس کرنے کے دوران وہ پابندی سے اُسے خط لکھتا رہتا تھا۔ کچھ تو قسمت کی مہربانی اور کچھ دوست کے والد کی سفارش نے اُسے

CMI کراچی سے بھی کامیاب کر دیا تھا۔ کامیابی کی طرف پر بڑھتا قدم اُس کے حوصلوں کو مزید پختگی دے رہا تھا۔

اپنی محبت کو بہتر سے بہتر زندگی دینے کے جنون میں اُس نے دِن کا چین اور رات کا آرام خود پر حرام کر لیا تھا۔ P.A.F رسالپور میں تین سال کی ٹریننگ کے دوران زندگی نے اچانک رُخ بدلا تھا اور وہ جیسے ڈگمگا کر رہ گیا۔

اُسے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اُس کے سر راؤ سکندر حیات کی اکلوتی بیٹی ماہین اچانک اُس پر فدا ہو جائے گی۔ نازیہ کے سوا اُس نے کبھی کسی لڑکی کا تصور بھی قریب آنے نہیں دیا تھا۔ سکندر صاحب کے گھر آمد پر بھی وہ اُن کی بیٹی کو یکسر نظر انداز ہی کرتا رہا تھا، لیکن اِس کے باوجود نجانے اُس کی کون سی اداء اُس کے دِل کو بھا گئی تھی اور وہ اُسے پانے کیلئے مرنے مارنے پر تُل گئی۔

اُس روز شاید اُس کی قسمت ہی خراب تھی، سکندر صاحب اور اُن کی وائف گھر پر نہیں تھے، مگر وہ اِس بات سے لاعلم تھا۔ تبھی ضروری کام کے سلسلے میں بے دھڑک چلا آیا۔ باہر موسم کے تیور بھی خطرناک تھے۔ ماہین لاؤنج میں ہی صوفے پر لیٹی کوئی مووی دیکھ رہی تھی، سلمان پر نگاہ پڑتے ہی اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک اُٹھی تھیں۔

اُس روز اُس نے سلمان کو زبردستی چائے کیلئے روک کر اُس پر اپنے شوریدہ جذبات کا اظہار کیا تھا، اُس نے اُسے بتایا تھا کہ اگر وہ اُس کا ہاتھ نہیں تھامے گا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائے گی، سلمان نے اُسے بتا دیا تھا کہ اُس کا دِل نازیہ شیرازی کی محبت کا پابند ہے، مگر وہ کچھ بھی سننے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

سلمان وہاں سے فرار چاہتا تھا، مگر ماہین کی جنون خیزی نے اُسے اُلجھا کر رکھ دیا، اور اُس کی بدقسمتی کہ عین اُسی وقت سکندر صاحب اور اُن کی بیگم وہاں آ گئے، یوں جو اُس نے سوچا بھی نہیں تھا، وہی اُس کے ساتھ ہو گیا تھا۔ ماہین اپنی ہوشیاری سے رو رو کر اپنے والدین کو یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ سلمان نے اُس کی تنہائی سے فائدہ اُٹھا کر اُس کی عزت پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

سکندر صاحب اپنی بیٹی کے منہ سے اِتنی بڑی بات سُن کر اُسے کسی طور معاف کرنے پر تیار نہیں تھے۔ صرف ماہین کی جذباتیت اور غلط بیانی کی وجہ سے اُس کا سارا کرئیر تباہ ہو کر رہ گیا تھا۔ سکندر صاحب نے اُس کی کوئی صفائی نہیں سنی اور اپنے اشتعال کی آگ کو کم کرنے کیلئے اُس پر کئی جھوٹے سچے کیس بنوا کر اُسے جیل کروا دی۔ آٹھ نو ماہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے کُڑھ کُڑھ کر گزارنے کے بعد وہ باہر نکلا تو اُس کا حال نہایت قابلِ رحم تھا۔ واپس اپنے شہر پلٹ جانا اُسے کسی طور پر گوارہ نہیں تھا، کیونکہ جس وقت وہ گھر سے رخصت ہو رہا تھا اُس وقت بھابھی نے کیا کچھ نہیں کہا تھا اُس سے، اُن کو پکا یقین تھا کہ وہ ناکام ہو کر پھر اُسی دہلیز پر آئے گا اور بلا آخر اُسے اُنہی کی چھوٹی بہن سے شادی کرنا پڑے گی، مگر سلمان نے جیسے خود سے ضد باندھ لی تھی کہ چاہے اب کچھ بھی ہو جائے وہ دوبارہ پلٹ کر اُس گھر میں کبھی نہیں جائے گا، جہاں

اُسے اذیتوں کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔

حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ وہ چاہ کر بھی نازیہ شیرازی سے رابطہ نہیں کر پایا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد کئی روز تک خوار ہوا' پھر قدرتی طور پر اُس کا باہر جانے کا چانس بن گیا۔ عارضی طور پر اُس نے جو فیکٹری جوائن کی تھی' اُس فیکٹری کے مالک نے اپنے بیس ورکرز کو دوبئی کی برانچ کو بھجوا دیئے' یوں اُس کی ملک سے باہر جانے کی خواہش پوری ہو گئی۔

دوبئی آنے کے بعد زندگی میں قدرے سکون در آیا تھا۔ یہاں اُسے راؤ فرمان علی نامی' ایک نہایت غمگسار دوست بھی میسر آ گیا تھا۔ پہلے پہل وہ محتاط ہی رہا تھا' مگر ایک ہی کمرے میں ایک ہی چھت تلے اکٹھے رہ کر ایک دوسرے سے بے نیاز رہنا ممکن نہیں تھا' لہٰذا اُس نے آہستہ آہستہ دِل کی باتیں فرمان علی سے شیئر کرنا شروع کر دیں۔

اُسے نازیہ شیرازی کو اپنی خیریت کی اطلاع دیئے پورا ڈیڑھ سال ہو گیا تھا' اِسی لئے پہلی فرصت میں خط لکھ کر فرمان کے حوالے دیا کہ وہ جلد سے جلد اُسے پوسٹ کر دے اُسی خط میں اُس نے اپنا فون نمبر بھی لکھا تھا' اور خود پر گزرنے والی مصیبتوں کا احوال بھی۔ مگر دو تین ماہ گزرنے کے باوجود نازیہ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ دِل کو مختلف وہم ستانے لگے۔ اُس کے سوا اب زندگی میں رہا بھی کیا تھا۔

عجیب بے بسی تھی کہ اُس کے گھر کے ایڈریس کے سوا اور کوئی رابطے کا ذریعہ اُس کے پاس نہیں تھا۔ تبھی اُس نے فوراً پاکستان واپسی کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے' مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آ سکا' کیونکہ کمپنی نے اُسے تین سال کے معاہدے پر دوبئی بھیجا تھا۔ ویزہ بھی اِسی معاہدے پر بنا تھا۔ تین سال سے قبل اُس کی پاکستان واپسی ممکن نہیں تھی۔ تب اُس نے دوبارہ نازیہ کے نام خط لکھا اور اِس خط کا جواب اُسے ٹھیک ایک ماہ کے بعد موصول ہو گیا تھا۔ یہ جواب بھی اُسے فرمان علی نے ہی لا کر دیا تھا' لفافے پر پاکستانی مہر صاف نہیں پڑھی جا رہی تھی۔ پھر بھی اُس نے بے تابی سے لفافہ چاک کر کے تحریر پر نگاہیں دوڑائیں تو اجنبی ہینڈ رائیٹنگ میں لکھا تھا۔

سلمان بھائی!

اُمید کرتی ہوں آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ آپ کے دو عدد خط موصول ہوئے۔ معذرت کہ بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے میں آپ کو پہلے خط کا جواب نہیں دے سکی۔ آپ نے دونوں خط نازی آپی کے نام لکھے ہیں وہ یہاں ہوتیں تو یقیناً آپ کو خود جواب دیتیں' مگر افسوس کہ اب وہ یہاں نہیں ہیں' ہم نے ڈیڑھ سال تک آپ کا انتظار کیا' مگر آپ کی طرف سے کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی' ابو آپی کے لئے بہت فکر مند رہنے لگے تھے۔ اِسی لئے اچھے رشتوں کو ہاتھ سے گنوانا مناسب نہ سمجھا اور ابھی تین ماہ پہلے اُن کی شادی کر دی۔ الحمدللہ اب وہ اپنے گھر میں خوش اور آباد ہیں' لہٰذا آپ بھی اُنہیں بھول کر کسی

ہاتھ تھام لیں۔ اُمید ہے اب آپ اُن کی زندگی میں اپنی وجہ سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کریں گے۔

ابو امی کی طرف سے پیار

(والسلام) آپ کی بہن صائمہ

خط پڑھ کر اُس کی آنکھوں کے سامنے یکلخت اندھیرا چھا گیا تھا۔ صدمہ ہی اِتنا بڑا تھا کہ وہ ت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

دوبارہ ہوش میں آیا تو جیسے دُنیا ہی اُجڑ چکی تھی۔ اُس کے اندر سے زندہ رہنے کی اُمنگ ہی ختم ہو چکی ۔ اِس صورتِ حال میں فرمان علی اور اُس کے گھر والوں نے اُس کا بہت خیال کیا تھا۔ باتوں باتوں ئی بار فرمان علی کی ماں نے اُسے اپنا بیٹا بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا' مگر...... اُس کا دل ہی مر چکا

ہفتوں ہفتوں آئینہ دیکھتا نہ کپڑے بدلتا' نازیہ شیرازی کی بے وفائی کے تصور نے اُس کی نیندیں لی تھیں۔ پوری پوری رات بستر پر کروٹیں بدلتے گزر جاتی۔ اُس نے شیو بھی بڑھا لی تھی۔ تنخواہ کے نے پیسے وہ Save کر لیتا۔ دوبئی میں تین سال پورے ہوئے تو وہ یورپ چلا آیا۔ یہاں اُسے جبار ی کی صورت اپنا بچھڑا ہوا یار دوبارہ مل گیا۔ جبار اور وہ کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ یہاں آسٹریلیا جبار نے اُس کا بہت ساتھ دیا' اُسی کے ساتھ مل کر سلمان نے اپنا چھوٹا سا ذاتی بزنس شروع کیا۔ رفتہ ذاتی محنت اور لگن سے اُس نے سڈنی میں اپنا ذاتی ریسٹورانٹ کھول لیا۔ گھر میں دولت کی ریل پیل ' کہیں کسی چیز کی کمی نہ رہی' مگر وہ چاہ کر بھی اُس لڑکی کو نہ بھلا سکا' جس کے حصول اور محبت کے لئے نے اپنی جدوجہد کا سفر شروع کیا تھا۔ جانے کب تک زندگی یونہی بیکار بے نام بسر ہوتی رہتی کہ ک اُسے یہ معلوم پڑ گیا کہ جو خطوط اُس نے نازیہ کے نام لکھ کر فرمان علی کو پوسٹ کرنے کے لئے ے تھے وہ خط تو کبھی پوسٹ ہی نہ ہو سکے تھے۔ فرمان علی کی بہن نے قطعی لاعلمی کے عالم میں خود وہ خط ا کے سپرد کئے تھے یہ کہتے ہوئے کہ اِن خطوط پر اُس کا نام لکھا ہے اور وہ کب سے اُنہیں سنبھال ال کر رکھ رہی ہے۔ تب دوسری بار اُس کے اندر سے کوئی طوفان اُٹھا تھا' جس کی شدت کا اندازہ تے ہوئے وہ فرمان علی سے ملے بغیر ہی واپس سڈنی چلا آیا تھا۔

جبار اُس کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے باخبر ہو چکا تھا' لہٰذا اُس کے ساتھ ہونے والے تقدیر اس عجیب و غریب مذاق پر بھی اُس نے اُس کی ڈھارس بندھائی تھی اور اُسے یہ باور کروا دیا تھا کہ اب ئے سالوں کے بعد اُس کا واپس پلٹنا کوئی معنی نہیں رکھتا' مگر سلمان نے اُس کی بات پر کان نہیں دھرے

اُس کے اندر کی خزاں نے یکلخت بہار کا روپ دھارا تھا۔

پھر سے زندگی نے اُس کے اندر انگڑائی لی تھی۔ اپنی محبت کی وفا کے یقین نے اُسے پھر سے بلند

حوصلہ کر دیا تھا۔ اُس کی آنکھیں پھر سے خواب بننے لگی تھیں۔

دِل کی دھڑکنوں میں پھر سے شوریدہ سری سر اُٹھانے لگی تھی۔ لب بے ساختہ ہی مسکرانے کو مچل اُٹھے تھے۔

یقین پھر سے زندہ ہو اُٹھا تھا۔

تبھی وہ ہر صورت پاکستان واپسی پر اُڑ گیا۔ اور اس صورتِ حال میں جبار نے اُسے تنہا چھوڑنا کسی طور پر مناسب نہ سمجھا' لہٰذا وہ خود بھی اُس کے ساتھ ہی پاکستان آمد کی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔

♦ ♦ ♦

سعدیہ کی اچانک گمشدگی پر غیاث صاحب کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ سونے پہ سہاگہ صبیحہ بیگم نے انہیں کئی جھوٹی سچی باتیں سنا کر مزید بھڑکا دیا تھا۔ عمران باتوں سے باخبر تھا' مگر غیاث صاحب نے قسم کھالی تھی کہ زندگی میں جب کبھی سعدیہ کا سامنا ان سے ہو گیا وہ اسے شوٹ کر ڈالیں گے۔

پنکی اپنی طرف سے عمر کا دل جیتنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی' مگر وہ سعدیہ کے کھو جانے کے بعد یوں اپنے آپ سے غافل ہوا تھا کہ اسے خود اپنے حال کی بھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ ان حالات میں اس نے صبیحہ بیگم کے کہنے پر اچانک اپنا پینترا بدلا تھا اور اس کی دلجوئی کرنا شروع کر دی تھی۔

وہ دن بھر سگریٹ پھونکتا' کاروبار کی طرف سے بھی اس کی توجہ ہٹ گئی تھی۔ ان دنوں اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے قطعی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ لہٰذا پنکی کے سہارے کی قدر کرتے ہوئے اس نے بالآخر اسی کے ساتھ شادی کر لی' مگر شادی کے بعد بھی وہ اپنے دل و دماغ سے سعدیہ کے تصور کو نکال نہیں پایا تھا۔ ایک عجیب سی چپ لگ گئی تھی اسے' جسے پنکی اپنی ہزار کوششوں کے بعد بھی توڑنے میں ناکام رہی تھی۔

بہت دیر کے بعد اس پر یہ عقدہ کھلا تھا کہ جس شخص کو اس نے اپنی ہوشیاری سے زبردستی حاصل کیا ہے' وہ شخص اس کے لئے محض ایک روبوٹ سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ' اس کی کمپنی میں ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا اور ایک عورت کے لئے بھلا اس سے بڑھ کر سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جسے حاصل کرنے کے لئے خود اپنا آپ مٹانے سے بھی دریغ نہ کرے' وہ ہستی اس کے پاس آنے پر صرف ایک ''سراب'' ثابت ہو۔

وہ روتی تھی' اس پر غصے ہوتی تھی' بے وجہ چیخ چلا کر اسے ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرتی تھی' مگر اس کی کسی حرکت کا کوئی نوٹس نہیں لیتا تھا۔ اسے قطعی پروا نہیں ہوتی تھی کہ پنکی نے کھانا کھایا ہے یا نہیں؟ رات میں سوتی ہے یا نہیں؟ اپنے ہی حال میں مست وہ اپنے شاندار بزنس کو اتنا ڈاؤن کر چکا تھا کہ قرض خواہ اسے تلاش کرتے پھرتے تھے۔

پنکی کو اس صورت حال نے ذہنی طور پر اتنا مفلوج کیا کہ اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے

ادھر غیاث صاحب کی صحت ڈاؤن ہو چکی تھی کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ صبیحہ بیگم تقدیر کی طرف سے آزمائشوں میں گھریں تو انہیں احساس ہوا کہ اوپر آسمان پر جو خدا بیٹھا ہے' وہ جب اپنی رسی تنگ کرنے پر آتا ہے تو انسان کے پاس سنبھل کر کھڑے ہونے کا موقع بھی نہیں رہتا۔ اب انہیں سعدیہ پر ڈھائے جانے والے اپنے مظالم یاد آتے تھے۔ بے شک خدا نے اپنے بندوں سے بہتر انصاف کا وعدہ کر رکھا ہے اور بے شک وہ سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔

غیاث صاحب بھی ان کی زبانی تمام سچائی سن کر اصل حقیقت سے باخبر ہو چکے تھے۔ حقیقی معنوں میں اب انہیں بھی اپنے ہر عمل پر شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ جو سلوک انہوں نے اپنی پہلی بیوی اور بیٹی سے روا رکھا تھا' بے شک وہ انسانیت کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔

اب انہیں ہر پل اسی بات کا خوف ستاتا رہتا تھا کہ اگر کسی بھی وقت ان کی ڈیتھ ہو گئی' تو وہ خدا کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے۔ انہیں بار بار اللہ کا یہ ارشاد بھی یاد آتا تھا جس میں اللہ بزرگ و برتر نے فرمایا تھا۔

''بے شک اللہ چاہے گا تو کسی بھی انسان کو اپنے حقوق معاف کر دے گا۔ مگر اپنے بندوں کے حقوق ہرگز اس وقت تک معاف نہیں کرے گا جب تک وہ بندہ خود اپنے حقوق معاف نہ کر دے۔''

زندگی کی بساط پر وہ خود کو ایک اچھا اور کامیاب انسان ہی ثابت کر سکے تھے' نہ اچھا شوہر اور اچھا باپ ہونے کے فرائض نبھائے تھے' نتیجتاً دن بدن ان کی حالت پہلے سے خراب ہوتی جا رہی تھی۔ مسلسل بیمار رہنے سے مالی طور پر ان کی پوزیشن بھی بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ دوسری طرف سعدیہ ڈاکٹر کاشف سمیر کی اچھی عادات اور عمدہ اخلاق سے متاثر ہو کر پھر سے زندگی کی طرف واپس پلٹ آئی تھی۔

کاشف سمیر کے کمرے کی صفائی کرنا' اس کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو سنبھال کر رکھنا' ماں جی کو اپنی ماں سمجھ کر ان کی خدمت کرنا اس نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اس کی سادگی اور خدمت گزاری کی اچھی عادات نے ہی کاشف کے دل میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ سعدیہ سے پہلے اسے کوئی لڑکی اپنی رفاقت کے قابل نہیں لگی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے ماں جی سے اپنے دل کی بات کہنے میں قطعی دیر نہیں لگائی تھی۔ سعدیہ ڈاکٹر کاشف کی رفاقت کو اپنے لئے اعزاز سمجھتی تھی' مگر زندگی کا اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے اسے اپنے ماں باپ کی بہت یاد آ رہی تھی۔ بہت روئی تھی وہ اپنی حیثیت بدل جانے پر' سعدیہ غیاث سے' سعدیہ کاشف ہوتے ہوئے اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ عمر عباس نقوی بھی بہت یاد آیا تھا۔

مگر اپنی پچھلی زندگی کو دفن کرنے کے بعد اس نے دل سے ڈاکٹر کاشف سمیر کا ہاتھ تھاما تھا اور پھر زندگی جیسے اس پر اپنی بہاریں نچھاور کرتی چلی گئی تھی۔

شادی کے دوسرے ہی سال اللہ کی پاک ذات نے اس کا دامن دو پیارے پیارے جڑواں بچوں

سے بھر دیا تو گویا وہ مکمل طور پر اپنی نئی زندگی میں محو ہوتی چلی گئی۔

آج کاشف ایک کامیاب ڈاکٹر تھا تو وہ ایک کامیاب ڈاکٹر کی باسلیقہ بیوی تھی۔ جو نا صرف اس کے گھر اور بچوں کی عمدگی سے سنبھال رہی تھی، بلکہ بزنس کی دنیا میں بھی اس کا اپنا ایک نام تھا۔ بے شک آج اس نے اپنی ماں کے خوابوں کو پورا کر دیا تھا، مگر پھر بھی دل مکمل طور پر پرسکون نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک روز اپنی ایک دوست کی معرفت اسے اپنے گھر والوں کی زبوں حالی کا علم ہوا تو وہ خود پر مزید بندھ نہ باندھ سکی اور سیدھی عمر عباس نقوی کے گھر چلی آئی، جو اپنے زوال کی وجہ سے سب رشتہ داروں سے بھی الگ ہو چکا تھا۔

اسے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنے عرصے کے بعد بھی اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکے گی۔ وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی جب کہ عمر گھر سے باہر نکل رہا تھا ان دونوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو جیسے وقت کی گردش بھی تھم گئی تھی۔

ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس، بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا، وہ اس کے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ گزرے ہوئے ہر لمحے کی دھول اس کی آنکھوں میں اڑتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

اس ایک لمحے میں سنعیہ کاشف پر یہ انکشاف ہوا تھا۔ کہ اس نے کیا کھو دیا ہے۔

''عمر!''

سہمی ہوئی ہرنی کی مانند پھیلی نگاہوں میں درد سموئے، کپکپاتے لبوں سے اس نے پکارا تھا، جب اس کا سکوت ٹوٹا تھا، کچھ گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے بھی پھسل کر گریبان میں جذب ہوئے تھے۔

''تم کہاں چلی گئی تھیں سنی؟'' درد سے چور لہجے میں پوچھتے ہوئے وہ ہلکے سے سسکا تھا۔

''کہاں کھو گئیں تھیں، کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمہیں، دیکھو تمہارے فراق میں کیا سے کیا ہو کر رہ گیا ہوں میں۔''

اس لمحے اس کے چہرے پر اضطراب بکھرا تھا، تاہم اس سے پہلے کہ سنعیہ جواب میں کچھ کہتی، پنکی وہیں گیٹ پر چلی آئی۔ عمر عباس نقوی کی مانند وہ بھی اپنا حسن اور جاذبیت کھو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی ایک لمبے عرصے کے بعد سنعیہ کو اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا سارا غرور و طنطنہ جاتا رہا تھا۔

اب وہ بھی رو رہی تھی، تبھی سنعیہ نے آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں چھپا لیا تھا۔ وہ لمحے جو گزر چکے تھے۔ اب ان بیتے ہوئے لمحوں کے افسوس میں اپنے موجود لمحوں کو افسردہ کرنا دانشمندی کا تقاضا نہیں تھا۔ لہٰذا سنعیہ نے اپنا دل مضبوط کرتے ہوئے اپنی تمام کہانی عمر اور پنکی کے گوش گزار کر دی تھی۔ پنکی اس کی خوش نصیبی پر مسرور تھی، لیکن عمر کا دل اس کے پرائے ہو جانے پر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اسے اب تک یہی اُمید تھی کہ وہ اس کی زندگی میں پھر سے لوٹ آئے گی، لیکن یہ امید بھی اب خاک میں مل گئی تھی۔

سنعیہ کو اسے سمجھانے اور زندگی کی طرف واپس لوٹنے پر مجبور کرنے کے لئے، بہت دن لگے تھے۔ یگم اور غیاث صاحب نے بھی اس سے معافی مانگ لی تھی۔ لہٰذا اب وہ نا صرف ان کی بھی خدمت کر ی بلکہ اس نے عمر کو بھی اپنا بزنس پارٹنر بنا کر اس کی ڈوبی ہوئی ساکھ بھی بحال کر دی تھی۔ گو وہ اب بھی سے محبت کا دعویٰ دار تھا۔ لیکن اب سنعیہ کے سمجھانے پر اس نے پنکی کے ساتھ نارمل طریقے سے رہنا ع کر دیا تھا۔ اس کے اچھے اوصاف کی وجہ سے بھی اس کے قدردان ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر کاشف سمیر جو خود بھی حقیقی بیٹوں کی طرح غیاث صاحب اور صبیحہ بیگم کی دیکھ بھال کر رہا تھا وش بختی پر جس قدر بھی ناز کرتا کم تھا کہ اسے سنعیہ جیسی اچھی لڑکی کا ساتھ زندگی بھر کے لئے نصیب ا۔

بے شک محبت اپنی پہچان خود کرواتی ہے۔ اس کے دل میں بھی سنعیہ غیاث کی محبت اپنا مضبوط قائم کر چکی تھی اور اب اسے تا زندگی محبت کے اس خوبصورت حصار میں مقید رہنا تھا۔

♦ ♦ ♦

یہ کیسی رت ہے......؟
کہ آنگن میں تو پھول کھلے ہیں مگر نگاہوں میں
پچھلے موسم کے خشک پتے بکھر رہے ہیں
گلاب چاروں طرف کھلے ہیں
مگر دریچوں میں جانے والوں کی راہ دیکھتے اداس چہرے
خزاں کی دہلیز پر کھڑے ہیں
بچھڑنے والوں کی یاد کانوں میں لڑکھڑاتی ہوئی صداؤں کے جال بنتی ہے
آس چنتی ہے
یہ کیسی رت ہے......؟
کہ بہار آ کر کھلے کواڑوں کو کھٹکھٹاتی ہے
بے دلی کی ہوا دریچوں میں سرسراتی ہے
اور پیلے گلاب آنگن میں کھل رہے ہیں
یہ کیسی رت ہے......؟
کہ پانیوں میں تمام منظر گھرے ہوئے ہیں
مگر نگاہوں میں پیاس لکھی ہے

ثمرن ازہان، اسفند شیرازی کے نام سے منسوب ہو کر اس کی زندگی میں آئی، تو اسے اس حقیقت کا چلا کہ اسفند شیرازی کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے۔

شادی کی پہلی ہی رات میں اسفند نے اسے بتادیا تھا کہ جولڑکی انجانے میں اس کے ظلم کا شکار ہوئی تھی۔ اس لڑکی کا تصور اور یادیں اس کی پوری زندگی پر محیط ہیں۔ وہ اسے اپنی حقیقت بتانا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ جس لڑکی کو اپنی یادوں سے فراموش کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ وہ لڑکی وہی ہے' مگر جانے کیوں وہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات اسے بتا نہیں سکی تھی۔ اسفند شیرازی کی زندگی میں آنے کے بعد ایک اور بات کا پتہ چلا تھا اسے اور وہ یہ کہ اسے گھر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس صورت حال نے اس کا دل اسفند شیرازی کے معاملے میں مزید نرم کر دیا تھا۔

پھر دادی ماں کی زبانی جب اسے اسفند کے بارے میں مزید جاننے کا موقع ملا تو اس کا دل خود بخو اس کی طرف جھکتا چلا گیا اسے خبر بھی نہ ہو سکی اور وہ اس کے حواس پر چھاتا چلا گیا۔ شہروز کا تصور اس سے جدائی کا دکھ' اس کی یادیں تو بہت پیچھے کہیں رہ گئی تھیں' تبھی وہ اپنے دل کی بے ایمانی پر از حد حیران تھی۔ شادی سے لے کر اب تک اس نے اسفند کے ساتھ اجنبی برتاؤ رکھا تھا۔ ضرورت محسوس ہوتی تو بات کر لیتی وگرنہ خود کو مصروف ہی رکھتی' اسفند کو اس کا رویہ بہت محسوس ہوتا تھا' مگر اپنی نرم مزاجی کے سبب یہاں بھی اس نے اپنے نصیب کے لکھے پر اکتفا کیا تھا۔

اکثر اس کا آؤٹنگ کا موڈ ہوتا' مگر ثمرن سر درد کا بہانہ کر کے فوراً اسے مایوس کرتی۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنے کپڑے خود پریس کرتا تھا۔ خود اپنے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔ ثمرن کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اسے اپنے آپ میں مست رہنا ہی اچھا لگتا تھا۔ تاہم اب ایسا نہیں تھا۔

اب وہ صبح نماز کے لئے اٹھتی تو اسے بھی ضرور جگاتی تھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ اس کے کپڑے پریس کرتی' پھر ضرورت کی تمام اشیاء ٹیبل پر رکھ کر وہ کمرے سے نکل آتی تھی۔

صبح سب کے لئے الگ الگ سب کی پسند کا ناشتہ بنانا بھی اس نے اپنی روٹین بنالی تھی' اسفند کے آفس جانے کے بعد وہ اپنے کمرے کی ڈسٹنگ کرتی' تب تک صفائی والی آجاتی تھی۔ اس سے کام بھی وہ اپنی نگرانی میں کرواتی تھی اس سے فارغ ہو کر وہ دادی ماں کی طرف آجاتی اور گھنٹوں ان کے پاس بیٹھ کر اسفند کے بچپن اور جوانی کی دلچسپ باتیں سنتی رہتی۔

اسفند اس کے یوں ایک دم سے اچانک بدل جانے پر دل ہی دل میں حیران بھی تھا اور مسرور بھی مگر اس نے ثمرن پر کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔

کبھی کبھی جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ثمرن وہی لڑکی ہے جسے وہ آج بھی دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے اور پھر بہت جلد یہ ثابت بھی ہو گیا۔

شاہ ولا سے ثمرن کے ڈیڈ شہردل نواز' شادی کے بعد پہلی بار اس سے ملنے آئے تھے۔ ثمرن کی شادی پر' وہ ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہونے کی وجہ سے نہیں آپائے تھے' تاہم کچھ روز قبل ہی وہ اپنی سیکنڈ وائف بیٹے کے ہمراہ' پاکستان آئے تھے۔ ثمرن مختصر قیام کے لئے ان سے ملنے شاہ ولا بھی گئی تھی' اس وقت

ن کے بیڈروم میں بیٹھے اس سے بات کر رہے تھے اور اسفند اتفاق سے ناسازی طبیعت کے باعث ں سے گھر آگیا تھا۔

اگر اسے پہلے سے شہردل صاحب کی آمد کے متعلق پتہ ہوتا' تو شاید وہ سیدھا کمرے میں جا کر ان کو ام کرتا تاہم اس وقت لابی سے گزرتے ہوئے ان کی جو بات اس نے سنی تھی' اس بات نے اسے وہیں ٹھک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ ثمرن سے کہہ رہے تھے۔

''شہروز اپنے گھر کا بچہ تھا ثمی' پھر دل سے پیار بھی کرتا تھا تمہیں' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے فند کو اس پر ترجیح کیوں دی؟ تمہاری شادی کے بعد بہت بکھر کر رہ گیا ہے وہ جب کہ بھائی صاحب بھی ہارے اس فیصلے پر مجھ سے اور تم سے کچھ خاص خوش نہیں ہیں۔''

''میں جانتی ہوں پاپا'' کچھ ہی دیر کے بعد اس نے ثمرن ازہان کو کہتے ہوئے سنا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ شہروز مجھ سے محبت کرتا ہے اور شاید مجھ سے شادی کرنے کا ارادہ بھی ہو اس کا ر' اس کی محبت مجھ سے میری خودداری اور عزت نفس کی قربانی مانگتی تھی پاپا' میں نے خود احتشام بھیا سے ے کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ تب تک مجھ سے شادی نہیں کرے گا جب تک میں خود اس سے اپنے پیار کا ہار نہیں کروں گی' آپ ہی بتائیے پاپا کیا اسے پانے کے لئے میں اپنی خودداری کا خون کر دیتی۔''

شیر دل صاحب کے لئے یہ انکشاف قطعی غیر متوقع تھا' تبھی وہ کچھ پل خاموش رہنے کے بعد لے تھے۔

''لیکن اسفند نے بھی تو تمہارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا' اس نے بھی تو گہری چوٹ پہنچائی تھی نہیں بے قصور ہوتے ہوئے بھی تم اس کے ظلم کا شکار ہوئی تھیں' پھر اسے اتنی جلدی کیوں معاف کر دیا تم نے۔''

''کیونکہ اس نے جو کچھ بھی میرے ساتھ کیا وہ نادانستگی میں ہوا تھا پاپا' اسفند آج بھی اپنے کئے پشیمان ہے جو پیار شادی کے بعد مجھے اسفند اور اس کے گھر والوں سے ملا ہے۔ اس پیار کے صدقے یں نے اس کا قصور معاف کر دیا ہے پاپا' اب میرا گھر اس کے دم سے ہی میری جنت ہے۔'' جو کچھ وہ پنے کانوں سے سن چکا تھا' وہ سب جاننے کے بعد خود اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ ہٰذا الٹے پاؤں واپس پلٹ کر وہ پھر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل و دماغ میں جیسے عجیب سا بھونچال آ گیا تھا۔ رات اس کی واپسی بھی خاصی لیٹ ہوئی تھی۔

ثمرن کو اس کے تیور کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ آفس سے آتے ہی وہ بنا اس سے کوئی بات بستر پر لیٹ گیا تھا' تبھی وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

''اسفند' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

مگر اسفند نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔ تب ہی وہ متفکر ہو

کراس کے قریب آئی تھی۔

''اسفند میں نے کچھ پوچھا ہے۔''

کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ اسفند شیرازی کی پیشانی پر دھر دیا تھا۔

''تمہیں میرے لئے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اجنبیت سے اس کا ہاتھ پرے جھٹکتے ہوئے اس نے رُخ پھیر لیا تھا۔

''ہوا کیا ہے' کیا آپ مجھے کچھ بتائیں گے۔''

اس لمحے وہ از حد متفکر ہوئی تھی' تبھی وہ بھی زیادہ دیر اس سے کچھ نہیں چھپا سکا تھا۔

''کیوں کچھ بتاؤں تمہیں؟ کیا تم نے کبھی مجھے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شادی سے پہلے تم ا کسی کزن کے ساتھ انوالو تھیں' کیا تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم وہی لڑکی ہو' جس کی محبت کے جوگ میں' پورے سات سال سے تڑپ رہا ہوں' میری بے بسی کا تماشہ دیکھنا چاہتی ہو تم' تو دیکھو تماشہ' میں ہوں اس قابل کہ سب میری بے بسی کا تماشہ دیکھیں' اور مجھے کبھی کسی کی سچی رفاقت نہ ملے۔'' اور اس کے میں ہلکی سی نمی اُتر آئی تھی۔

اس لمحے ثمرن ازہان کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ بھر آئی آنکھوں سے اس طرف دیکھتی ہوئی وہ اس کے قریب چلی آئی تھی۔

''آپ غلط سوچ رہے ہیں اسفند۔''

''کیا غلط سوچ رہا ہوں میں' یہ کہ تمہارے کزن کے ساتھ تمہاری کمٹ منٹ تھی' یا یہ کہ تم نے مجھ پر ترس کھا کر مجھ سے شادی کی حامی بھری تھی۔''

اب کے وہ ہلکا سا مشتعل ہوا تھا۔ جواب میں وہ سکون سے سرد آہ بھرتے ہوئے بولی تھی۔

''دونوں باتیں ہی غلط سوچ رہے ہیں آپ؟''

''اوکے تو پھر سچ کیا ہے؟''

اس کے اندر کا غبار کسی طور سے کم نہیں ہو رہا تھا۔ بے شک ثمرن ازہان نے پہلی بار اسے اس رو میں دیکھا تھا۔ تبھی وہ اس کے پاس اٹھ کر کھڑکی کے قریب چلی آئی تھی۔

''اس سچ کی کہانی بہت طویل ہے اسفند یہ سچ ہے کہ میں اپنے کزن شہروز کو پسند کرتی تھی' کیونکہ کی ڈیتھ کے بعد وہ واحد بندہ تھا جو مجھے واپس زندگی کی طرف لایا تھا' بہت خواب دیکھے تھے میں نے ا کے حوالے سے' مگر اس کی بے معنی ضد اور انا نے وہ سارے خواب چکنا چور کر دیئے' وہ مجھے زندگی بھر کا اور ساتھ' میری خودداری کے عوض دے رہا تھا' لیکن مجھے یہ سودا منظور نہیں تھا' سو میں نے اس کے خواب اپنی آنکھوں سے نکال پھینکا اس کے لئے مجھے آپ کا ساتھ ہر قیمت پر مقصود نہیں تھا نہ ہی میرے دل آپ کے لئے کوئی اچھا مقام تھا' آپ سے میرا رشتہ میرا تعلق نفرت کا تھا۔ میں آپ سے اپنے اوپر ہو

والے ظلم کا بدلہ لینا چاہتی تھی اور اسی مقصد کے لئے آپ کی زندگی میں آئی تھی' لیکن......'' واپس پلٹ کر اسفند کے مرجھائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتی' وہ پھر اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

''لیکن آپ کے قریب رہ کر آپ کو جاننے اور پرکھنے کے بعد کب میرے دل کا موسم بدلا مجھے پتہ ہی نہیں چل سکا۔'' یکلخت ہی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

''آپ میں کس چیز کی کمی ہے اسفند' جو میں آپ پر ترس کھا کر آپ سے شادی کی حامی بھرتی' میں تو آپ کو ستانے کے لئے' پل پل اذیت دینے کا سوچ کر آپ کی زندگی کا حصہ بنی تھی' مگر آپ کی محبت اور اچھے اوصاف نے مجھے اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دیا' گھر والوں کا آپ کے ساتھ ناروا سلوک دیکھ کر' میرے دل میں آپ کی محبت جڑ پکڑتی چلی گئی اور اب یہ صورت حال ہے کہ میں آپ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

اسفند نے بغور اس کی ستارہ سی خوبصورت آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کو دیکھا تھا۔ اس لمحے اس کے دل کو بھی کچھ ہوا تھا' تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر ثمرن ازہان کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ لیا تھا۔

''مجھ سے کبھی دور مت جانا ثمرن' میں جی نہیں سکوں گا تمہارے بغیر۔''

برسوں سے دل میں چھپے احساسات کو بالآخر اظہار کا موقع مل گیا تھا۔ ثمرن کی دھڑکنیں اس ایک لمحے میں بری طرح انتشار کا شکار ہوئی تھیں۔

''میں نے بہت تنہائیاں جھیلی ہیں ثمی' مما کے بعد سوائے دادو کے اور کسی کو میری پروا نہیں رہی' جو کچھ نادانستگی میں' میں نے تمہارے ساتھ کیا' میں اس پر آج بھی دل سے شرمندہ ہوں' جو چاہو مجھے سزا دے لو' مگر پلیز اب مجھ سے دور مت جانا' کہیں مت جانا پلیز۔''

متاع حیات کی مانند اسے خود میں سموئے وہ التجا کر رہا تھا اور ثمرن ازہان کی زندگی کا ہر دکھ جیسے ان چند لمحوں میں تحلیل ہو کر مٹتا چلا گیا تھا۔

اسفند شیرازی کی مضبوط بانہوں میں مقید' وہ اُس کی محبتیں فیاضی سے وصول کرتے ہوئے اُس سے وہ سارے پیمان باندھ رہی تھی' جو آنے والے دِنوں میں نہ صرف اسفند شیرازی کی ساری محرومیوں کا ازالہ کر سکتے تھے' بلکہ خود ثمرن ازہان کے لئے بھی دائمی خوشیوں کا باعث بن سکتے تھے۔

♦ ♦ ♦

کبھی جو ہم نہیں ہوں گے
کہو کس کو بتاؤ گے
وہ اپنی اُلجھنیں ساری' وہ بے چینی میں ڈوبے پل
وہ آنکھوں میں چھپے آنسو
کسے پھر تم دِکھاؤ گے؟

کبھی جو ہم نہیں ہوں گے
بہت بے چین ہو گے تم' بہت تنہا رہ جاؤ گے
ابھی بھی تم نہیں سمجھے' ہماری ان کہی باتیں
مگر جب یاد آئیں گی' بہت تم کو رُلائیں گی
بہت چاہو گے لیکن تم
ہمیں نہ بھول پاؤ گے
کبھی جو ہم نہیں ہوں گے' کبھی جو ہم نہیں ہوں گے!

موسم میں خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔

شام کے سائے قدرے گہرے ہوتے ہی ٹھنڈی ہواؤں کے جھلکو جسم میں کپکپی دوڑا دیتے۔ دادا جی سے حسب معمول ڈھیروں باتیں کرنے کے بعد اُس نے دادی ماں کے کمرے میں آ کر اُن کا کمبل درست کیا' پھر اُن کے گال پر آہستہ سے پیار کرنے کے بعد جونہی وہ اُن کے کمرے سے باہر نکلی' نظر بے ساختہ ازہان کے کمرے کی طرف اُٹھ گئی جہاں جلتی لائیٹ اِس بات کا ثبوت تھی کہ وہ ابھی تک جاگ رہا ہے۔

تبھی اُس کے قدم کئی دِنوں کے بعد اُس کے کمرے کی طرف اُٹھے تھے۔

دروازہ لاک نہیں تھا لہٰذا ہلکے سے دھکیلتے ہی کھل گیا' ازہان سامنے ہی بیڈ پر کمبل لپیٹے پڑا تھا۔ کمرے کا حال خاصا ابتر ہو رہا تھا' کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے پڑی دیکھائی نہیں دے رہی تھی۔ خود وہ بڑے قابل رحم حلیے میں پڑا دیکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کیلئے سبرینہ کے دِل کو جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ اپنی غفلت اور دیگر اپنوں کی لاپرواہی پر وہ جتنا افسوس کرتی کم تھا۔

ملے ہوئے رف کپڑوں میں' بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا اور اُس کی سانس سینے میں دُھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ بار بار خشک لبوں پر زبان پھیرتا وہ اُسے بہت تکلیف میں دیکھائی دے رہا تھا۔

تب اُس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کی جلتی پیشانی پر رکھا تو ازہان نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔

''ازہان...... آئی ایم سوری......''

ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھے اُس نے بھرائے لہجے میں کہا تو ازہان نے پھر سے پلکیں موند لیں۔ تب وہ اُس کے پاس سے اُٹھ کر کچن میں آئی' ایک گلاس میں دُودھ گرم کیا' پھر دوسرے برتن میں پانی ڈال اپنے ڈوپٹے سے دو پٹیاں بنائیں اور واپس اُس کے کمرے میں چلی آئی۔

دودھ کے گلاس کے ساتھ ہی اُس نے بخار کی ٹیبلٹ بھی رکھ لی تھی۔

''ازہان......''

دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اُس نے آہستہ سے اُسے پکارا تو ازہان نے پھر سے آنکھیں کھول

''یہ دواء لے لو' اتنا تیز بخار تھا آپ کو' مجھے بتایا ہی نہیں کسی نے......''

''مجھے نہیں چاہئے کوئی دواء' پلیز جاؤ یہاں سے۔''

وہ اُس کے تصور سے بھی بچنا چاہتا تھا۔ مگر یہ لڑکی اُسے ہر صورت جکڑ لینے پر بضد ہو گئی تھی۔

''کیوں نہیں چاہئے' اپنا حال تو دیکھو' انتہائی تیز بخار ہے تمہیں......''

وہ زیادہ دیر تمیز کے دائرے میں نہیں رہ سکی تھی۔ ازہان نے اُس کے سامنے خود کو ایک مرتبہ پر قطعی بس پایا تھا۔

''چلو شاباش دواء لو' پھر ٹھنڈی پٹیاں رکھتی ہوں تمہاری پیشانی پر' تھوڑی ہی دیر میں انشاءاللہ سکون نیند آ جائے گی۔''

وہ یوں رُعب جما رہی تھی جیسے اُس پر نجانے کتنے حق رکھتی ہو۔ ازہان اِس لمحے اُس سے اُلجھنے کی یشن میں نہیں تھا لہٰذا چپ چاپ اُس کے ہاتھ سے دواء لے کر کھائی' ساتھ ہی دودھ بھی پی لیا۔

''اِس بُرے انسان کے ساتھ اِس درجہ ہمدردی کا مقصد......؟''

دودھ کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر سر تکیے پر ٹکاتے ہوئے اُس نے پوچھا تو سبرینہ اُسے دیکھ کر رہ گئی۔

''پلیز ازہان...... جو شخص ذرنشاء آفندی کی نظروں میں بُرا ہے' وہ سبرینہ احسان کی نگاہوں میں ہت اچھا ہے' کبھی جھانک کر تو دیکھو......''

''مجھ پر احسان مت کرو سبرینہ' پلیز......''

''محبت کرنے والے کبھی کسی پر احسان نہیں کیا کرتے......''

فقط چند دِنوں میں اُس کی شخصیت جیسے ٹھہر گئی تھی۔ ازہان نے اِس بار اُس سے کچھ بھی کہے بغیر چپ چاپ پلکیں موند لیں۔

اگلے روز وہ ابھی سو رہا تھا جب وہ دادا جی اور دادی ماں کو چائے دینے کے بعد اُس کے کمرے میں چلی آئی۔ رات جو کھلارا اُس نے وہاں دیکھا تھا اُسے ترتیب سے سمیٹا' ازہان کی وارڈ روب درست کی' رائیٹنگ ٹیبل پر بکھری کتابوں کو سمیٹ کر رکھا اِسی دوران ازہان کی پرسنل ڈائری اچانک نگاہوں کی زد میں آ گئی' تب اُس کی اُلجھی شخصیت کے بارے بہت کچھ جاننے کیلئے اُس نے وہ ڈائری اُٹھائی اور ایک نظر بے خبر سوئے ہوئے ازہان پر ڈالنے کے بعد وہ اُسی کی رائیٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر وہ ڈائری پڑھنے لگی' جس کے ابتدائی صفحے پر لکھی تحریر نے ہی اُس کا دماغ گھما ڈالا۔

''میں تم بن ہمیشہ ادھورہ رہوں گا کیفیہ......''

''کیفیہ...... یہ کیفیہ کون ہے......؟'' وہ بُری طرح اُلجھی تھی۔ اِسی اُلجھن میں اگلے چند صفحے پلٹے تو

جیسے تمام راز اُس پر ریشم کے تھان کی مانند کھلتے چلے گئے۔ ازہان نے خود اپنے ہاتھ سے رکھا تھا۔

"پہلی بار یونیورسٹی میں، میں نے اُسے دیکھا تھا، تب طبیعت میں لا اُبالی پن تھا، معلوم ہی نہ کہ ایک دن وہ خوشبو بن کر میری ذات پر چھا جائے گی، جانے کیوں اور کیسے میں اُس کی طرف کھنچتا تھا، اُس کی ہر ہر اداء مجھے اچھی لگتی تھی، میں جانتا ہوں پاپا نے میرے حوالے سے بہت کچھ سوچ ر مگر...... میں کیا کرتا، مجھے اُس کی صورت کے سواء کہیں بھی کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا، وہ ایک روز یونیور آتی تھی تو میری جان پر بن جاتی تھی، شاید یہ میری حد درجہ دیوانگی ہی تھی کہ پیپرز میں سوالات کے ج لکھنے کی بجائے، میں اُس کی تصویر بنا آیا، جس سے مجھے تو پاپا اور سر سے ڈانٹ پڑی ہی، ساتھ میں بدنام ہوگئی۔ اُس نے یونیورسٹی چھوڑ دی۔ اور میں اُس کی اِس حرکت پر جیسے پاگل ہو کر رہ گیا۔

میرے جنون سے ہار مان کر ممی پاپا اُس کے گھر میرا رشتہ لے کر گئے، مگر اُس کے گھر والوا میرے ممی پاپا کو بے عزت کر کے نکال دیا۔ اِس واقعے کے بعد حمدان اور سارہ نے مجھے سمجھانے کی کی تو میں اُن سے اُلجھ پڑا۔ حمدان پر تو ہاتھ بھی اُٹھا بیٹھا۔ نجانے کیا ہو گیا تھا مجھے، میرا بس نہ چلتا ساری دُنیا کو تہس نہس کر دُوں، میری حرکتوں کی وجہ سے ہی پاپا کو اٹیک ہوا اور یوں مما کا سہاگ اُج تب مجبوراً مجھے حویلی میں ڈیرا ڈالنا پڑا، جس کے سناٹوں نے میرے اندر وحشت کے در کھول دیئے۔

ذرنشاء آفندی سے میرا سامنا ہوا اور وہ مجھ پر مرمٹی۔ مگر...... میں کیفیہ کے سواء اور کسی لڑکی کا تصور کر گناہ سمجھتا تھا۔ شاید تبھی وہ میری دُشمن ہوگئی اور اُس نے مجھ پر اپنی آبروریزی کا جھوٹا الزام دھر کر اپنے ہی گھر والوں کی نظروں سے گرا دیا۔ ذرنشاء کا باپ چونکہ نانا جی کا وفادار منشی رہا ہے، لٰہذا نانا ج دیگر گھر والوں نے میری ایک بھی سنے بغیر اُس ذلیل عورت کا نکاح مجھ سے پڑھوا دیا۔ یہ سب سمجھے شاید اِس طرح سے میں اپنی پہلی محبت کو بھول جاؤں گا، مگر...... یہ اِن کی بہت بڑی بھول ہے۔ اُسے زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھولوں، کتابی شکل کی وہ لڑکی کہیں بھی ہوئی میں ایک نہ ایک اُسے ضرور ڈھونڈ نکالوں گا، یہی میرا خود سے وعدہ ہے۔"

وہ پڑھتی جا رہی تھی اور اُس کے اندر جیسے عجیب سے سناٹے اترتے جا رہے تھے۔ باقی کی ڈائر ایسی کوئی تحریر اُسے نظر نہ آئی۔

ازہان نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اُس کے زرد چہرے پر نگاہ ڈالی، پھر کروٹ بدل کر سکون سو گیا۔

• • •

شام کے سائے جونہی قدرے گہرے ہوئے ٹھنڈی پُرنم ہواؤں کا سلسلہ پھر سے شروع گیا۔

اِس وقت صرف وہ ہی نہیں، آکاش پر چاند بھی تنہائی کا کرب جھیل رہا تھا۔

اپنے کمرے کی واحد کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگائے، دونوں بازو سینے پر باندھ، آج پہلی دفعہ اُسے س یاد آیا تھا، جس نے اُس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔

اُس وقت وہ صرف پندرہ سال کی تھی۔ کالج میں وہ اُس کا پہلا دِن تھا۔ بہت پُراعتماد ہو کر بھی کبھی ی اُسے اپنی زندگی میں ایک دوست کی کمی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ اُس وقت بھی وہ شدید بوریت شکار ہو رہی تھی کہ اچانک نظر کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے ایک خوبصورت سے اُداس چہرے پر جا پڑی، جو جانے ب سے اُسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سبرینہ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر پہلے مسکرایا پھر فوراً اُٹھ کر اُس کے قریب آ تھا۔

"ہیلو...... آئی ایم حدید، اینڈ یو......"

"سبرینہ...... سبرینہ احسان احمد......"

"اور اِس کا مطلب ہے آپ بھی مسلمان ہیں، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔"

"وائے ناٹ......"

اُسے لڑکوں کی کمپنی سے قطعی کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں صُوم وصلوٰۃ کی پابندی تھی، مگر گھر سے باہر کے معاملات وہ خود اعتمادی سے ہی نپٹاتی تھی۔

"میں نے فسٹ ٹائم کسی لڑکی کو اِس درجہ اُداس تنہا بیٹھے دیکھا ہے، کیا آپ مجھے اپنی پرابلم بتانا پسند فرمائیں گی......"

"نہیں......" اُس کے قطعی لہجے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"اوکے، ایز یو وِش، میں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں، نام تو آپ جان گئی ہیں، باقی اِسی کالج میں کامرس کا سٹوڈینٹ ہوں، پاپا پاکستانی تھے، جبکہ مما کرسچن ہیں، پاپا کی ڈیتھ کے بعد مما کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ اُن کے سیکنڈ ہسبینڈ بھی ہوتے ہیں ساتھ......"

سبرینہ اُس کے لہجے میں چھپی عجیب سی کسک کو بخوبی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ بھی اُس کی طرح اپنی ذات کی تنہائیوں کا شکار تھا، شاید تبھی اُن دونوں کی دوستی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی اُس کی خوبصورت اُداس آنکھوں میں دیکھتی، اُسے محرومیوں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کی گہری پرچھائیاں ملتیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں سبرینہ اُس پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگی تھی۔

حدید یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ گھر میں بھی اُس کے ساتھ ساتھ رہنے لگا تھا۔ احسان احمد صاحب اُسے بہت پسند کرتے تھے وہ خود بھی کبھی اُن کے ساتھ شطرنج کی بازی لگا کر بیٹھ جاتا تو کبھی گالف کھیلنے لگتا۔ سبرینہ اُس سے اپنا کوئی بھی دُکھ، کوئی بھی خوشی بلا جھجک شیئر کرنے لگی تھی۔

اُسے اُسے اپنے ساتھ گھماتا، پھراتا، شاپنگ کرواتا، دونوں کالج میں اکٹھے ہی پیدل واک کرتے ہوئے جاتے تھے، خلوص واپنائیت کا یہ تعلق، حدید کیلئے محبت میں کب ڈھلا اُسے قطعی خبر نہ ہو سکی۔ خبر ہوئی تو

اُس روز جب اُس نے ڈائمنڈ کی رنگ اُس کی نازک سی انگلی میں پہناتے ہوئے اُس پر اپنے جذبات عیاں کیے تھے۔

سبرینہ احسان نے اپنے والد کو محبت کی سزا کاٹتے ہوئے دیکھا تھا۔ لہٰذا اُس نے نہ صرف حدید کی رِنگ اپنی انگلی سے نکال کر اُسے واپس کر دی' بلکہ اُس سے دوستی کا تعلق بھی توڑ دیا۔ حدید اُس کی اِس زیادتی پر بہت مچلا تھا' اُس نے اُس کی بہت منت کی' معافیاں بھی مانگیں' بڑھی ہوئی شیو اور سوجھی ہوئی آنکھوں میں کرب کے لئے دِیوانوں کی طرح وہ اُس سے بات کرنے کو بے قرار رہتا' اُس سے اُس کی اِس درجہ سنگ دلی کا سبب پوچھتا مگر...... وہ اُسے کوئی جواب نہ دیتی۔

حقیقتاً اُسے لفظ محبت سے شدید نفرت محسوس ہوتی تھی۔

اُس کے اجنبی انداز نے اُس محبت سے گندھے لڑکے کو اس قدر ہرٹ کیا کہ پھر وہ اُسے کہیں دیکھائی ہی نہیں دیا۔ اُس سے بچھڑنے کے ساتھ ہی وہ کالج بھی چھوڑ گیا تھا۔ بہت دِنوں کے بعد' ایک روز احسان صاحب کا ماہانہ چیک اپ کروانے کے دوران اُس نے ہوسپٹل میں حدید کو دیکھا تھا۔ وہ شدید بیمار تھا' مگر سبرینہ اُس کے سامنے دانستہ نہیں گئی کہ کہیں وہ پھر سے خوش فہم ہو کر اُس سے کوئی اُمید نہ باندھ لے۔

اُسے یقین تھا کہ یورپ کے آزاد ماحول میں دِل کا لہو نچوڑتی حقیقی محبتیں پروان نہیں چڑھا کرتیں' لہٰذا حدید بھی چند روز اُس کی بے وفائی کا سوگ منانے کے بعد پھر سے زندگی کی طرف پلٹ آئے گا' مگر ایسا نہیں ہوا تھا' وہ جانے کیا کیا سوچتی رہ گئی تھی اور حدید صرف اُس سے ہی کیا اُس کی زندگی سے بھی روٹھ کر بہت دُور چلا گیا۔

تب اُس کی چیخیں' اُس کا پچھتاوا اور برستی نگاہیں بھی اُسے آنکھیں کھولنے پر مجبور نہ کر سکیں۔ کس قدر تکلیف دِہ لمحے تھے وہ بھی۔ سبرینہ کو خود اپنا آپ سنبھالنے میں کئی سال لگ گئے تھے۔

اور اب ایک مرتبہ پھر محبت اُس کے دِل کا لہو نچوڑ رہی تھی۔

ازہان کی ٹانگوں پر لگنے والے زخم شدید تھے' تاہم وہ مسیحا تھی اور اُسے اپنی مسیحائی سے اپنے پیاروں کی آنکھوں کے سمندر خشک کرنا تھے۔

♦♦♦

''دادا جی...... دیکھئے ناں' باہر لان میں وہ سب پھول پودے آپ کے بغیر کتنے اُداس ہیں' روز مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں آپ کو اُن کے پاس کیوں نہیں لے کر جاتی' اور میں روز اُن کو کوئی جواب نہیں دے پاتی......''

اُس روز وہ اُنہیں کھانا دینے آئی تو کہے بغیر نہ رہ سکی' جواب میں دادا جی محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئے۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ کسی کا سامنا بھی نہیں کر رہے تھے' اپنے آپ کو کمرے میں مقید کر کے اُنہوں

، جیسے ساری دُنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔ تاہم سبرینہ کی کوششوں سے اُس کی خوشی کے لئے اُس روز وہ رے سے باہر نکل آئے تھے۔

برسوں پہلے حادثے میں اُن کی ٹانگیں شدید متاثر ہوئی تھیں' تب سے ہی وہ وہیل چیئر کے محتاج ہو رہ گئے تھے۔

اُس روز صبح صبح سبرینہ اُن کی وہیل چیئر گھسیٹ کر اُنہیں اُن کے کمرے سے باہر لائی تو دادی ماں رحائقہ پھوپھو کے ساتھ ساتھ' حویلی کے ملازمین بھی حیران رہ گئے۔

''دیکھیں ناں دادا جی' آپ کے بغیر سبھی پھول پودے کتنے اُداس ہیں' اب آپ روز اُنہیں خود پنے ہاتھوں سے پانی دیا کریں گے' ٹھیک ہے ناں......''

اُن کی چیئر کو وہ سیدھی لان میں لے آئی تھی۔ دادا جی نے اُس کی فرمائش پر پھر مسرور ہوتے ہوئے ھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آج آپ ناشتہ بھی سب کے ساتھ مل کر کریں گے ناں......؟''

۔ لوہا گرم دیکھ کر وہ چوٹ لگاتی جا رہی تھی اور دادا جی کی ذات پر لگا سختی کا خول جیسے چٹختا جا رہا تھا۔

''ہاں......''

''تھینک یو' تھینک یو سو میچ مائی گریٹ گرینڈ پا......''

اِس وقت وہ حقیقی معنوں میں خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ دادا جی بھی پھول پودوں میں گھیر کر بہت خوش دیکھائی دے رہے تھے۔ اُنہیں یاد آ رہا تھا اُن کے بیٹے احسان احمد خان کو پھول پودوں سے کتنا پیار تھا۔ شاید تبھی وہ سبرینہ کو مطلع کرتے ہوئے بولے تھے۔

''سبی بیٹے......'' میرا بیٹا تھا ناں احسان' وہی اِس لان کا صحیح نگران تھا' بہت محبت تھی اُسے اِن پھول پودوں سے' بہت چھوٹا سا تھا وہ' صرف آٹھ سال کا' جب ایک روز گلاب کا پودہ لے کر بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔

''بابا جانی' مجھے پودہ لگانا سکھا دیں' مجھے پھول بہت پسند ہیں' میں ان سے باتیں کروں گا' کھیلوں گا۔''

اُن کے لب مسکرا رہے تھے مگر آنکھوں میں نمی تھی۔ خود سبرینہ کے لبوں پر اُداسی بکھر گئی تھی۔

''یہ سارے پھول پودے اُسی کے ہاتھ سے لگائے ہوئے ہیں' یہ سامنے جو عشق پیچاں کی بیل ہے۔ یہ بھی اُسی نے لگائی تھی' وہ جب بھی کوئی پودا لگاتا' پھر اُس پر پھل پھول لگتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا' سارے گھر میں اُڑتا پھرتا' حائقہ' بیہ' سب کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر لاتا اور بتاتا کہ یہ پودا اُس نے لگایا ہے۔ ہر روز تمہاری دادی ماں کو بھی زبردستی کھینچ لاتا تھا' لاکھ وہ سردی اور سر درد کا بہانہ کرتیں' مگر وہ ایک نہ سنتا' اُلٹا لیکچر سناتا اور بتاتا کہ صبح صبح پھول پودوں کے پاس بیٹھنے کے کتنے فوائد ہیں۔ وہ کیا گیا بیٹے' سارا گلشن ہی اجڑ

گیا‘ دِل کا بھی اور گھر کا بھی......''

بولتے بولتے وہ آخر میں آبدیدہ ہو گئے تو سبرینہ نے جلدی سے اپنے آنسو رگڑ ڈالے۔

''او...... یہ کیا دادا جی......؟ آپ پھر اُنہیں یاد کر کے رو پڑے‘ وہ بھی ایسے ہی روتے ہونگے آپ کو یاد کر کے‘ بلکہ بہت زیادہ پچھتاتے بھی ہونگے اور یہ دُعا کرتے ہونگے کہ آپ اُنہیں بلائیں‘ اب اگر آجائیں ناں تو اُن کی خوب پٹائی کیجئے گا......''

''وہ آئے تو سہی بیٹے‘ پتہ نہیں وہ کب آئے گا......''

بہت دھیمے لہجے میں اُنہوں نے کہا تھا۔ جواب میں وہ محض اپنے آنسو ضبط کر کے رہ گئی۔

اُس روز دادا جی نے سب کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا تھا۔ سناٹوں کے بوجھ تلے دبی حویلی میں پھر سے زندگی انگڑائی لینے لگی تھی۔ سب سبرینہ کے گن گانے لگے تھے۔ حویلی سے باہر بھی وہ گاؤں والوں کے دُکھ سکھ میں اُن کا ہاتھ بٹانے لگی تھی‘ پورے گاؤں میں اُس کی اچھائی‘ دردمندی اور خوش اخلاقی کے چرچے عام ہو رہے تھے۔

جو مقصد لے کر وہ یہاں آئی تھی وہ مقصد بالآخر پورا ہو گیا تھا۔

''دادا جی...... اب میں واپس اپنے دیس چلی جاؤں......؟''

اُسی روز شام میں اُس نے پوچھا تھا‘ جواب میں اُن کی آنکھوں کی روشنی جیسے پھر سے ماند پڑ گئی۔

''بولئے ناں دادا جی‘ کیا میں اپنے پاپا کے پاس واپس چلی جاؤں۔''

اُنہیں خاموش پا کر اُس نے پھر پوچھا تھا جب وہ خفگی سے چہرہ پھیرتے ہوئے بولے۔

''چلی جاؤ......''

''ارے...... کیا آپ کو میرے جانے سے دُکھ نہیں ہوگا......؟''

وہ اُن کے ساتھ بہت زیادہ فرینک ہو گئی تھی۔ دادا جی نے اِس بار دُکھ سے اُسے دیکھا تھا۔

''کہاں سے آئی تھیں تم......؟''

''میں...... آپ کے احسان احمد خان کے دیس سے......''

''واپس کیوں جانا چاہتی ہو......؟''

''واپس کون کافر جانا چاہتا ہے دادا جی‘ میں تو یونہی آپ کو تنگ کر رہی تھی‘ آیئے آپ کو ازہان کے کمرے میں لے چلتی ہوں......''

ایک مرتبہ پھر وہ اُنہیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتانا چاہتی تھی مگر...... ایک مرتبہ پھر ہمت نہیں کر پائی تھی۔

وہ سلسلے وہ شوق کی نسبت نہیں رہی
اب زندگی میں ہجر کی وحشت نہیں رہی

پھر یوں ہوا کہ کوئی شناسا نہیں رہا
پھر یوں ہوا کہ درد میں شدت نہیں رہی
اب کیا کسی کو چاہیں کہ ہم کو تو اِن دِنوں
خود اپنے آپ سے بھی محبت نہیں رہی

ازہان کے زخم تیزی سے ٹھیک ہو رہے تھے‘ مگر پھر بھی ابھی خود سے چل پانا اُس کے لئے ممکن نہیں

سبرینہ دادا جی کے ساتھ ساتھ اُس کا بھی بھرپور خیال رکھ رہی تھی۔

روزانہ اُسے خود ناشتہ کرواتی‘ وقت پر دواء کھلاتی‘ واش روم جانے میں مدد دیتی‘ کپڑے چینج کرنے ں ہیلپ (Help) کرواتی‘ اُس کے بال خود سنوارتی‘ لاکھ منع کرنے پر اُس کی شیو بھی کبھی کبھار خود ‘ذ رنشاء آتی تو زیادہ تر زخموں پر نمک پاشی ہی کر کے جاتی تھی۔

تفسیر عباس کے بارے میں اُس نے سنا تھا کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے‘ سارہ اب حویلی کا رُخ کرتی تھی کیونکہ اُس کی یونیورسٹی کھل گئی تھی۔ حمدان اپنی نئی نویلی بیگم کے ساتھ مستقل دوبئی شفٹ ہو ا۔

تھوڑے سے عرصے میں بہت زیادہ تبدیلیاں در آئی تھیں۔ اُس روز وہ ازہان کے کمرے میں آئی ں سے سیل فون پر بات کر رہا تھا۔

''یاد تو آتی ہے یار‘ مگر اب یہ یاد بھی ناسور بن کر دِل کو چاٹنے لگی ہے......''

اُس کا دِل دُکھا تھا‘ مگر وہ ازہان پر ظاہر کئے بغیر آگے بڑھ آئی تھی۔

''ازہان...... موسم اچھا ہو رہا ہے‘ باہر لان میں چلو گے......؟''

''نہیں......''

''کیوں......؟''

''بس یونہی‘ مجھے یہ موسم پسند نہیں ہے......''

''کیوں...... اِس موسم میں کوئی یاد آتا ہے کیا......؟''

''ہاں...... بہت شدت سے یاد آتی ہے وہ مجھے......''

اُس نے اعتراف کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ سبرینہ اُس کے یوں آسانی سے کھل جانے پر ہی تو رہ گئی تھی۔

''ازہان...... کیا تم اُس کے بارے میں مجھ سے کچھ ڈسکس کرنا پسند کرو گے......؟''

''ہاں...... کیا جاننا چاہتی ہو تم اُس کے بارے میں......؟''

''کچھ بھی‘ جو تم بتانا پسند کرو......''

وہ اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی اور ازہان اِس سے قطعی بے خبر نہیں رہ سکا تھا۔

''وہ بہت پیاری ہے سبرینہ' اُسے دیکھ کر میرے اندر زندگی کا احساس دوڑتا ہے' جب وہ نہیں آئی تھی تو زندگی کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوا تھا' اور اب......اب ایک ایک لمحہ اُس کے بغیر عذاب لگتا ہے۔''

''تو پھر ذرنشاء کے ساتھ تمہارا بی ہیویر اِتنا اچھا کیوں ہے......؟''

قدرے اُلجھ کر اُس نے پوچھا تھا' جب وہ ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔

''یہ بھی خود اذیتی کا ایک انداز ہے......''

''لیکن زندگی اِس طرح سے تو بسر نہیں ہو گی' تمہیں اپنے لئے کوئی حتمی فیصلہ تو کرنا ہی پ[ڑے] گا......''

''فیصلہ کر لیا ہے میں نے' اگلے چند روز میں ذرنشاء کو فارغ کر کے' میں اُسی کو اپنی زندگی میں [شامل] کر لوں گا' جو میری سانسوں میں بستی ہے......''

''لیکن......تم اُسے ڈھونڈو گے کہاں......؟''

قطعی بے ساختگی میں وہ کہہ تو بیٹھی تھی' مگر پھر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جانے پر زبان دا[نتوں] تلے دبالی۔

''آئی تھینک تم میری ڈائری پڑھ چکی ہو......''

''ہاں' آئی ایم سوری' اصل میں' میں تمہارے ہر کسی سے رُوڈ بی ہیویر کی وجہ جاننا چاہتی تھی' [اس] لئے......''

سر جھکا کر اُس نے اِتنی معصومیت سے اپنے جرم کا اعتراف کیا کہ ازہان مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ پچھلے دِنوں اِس لڑکی نے اُس کے اندر سکون درہم برہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ روز اُسے اپنی بانہوں کا سہارہ دے کر اُس کے کمرے سے باہر لانے میں مدد دیتی' تو اُس کی قربت دھڑکنوں [کو] اُتھل پتھل کر کے رکھ دیتی تھی۔

اُس روز ازہان نے اُس سے اپنی محبوبہ کے متعلق بہت ساری باتیں کی تھیں' جس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر ڈسٹرب ہو کر رہ گئی تھی۔

اگلے روز وہ حائقہ بیگم کے ساتھ ضد کر کے شہر چلی آئی۔ کیونکہ اب ازہان کے ساتھ ہنس ہنس [کر] اُس کی محبوبہ کی باتیں کرنا اُس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

گھر آ کر اُس نے حائقہ بیگم سے کہہ دیا تھا کہ بہت جلد وہ واپس لندن چلی جائے گی' تا کہ خود ا[پنے] پاپا کو وہاں لا سکے۔

حائقہ بیگم اُس کے جھوٹ اور کرب سے واقف نہیں تھیں' تبھی خاموش رہی تھیں۔ اگلے تین چا[ر]

ہفتے اُس نے وہیں شہر میں حائقہ بیگم اور سارہ کے ساتھ گزارے تھے۔

زندگی عجیب سی مشکل میں پھنس گئی تھی۔ وہ پاکستان سے جانا بھی نہیں چاہتی تھی اور وہاں رہنا بھی اُس کیلئے ممکن نہیں رہا تھا۔

دادا جی سے کئی روز تک اُس کی بات ہی نہیں ہو سکی تھی۔ حائقہ بیگم اکیلی ہی حویلی کا چکر لگا آتی تھیں۔

اُس روز بہت دِنوں کے بعد وہ حویلی واپس آئی تو ایک مرتبہ پھر وہاں سناٹوں نے اُس کا استقبال کیا۔ دادی ماں دادا جی' کوئی بھی تو دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبھی وہ ازہان کے کمرے کی طرف آئی تھی' مگر وہ بھی اپنے کمرے میں نہیں تھا' کہیں کوئی ملازم بھی دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈرائیور اُسے حویلی تک چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ حائقہ بیگم پچھلے ایک ہفتے سے حویلی میں ہی رُکی ہوئی تھیں' مگر اِس وقت وہ بھی کہیں دیکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تبھی وہ بے حد پریشان ہو کر ازہان کے کمرے سے واپسی کیلئے پلٹی تو وہ اچانک اندر آ گیا۔

گرے شلوار سوٹ میں ملبوس اُس کا سراپہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت دیکھائی دے رہا تھا۔ اِس وقت وہ اپنے پاؤں پر کھڑا مکمل صحت مند دیکھائی دے رہا تھا' تبھی وہ اُس کی طرف لپکی تھی۔

''ازہان......دادا جی' دادی ماں اور حائقہ پھوپھو کہاں ہیں......؟''

''کہیں نہیں' میری محبوبہ سے میری نسبت جوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں......''

سکون سے سینے پر بازو باندھتے ہوئے' اُس نے اطلاع فراہم کی تو اُس کا دِل پھر سے سکڑ گیا۔ لبوں پر چپ لگ گئی۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ تن کر کھڑا تھا' سبرینہ کے لئے کمرے سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔

''راستہ چھوڑو' مجھے دادا جی کے پاس جانا ہے......''

اُن کے پاس بعد میں جانا' پہلے یہ بتاؤ' تم نے مجھ سے یہ کیوں چھپایا کہ تم میرے احسن ماموں کی بیٹی ہو......''

جونہی اُس نے بارعب لہجے میں پوچھا سبرینہ کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی۔

''بے ایمان چالاک لڑکی' تمہیں اور کوئی نہیں ملا تھا بے وقوف بنانے کے لئے' بولو......''

اب کے اُس نے سبرینہ کو دونوں بازوؤں سے تھام کر جھنجوڑ ڈالا تھا' مگر وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی اپنے آنسو پیتی رہی تھی۔

''مما نہ بتاتیں تو شاید تمہاری چوری کا پول بھی کبھی نہ کھلتا......''

اُس کا لہجہ بارعب تھا سبرینہ اِس بار سر اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی!

''میں نے کوئی چوری نہیں کی......''

''اچھا' اور جو میری نیند کے دوران چپکے چپکے آ کر میرے کمرے کی تلاشی لیتی تھیں' وہ......''

''وہ......وہ تو میں صفائی کرنے آتی تھی' میرا یقین کرو......''

چند لمحوں میں وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ ازہان کو اُسے ستا کر مزہ آ رہا تھا۔ تبھی پھر سختی سے بولا۔

''واہ سبحان اللہ' صفائی کرنے آتی تھیں اور میری سب سے قیمتی چیز پر ہی ہاتھ صاف کر گئیں......''

''کیا چرایا ہے میں نے تمہارا......؟''

اب کے وہ اپنی آنکھوں کو بھیگنے سے نہیں روک سکی تھی۔ تب ازہان نے بڑے پیار سے اپنی انگلی کی پور پر اُس کے آنسو چنتے ہوئے کہا تھا۔

''میرا دِل......''

''وھاٹ......؟'' وہ چلائی تھی' جب وہ اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''آہستہ بولو چڑیل' ورنہ ابھی سب لوگ اِدھر آ جائیں گے......''

سبرینہ کیلئے یہ صورتِ حال بے حد حیران کن تھی۔ اُس کا دِل اِس لمحے بہت بُری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے......؟''

وہ واقعی بے ہوش ہونے کو تھی جب وہ مسکرا کر اُس کے گال چھوتے ہوئے بولا۔

''بہت جلدی ہے سب کچھ جاننے کی......؟ چلو آؤ تمہیں مختصر بتاتا ہوں کہ یہ سب کیا ہے......''

محبت سے اُس کا ہاتھ تھام کر وہ اُسے بیڈ کے قریب لایا' پھر اُس سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم نے جو جھوٹ ہم سب سے بولا تھا' تمہاری ڈائری نے اُس کا پول ہم سب پر کھول دیا ہے' جب تم یہاں سے شہر گئی تھیں تو ہم سب بہت ڈسٹرب ہو کر رہ گئے تھے۔ میرے لئے پھر سے نانا جی کو سنبھالنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اِسی لئے دادی ماں نے ذرنشاء کو یہاں بلا لیا۔ اُسی کے ہاتھ تمہاری ڈائری لگی تھی' جو اُس نے سیدھی اپنے باپ کے ہاتھ میں جا کر دے دی اور اُن کے والد نے اُسے نانا جی کے سپرد کر دیا۔ نانا جی پر جب احسان ماموں کی موت کا عقدہ کھلا تو وہ بہت روئے' نانی ماں کا حال بھی دیکھنے والا تھا' تبھی مما کو یہاں بلایا گیا۔

نانا جی نے اُن سے تمہارے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ یوں تین چار روز تک تو یہ حویلی ماتم ہی میں ڈوبی رہی۔ روز گاؤں سے کوئی نہ کوئی آ کر تمہارا پوچھتا اور ہمارے زخم پھر سے ادھڑ جاتے۔ بعد میں مما نے تمہاری وکالت کی اور سب کو تمہارے جھوٹ کی اصل وجہ بتائی تو نانا جی تمہیں گلے لگا کر رونے کو بے قرار ہو گئے۔ وہ فوری طور پر تمہیں شہر سے بلوانا چاہتے تھے' مگر اس بار میں نے ریکوسیٹ کر کے اُنہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا' جانتی ہو کیوں؟

اِس وقت اُس کے پہلو میں بیٹھا ازہان' اُس ازہان سے قطعی مختلف تھا' جس کی آنکھوں میں ہمہ ت وحشت ناچتی رہتی تھی۔ سبرینہ نے ٹکر ٹکر اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر اثبات میں سر ہلایا تھا۔ تبھی وہ

''میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا سبی' کیونکہ آج تمہارا برتھ ڈے ہے ناں' اِسی لئے......''

جگنوؤں سی روشن آنکھوں میں یہاں وہاں صرف محبت کے دیپ جل رہے تھے۔ سبرینہ کی آنکھیں سب آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''کیا......تم مجھ سے پیار کرتے ہو......؟''

''ہاں......'' ازہان کا اقرار سرگوشی سے بلند نہیں تھا۔

''تو پھر ذرنشاء اور کیفیہ کا کیا ہوگا......؟''

وہ اُلجھی تھی' جب وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیفیہ کا حقیقت میں کوئی کردار نہیں سویٹی' وہ سب میں نے صرف تمہیں تنگ کرنے کیلئے چند روز لے ہی فرضی لکھا تھا' کیونکہ میں تمہاری آنکھوں میں اپنی بے لوث محبت کی پرچھائی دیکھ چکا تھا' البتہ جہاں ک ذرنشاء کا سوال ہے تو اُس کے لئے میں نے جھوٹ نہیں لکھا' وہ مجھے پسند کرتی تھی' گاہے بگاہے میں ب بھی حویلی کا چکر لگاتا تو مجھے اپنے داؤ میں لینے کی کوشش کرتی' لیکن میں اُس کی غلط حرکتوں کی وجہ سے اُسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ ویسے بھی وہ بچپن سے تفسیر کی منگ تھی' تفسیر کو تو جانتی ہوناں تم' اِسی حویلی میں اتھا تم سے' وہ اُسے پسند کرتا ہے' مگر ذرنشاء نے میرے حصول کو ضد بنا کر' مجھ پر اپنی آبروریزی کا جھوٹا زام لگا دیا' جس کی وجہ سے نانی ماں' نانا جی اور مما نے زبردستی اُس کے آنسوؤں سے متاثر ہو کر میرا نکاح س کے ساتھ کر دیا۔ میں کسی صورت ایسا نہیں چاہتا تھا' اِسی لئے باغی ہوگیا' اِسی سانحے نے پاپا کی جان لے لی' اور یوں سب میرے اور بھی خلاف ہو گئے' اپنے آپ کو اور سب کو اذیت دینے کے لئے ہی میں رنشاء کو سر چڑھاتا رہا۔ کیونکہ اُس کی موت بھی مجھے صرف نقصان ہی دیتی' رفتہ رفتہ سب کو سچائی کا پتہ چل لیا تو میری پوزیشن کلیئر ہو گئی' مگر یہ دُکھ کانٹا بن کر چبھتا رہا کہ میرے اپنوں نے میری بات کا اعتبار کیوں نہ لیا؟ میری ماں نے اپنے خون کو اِتنا گندہ کیوں سمجھ لیا؟''

''بس یہی کسک دِن رات میرے خون کو گرمائے رکھتی تھی۔ میں نے خود اپنے آپ کو دانستہ سب ے الگ کر لیا۔ شہر چھوڑ کر' مستقل یہاں حویلی میں پڑاؤ ڈال لیا۔ سب کے سامنے ذرنشاء کو سر آنکھوں پر ھاتا' مگر پس پردہ اُسے ذہنی اور جسمانی اذیتیں دیتا' جس کی وجہ سے اُس کے عشق کا جو بھوت بھی سر سے اتر گیا اور وہ خود مجھ سے جان چھڑانے کے حیلے تلاشنے لگی۔ جب تم زندگی میں آئیں' تو میرے اندر یرے سوئے ہوئے جذبات نے سر اُبھارنا شروع کیا' تمہاری قربت' تمہارا لمس' گھنٹوں مجھے مدہوش رکھتا' تمہاری بے لوث چاہت نے ہی میرے اندر کی وحشت کو ختم کرنے میں سو فیصدی کردار ادا کیا' اور

میں نے تمام گھر والوں کے سامنے ذرنشاء سے سچ اگلوا کر بالآخر اُسے ڈائیورس دے دی' خس کم جہاں پاک' اب بولو' یہ خامیوں سے بھرا ازہان احمر' تمہیں قبول ہے......؟"

فریش حلئے کے ساتھ فریش لہجے میں کہتا وہ ذرا سا اُس کی طرف جھکا تو سبرینہ اپنی بے تاب دھڑکنوں کو سنبھالتی فوراً اُس کے قریب سے اُٹھ گئی۔ لمحے میں زندگی کا اعتماد بحال ہوا تھا۔

"جی قبول ہے' لیکن ایک شرط پر......"

"کیا......؟"

"آپ حائقہ پھوپھو اور باقی سب سے اپنی اُس بدتمیزی کی معافی مانگیں گے' جواب تک اُن سے کرتے رہے ہیں"

"اوہو...... منٹ میں ہم "آپ" بھی ہو گئے' تھینک یو' آپ کی شرط قبول ہے' اور کچھ......"

"اور کچھ نہیں......"

اُس کے قریب آنے سے پہلے ہی وہ بھاگ کر رُوم سے باہر نکل آئی۔ سامنے ہی وسیع لاؤنج میں حویلی کے تمام مکین اُس کی سالگرہ کا بڑا سا کیک ٹیبل پر سجائے' اُسے اپنی محبتوں کی چھاؤں فراہم کرنے کیلئے بے قرار کھڑے تھے۔

سبرینہ بے ساختہ بھاگ کر دادا جی اور دادی ماں سے لپٹ گئی کہ اب اِن محبتوں کی چھاؤں میں ہی اُسے اپنی باقی کی تمام زندگی ہنسی خوشی بسر کرنی تھی۔

• • •

اُتر گیا ہے نگاہوں میں اِس لئے شاید
ہر ایک بات اُسی کی مثال کرتے ہو
بہت عزیز تھا شاید وہ اِس لئے اے دوست
بچھڑنے والے کا اب تک ملال کرتے ہو

نازیہ شیرازی بیاہ کر "ہمدانی پیلس" آ گئی تھی۔ اُس کی رخصتی کے ساتھ ہی صائمہ کا نکاح کر دیا گیا تھا۔ لڑکا دیکھا بھالا تھا' پھر اکلوتا تھا' لہٰذا ایک پنتھ میں دو کاج ہو گئے تھے۔

وہ دُلہن بن کر ہمدانی پیلس میں آئی تو ننھے سلمان کی خوشی کا جیسے کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا تھا۔ نازیہ خود بھی اُسے ایک لمحے کیلئے خود سے دُور کرنا گوارہ نہیں کرتی تھی۔

سنوان اُس کی سوچ اور اُمید سے زیادہ اچھا ہمسفر ثابت ہوا تھا' مگر اس کے باوجود وہ سلمان علوی کو اپنے دِل و دماغ سے نکال نہیں پائی تھی۔

اُس نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ صرف اپنے سلمان کو ماں دینے کیلئے اُس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

گو حفیظ صاحب' عائشہ بیگم' صائمہ شیرازی اور سنوان سب اُس سے خوش تھے' مگر اُس کا دِل اُس سے روٹھ گیا تھا۔

شادی کے تیسرے روز وہ سنوان اور سلمان کے ساتھ واپس اپنے گھر لوٹ آئی تھی۔ عائشہ بیگم اُن دنوں کی خوشیوں کی دُعائیں مانگتی نہیں تھک رہی تھیں۔

حفیظ صاحب گھر پر نہیں تھے۔ صائمہ کچن میں مصروف تھی' سنوان تھوڑی دیر وہاں رُکنے کے بعد' شام میں پھر آنے کا کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

عائشہ بیگم نے بغور اُس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ نڈھال دکھائی دے رہی تھی۔ نئی نویلی دُلہنوں کے چہرے پر جو چمک ہوتی ہے' وہ چمک اُس کے چہرے سے غائب تھی۔ آنکھوں میں پلکورے لیتے عجیب سے درد نے اُنہیں بے چین کر دیا تھا۔

آتے ہی وہ اُن کی بانہوں میں سمو کر سسک اُٹھی تھی۔

"بس...... اب تو خوش ہیں ناں آپ؟ اب تو کوئی گلہ نہیں رہا ناں آپ لوگوں کو' اب تو ایک اچھی بیٹی ہونے کا فرض نبھا دیا ناں میں نے......"

عائشہ بیگم کو اُس کے الفاظ سے شدید تکلیف پہنچی تھی۔ تبھی اُنہوں نے اپنائیت سے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھا تو وہ مزید سسک اُٹھی۔

"میں بہت بکھر گئی ہوں امی! اپنے عہد کے ساتھ ساتھ خود بھی ٹوٹ گئی ہوں' مان لیا ہے میں نے کہ وہ زندہ نہیں ہے' اب نہیں رہوں گی میں خوابوں کی دُنیا میں' اُسے یاد بھی نہیں کروں گی اب' کبھی نہیں کروں گی۔"

کوئی اِس لمحے اُس کے درد کا اندازہ کرتا تو یہ جان لیتا کہ وہ کس قدر تکلیف کے عالم میں تھی۔

صائمہ شیرازی اُس کے درد کی گہرائی کو خوب سمجھ سکتی تھی' مگر وہ بھی خاموش تھی۔ عین اِسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی اور نازیہ شیرازی کا دِل جیسے دھڑکنے سے ہی عاری ہو گیا۔

پورے سات سال جس دستک کو سننے کے لئے اُس کی سماعتیں بے قرار رہی تھیں' آج جب اُس نے محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ تو دروازے پر اُسے وہ مانوس دستک سنائی دی تھی۔

ایک لمحے کیلئے اُسے یہ اپنا الوژن لگا تھا' مگر دستک دوبارہ ہوئی تھی۔

تب اُس نے تڑپ کر زخمی نگاہوں سے صائمہ شیرازی کی طرف دیکھا' تو وہ خود ساکت سے انداز میں اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دروازے پر دستک پھر ہوئی تھی' اور اِس بار صائمہ شیرازی بمشکل خود کو گھسیٹ کر دروازے تک لے آئی تھی۔

نازیہ شیرازی کے سینے میں اِس لمحے اُس کا دِل اِتنی شدت سے دھڑک رہا تھا گویا پسلیاں توڑ کر

ابھی باہر آجائے گا ہاتھ پاؤں یکلخت ٹھنڈے ہوئے تھے۔

صائمہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا تو پورے سات سال کے بعد سلمان علوی کو اپنی نگاہوں کے سامنے ہشاش بشاش کھڑے پایا۔تب مارے تحیر کے اُس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

''سلمان بھائی......آپ......؟''

''جی جناب' حیران رہ گئیں ناں مجھے دیکھ کر' دیکھ لو میں ہمیشہ یونہی سرپرائز دیا کرتا ہوں......''

وہی سات سال پہلے والا اُس کا انداز' لگتا ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ اُن لوگوں سے دُور کہیں گیا تھا۔

صائمہ شیرازی میں اِس لمحے خود کو حرکت دینے کی سکت بھی نہیں رہی تھی' جبکہ نازیہ شیرازی کو لگ رہا تھا جیسے ابھی اُس کا دِل دھڑکنے سے انکاری ہو جائے گا۔

جانے کیسے اُس لمحے وہ خود کو سنبھال کر دروازے تک لائی تھی۔

سلمان علوی اُسے اِتنے سالوں کے بعد اپنے سامنے دیکھ کر مچل اُٹھا تھا۔

''نازی......''

دِل تڑپ کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی در آئی تھی۔خود نازیہ شیرازی کا دِل اِس لمحے درد سے پھٹنے کو تیار ہو گیا تھا۔آنکھوں سے آنسو بہے تو پھر ہزاروں کوشش کے باوجود نہ رُک سکے۔

لبوں سے سسکی نکلی تھی' مگر اِس لمحے اُسے خود اپنے آپ کو زندہ درگور کرنا تھا' سو دِل میں اُٹھتے طوفان اور نا آسودہ تمناؤں کو کچلتے ہوئے سنگدلی سے بولی۔

''کون نازی......اور آپ ہیں کون میری بہن سے یوں بے تکلفی سے بات کرنے والے......؟''

اُس کے الفاظ نے سلمان علوی کو شاکڈ کیا تھا۔

ستاروں سے چمکتی نگاہوں میں تحیر لئے وہ دُکھ سے اُسے دیکھ رہا تھا' جو بجی سنوری آج بھی اُتنی ہی دِل کش دیکھائی دے رہی تھی جتنا کہ سات سال پہلے وہ اُسے چھوڑ کر گیا تھا۔

''نازی......مم......میں سلمان......''

جانے کیسے وہ اپنے ہونٹوں کو جنبش دے سکا تھا۔اِتنے سالوں کے بعد اُسے اپنے سامنے پا کر وہ اِس طرح کا بی ہیویر اپنائے گی اُس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔تبھی اُس نے دروازے کی چوکھٹ کو تھامتے ہوئے تڑپ کر اُس کی طرف دیکھا تھا' جس کی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں ایک عجیب سا آلاؤ دمک رہا تھا۔

''کون سلمان' نہیں جانتے ہم کسی سلمان کو' پچھلے سات سالوں سے کسی سلمان کا ذکر نہیں سنا ہم نے' پلیز چلے جاؤ' خدا کا واسطہ ہے' اب کبھی دوبارہ یہاں مت آنا' اب یہاں کچھ بھی تمہارا نہیں رہا ہے۔''

اُس کا لہجہ زخمی ہو رہا تھا۔عین اِسی لمحے ننھے سلمان نے اُس کا آنچل تھاما تھا۔

''مماجی......پاپا کا فون ہے' نانو آپ کو بُلا رہی ہیں......''

سلمان علوی کیلئے یہ ایک اور بہت بڑا شاک تھا۔اُسے نہ اپنی سماعتوں پر یقین آ رہا تھا نہ بصارتوں پر۔

وہ خود کو ہزار الزام دے سکتا تھا' مگر نازیہ شیرازی ایسا کوئی قدم حقیقتاً اُٹھا سکتی ہے' یہ سوچنا بھی اُس کے لئے محال تھا۔

اُس کے ساتھ لگ کر کھڑا وہ ننھا بچہ' سلمان علوی پر اُس کی بے وفائی کا ثبوت بن کر عیاں ہوا تھا۔

صرف ایک لمحہ لگا تھا اُسے زمین بوس ہونے میں اور اُس کی خوش فہم اُمیدیں پھر سے بکھرتی چلی گئی تھیں۔

''سنا آپ نے یہ بچہ مجھے اپنی ماں کہہ رہا ہے' مما ہوں میں اِس کی' اور کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے میرا' مذاق سمجھتے ہیں آپ محبت کو' جب جی چاہا دِل لگا لیا' اور جب چاہا چھوڑ کر چلے گئے' کسی کے دِل' کسی کے احساسات کی پرواہ ہی نہیں' دِل بازار میں بِکتے ہیں کیا' جاؤ پلٹ جاؤ سلمان علوی' اب یہاں کچھ بھی تمہارا نہیں رہا' سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا ہے' سب کچھ......وہ سارے خواب اور پیمان بھی' جو میں نے کبھی تُم سے وابستہ کئے تھے۔مر گئی تمہاری وہ محبت' جو کبھی طاقتور تھی' ہر آزمائش پر پورا اُترنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔اب جو لڑکی تمہارے سامنے کھڑی ہے وہ بہت کمزور ہے' یہ تمہاری منزل نہیں' کسی کی ماں ہے' سلمان کی ماں' مجھے اپنی مجبوریوں کی کوئی داستان مت سنانا' کیونکہ میں تمہارے تصور کو بھی دِل سے نکال کر پھینک چکی ہوں۔''

ضبط کے تمام بند بلا آخر ٹوٹ گئے تھے۔اور وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور سلمان دروازے کی چوکھٹ پکڑے کھڑا' دُھول ہوتی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔اُس کے ہاتھ سے تحائف والا بیگ چھوٹ کر زمین پر گر پڑا تھا۔برابر میں کھڑا اجبار جعفری اگر بروقت اُسے تھام نہ لیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑتا۔

اُداسیوں کا سبب جو لکھنا
تو یہ بھی لکھنا
کہ چاند چہرے' شہاب آنکھیں بدل گئے ہیں
وہ لمحے جو تیری راہوں میں' تیرے آنے کے منتظر تھے
وہ تھک کے سایوں میں ڈھل گئے ہیں
وہ تیری یادیں خیال تیرے' وہ تیری باتیں سوال تیرے
وہ تجھ سے میرے تمام رشتے' اُجڑ گئے ہیں' بکھر گئے ہیں
اُداسیوں کا سبب جو لکھنا
کپکپاتے سے ہونٹوں پر لڑکھڑاتے دُعا کے سورج

پگھل گئے ہیں

تمام سپنے جل گئے ہیں

بڑھ کر دروازہ سلمان علوی پر بند کرتے ہوئے وہ پھر دروازے کے اُس پار نیچے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ وہ باب جو اُس کی زندگی میں حالات کی گرد کی نذر ہو گیا تھا' اُس باب کو پھر سے کھولنے کا اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔

وہ اچھی محبوبہ تو ثابت نہ ہو سکی تھی' تاہم اُسے ضرور ایک اچھی بیٹی' ایک اچھی بیوی اور ایک اچھی ماں ثابت ہونا تھا۔

کہتے ہیں کہ محبت کا بھی ایک موسم ہوتا ہے جو آ کر گزر جائے تو دِل ویران رہ جاتے ہیں۔ سلمان علوی کی زندگی میں بھی وہ موسم آ کر گزر گیا تھا۔ اور اب جو ویرانی اُس کے دِل میں آ ٹھہری تھی' اُس ویرانی کے حصار میں بنا کسی درد' کسی تکلیف کا اظہار کیے' شاید اُسے تاعمر مقید رہنا تھا۔

▲ ▲ ▲